بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فصل الخطاب

## بین الخطاء والصواب

تصنیف فارسی

زبدۃ العارفین، عمدہ اکاملین، قدوۃ السالکین حضرت العلام

**سید شاہ عبد اللطیف قادری** نقوی علیہ الرحمہ

المعروف بہ حضرت قطب ویلور قدس سرہ

اردو ترجمہ

مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی لطیفی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔

استاذ تفسیر، دار العلوم لطیفیہ ویلور

# فصل الخطاب

## بین الخطاء والصواب

تصنیف فارسی

زبدة العارفین، عمدہ الکاملین، قدوة السالکین حضرت العلام

**سید شاہ عبد اللطیف قادری** نقوی علیہ الرحمہ

المعروف بہ حضرت قطب ویلور قدس سرہ

**اردو ترجمہ**

مولانا مولوی **حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی** لطیفی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی،

استاذ تفسیر، دار العلوم لطیفیہ ویلور

**شائع کردہ**

دار التصنیف والاشاعت حضرت مکان

ویلور، جنوبی ہند

زیر ظل حمایت

حضرت مولانا **ڈاکٹر سید عثمان قادری** دامت برکاتھم

ناظم دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور، ویلور

تاریخ اجراء، برموقعہ سالانہ جلسہ تقسیم اسناد، دار العلوم لطیفیہ ویلور
روز چہارشنبہ 13 جولائی 2011 مطابق ۱۱ شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## فہرست مضامین

۱۲) مقدمہ صوفیہ کے اقوال شریعت کے خلاف ہوں تو ان کے لئے تاویلات اور احتمالات ہیں۔

۱۳) مقدمہ صوفیہ کے علوم و معارف کا انکار کرنے والا اور اولیاء پر لعن طعن کرنے والا، اپنے آخری وقت میں سوء خاتمہ کے سوا دوسری چیز نہیں رکھتا۔

۱۴) مقدمہ اہل قبلہ کو کافر کہنے سے اجتناب کیا جائے۔

۱۵) مقدمہ بزرگوں کے عیوب کی تلاش، ان پر طعن، مسلمانوں میں تفرقہ اور فتنہ، نہایت مذموم خصلت ہے۔

۱۶) مقدمہ ایک عامی شخص کو مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کا اختیار کرنا لازم ہے ورنہ وہ بھٹک جائے گا۔

۱۷) مقدمہ کتاب ہذا میں بعض ضعیف اقوال اور مرجوح روایات کو نقل کرنے کا مقصد صرف غالی اشخاص کی زبان بند کرنا ہے۔

۱۸) مقدمہ یہ کتاب اس شخص کے لئے مفید ہوگی جو غالی افراد کے غلو، اور اہل سنت کے مذہب سے واقفیت رکھتا ہو۔

۱۹) مقدمہ یہ کتاب اہل سنت و جماعت کی مستند کتابوں کی اسانید سے مرتب ہے۔

۲۰) مقدمہ تطبیق کے وقت یہ نہ کہا جائے کہ یہ تمام دلائل مستند کتابوں میں تو موجود ہیں لیکن ان کی کوئی تاویل ہوگی۔

.................................

## فائدہ ۱

(۱) شرعی دلائل چار ہیں (۲) تشہد میں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے سے متعلق احادیث اور ائمہ اربعہ کا موقف و مسلک (۳) خطبہ میں خلفائے راشدین کا ذکر کرنا،

اہل سنت و جماعت کا شعار ہے۔(۴) شریعت میں تسبیح کا استعمال (۵) خطبہ میں عصا کا سہارا لینا۔(۶) تثویب یعنی نماز کے لئے اذان کے بعد پھر دوسری مرتبہ بلانا۔

..............................

فائدہ ۲

مکلّف کا فعل

..............................

فائدہ ۳

تکالیف شرعیہ

..............................

فائدہ ۴

احکام حج

..............................

فائدہ ۵

طواف غیر کعبہ کا حکم

..............................

فائدہ ۶

ضیافت کی اقسام اور دعوت قبول کرنے کے احکام

..............................

فائدہ ۷

مردوں کے لئے زندوں کی جانب سے صدقات وخیرات اور دعا کرنے کا حکم۔

..............................

فائدہ ۸

تعین صدقات کا حکم

..............................

فائدہ ۹

نذر و نیاز کا حکم

..............................

فائدہ ۱۰

آدمی کے جھوٹے کا حکم اور مشرک اور کتابی کے ذبیحہ کا حکم اور ان دونوں کا ذبیحہ کھانے کا حکم

..............................

فائدہ ۱۱

تمباکو استعمال کرنے کا حکم

..............................

فائدہ ۱۲

میلاد النبی ﷺ پر اظہار مسرت کا حکم

..............................

فائدہ ۱۳

زیارت موئے نبوی ﷺ

..............................

فائدہ ۱۴

تذکرہ مناقب و فضائل صلحاء

..............................

فائدہ ۱۵

عورتوں کے حسن و جمال اور ان کے خد و خال کا تذکرہ

..............................

فائدہ ۱۶

داعیان حق اور دعوت الی اللہ کے مراتب

..............................

فائدہ ۱۷

قبر پر عمارت اور گنبد کی تعمیر کے احکام

..............................

فائدہ ۱۸

اہل قبلہ کی تکفیر کے احکام

(۱) اہل سنت و جماعت کو بدعتی کہنے کی ممانعت

(۲) مذاہب اربعہ میں جدال اور بات چیت میں مخالفت کے احکام

..............................

فائدہ ۱۹

سجدہ تحیت کا حکم

..............................

فائدہ ۲۰

(۱) حکم قیام (۲) سلام، مصافحہ، معانقہ کا حکم (۳) قدم بوسی کا حکم (۴) زمین بوسی اور سجدہ کا حکم (۵) خالق کے ساتھ صحبت کا حکم (۶) سید الانبیاءؐ کے خصائص اور آداب (۷) اہل بیت کے حقوق و آداب (۸) مرشد کامل کے حقوق و آداب (۹) آداب عالم

(۱۰) آداب متعلم (۱۱) والدین کے ساتھ فرزند کے آداب (۱۲) بھائیوں اور دوستوں کے آداب (۱۳) مجہول اشخاص کی صحبت کے آداب (۱۴) لوگوں کے ساتھ صحبت کے آداب

.................................

فائدہ ۲۱

سلام کے بیان میں جو سنت رسول اکرم ﷺ ہے۔

.................................

فائدہ ۲۲

تصوف اور صوفی اور ان دونوں کے متعلقات

.................................

فائدہ ۲۳

صوفیائے کرام کے ساتھ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اختلافات

.................................

فائدہ ۲۴

نبوت اور ولایت کی نوعیت کے خواص اور احکام، ادعیہ، اوراد، اذکار اور اعداد کی تعئین کا حکم

.................................

فائدہ ۲۵

منتر وفسوں اور اوراد نا معلوم معنی کا حکم

.................................

فائدہ ۲۶

عاجزی وانکساری کی خوبی، نفس کی تصغیر اور تکبر کی برائی

.................................

فائدہ ۲۷

دربابِ عشق

.................................

فائدہ ۲۸

مرشد کے ساتھ قلبی ارتباط کا مراقبہ، یا تصورِ شیخ

.................................

فائدہ ۲۹

علم غیب

.................................

فائدہ ۳۰

علامات انبیاء اور اولیاء

نبی کی حقیقت، انبیائے کرام کی حقیقت، صدیق کا معنی، شہید کا معنی، صالح کا معنی

.................................

فائدہ ۳۱

زیارت قبور اور زیارت کے لئے سفر اور ان دونوں کے متعلقات

.................................

فائدہ ۳۲

در تبرک

.................................

فائدہ ۳۳

اقسام ندا

..............................

فائدہ ۳۴

توسل واستمداد

..............................

فائدہ ۳۵

زندہ اور وفات یافتہ بزرگوں سے ارباب حاجات کی نداء توسل

..............................

فائدہ ۳۶

دوگانہ قادریہ

..............................

فائدہ ۳۷

نداء اور دعا کے درمیان فرق

..............................

فائدہ ۳۸

وحدت الوجود

..............................

فائدہ ۳۹

وجود اور شہود کے معانی میں اختلاف کا بیان

..............................

فائدہ ۴۰

تیرہویں صدی ہجری کے اہل علم میں سے چند علماء جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔

..............................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پیش تحریر

حضرت قطب ویلور کی یہ مایہ ناز علمی وفقہی فارسی تصنیف فلس کیپ کے دیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر صفحہ میں ۲۲ سطور ہیں اور حضرت مصنف کی زندگی میں حاجی سید عبدالقادر قادری کے مطبع قادری ویلور سے ۱۸۸۲ء کو زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب بیس مقدمات اور چالیس فوائد (ابواب) پر مشتمل ہے۔ یہ بیس مقدمات دراصل ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کتاب کو سمجھنے میں مدو معاون ہیں، قارئین کتاب کے لئے ضروری ہے کہ ان مقدمات کوملحوظ ذہن رکھیں اور اس کتاب کو کما حقہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ کتاب پڑھنے والا شخص دین میں لوگوں کے غلو سے پوری طرح واقف ہو، اور اہل سنت و جماعت کے چار مکاتب فکر (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) کا مطالعہ کیا ہو۔ کیونکہ یہ کتاب ناقص افراد کے افراط وانتہا پسندی اور غلو سے متعلق تصنیف کی گئی ہے، اور اس کتاب میں بعض مقامات پر ضعیف اقوال اور مرجوح روایات کو نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ مصنف علیہ الرحمہ قول ضعیف پر عمل کی ترغیب دے رہے ہیں اور ان کے مسلک اور موقف کی بنیاد ضعیف اقوال اور مرجوح روایات پر ہے، ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے بلکہ ان اقوال اور روایات کو نقل کرنے کا منشا اور مقصد غالی اور انتہا پسند حضرات کی زبان بندی ہے اور یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور اختلافی امور و مسائل اور احکام میں ایک ہی پہلو کو حق وصواب قرار دینا اور دوسرے پہلو کو باطل و خطا قرار دینا، صحیح نہیں ہے۔ اور اہل سنت و جماعت کے اختلافی مسائل اس نوع کے نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کو کافر اور بدعتی قرار دیں بلکہ حق ہر دو پہلو میں دائر ہے ایک پہلو قوی اور راجح ہے تو

ایک پہلو ضعیف اور مرجوح ہے۔لہٰذا اختلافی مسائل میں ایک دوسرے پر نکتہ چینی، لعن وطعن صحیح نہیں ہے۔توسط وتوقف اوراعتدال ایک مفید راہ عمل ہے۔فربکم اعلم بمن هوی اهدی سبیلا ، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت کی راہ پر چل رہا ہے۔

حضرت قطب ویلور کا مذکورہ موقف اس کتاب کے ہر فائدہ میں آپ کو نظر آئے گا، انہوں نے اسی فکر وعمل کی ترغیب وتحریص میں اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔

آج سے دیڑھ سو سال پہلے اہل علم اور عوام کے درمیان جو مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جن کے ذریعہ ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق، لعن وطعن، تنقیص وتحقیر کا بازار گرم تھا اور جن مسائل کی بنیاد پر اختلاف وتفریق قائم تھی۔آج پھر وہی ماحول پیدا ہوگیا ہے، تاریخ خود کو دہرا گئی، ان حالات میں ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قطب ویلور کی تحریروں کو عام کیا جائے تاکہ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں اعتدال کی راہ ہموار ہوسکے۔

اس کتاب کے ترجمہ کا آغاز ۱۴۰۲ھ میں ہوا اور اسکا اختتام ۱۴۱۴ھ میں ہوا، بارہ سال کی مدت میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ ترجمہ ۱۴۰۲ھ سے لے ۱۴۱۴ھ تک سال نامہ اللطیف ویلور میں قسط وار شائع ہوا اور وہ اللطیف کی فائلوں میں محفوظ ہوگیا، اب وہ مستقل کتاب کا روپ لئے ہوئے منصۂ شہود پر جلوہ نما ہے الحمدللہ علی ذلک۔

درس وتدریس کی ذمہ داری اور امامت وخطابت کے فرائض کی انجام دہی اور خانگی ونجی امور ومعاملات کی گرہ کشائی کے ساتھ ساتھ ذہن کی یک سوئی اور یک رخی سے ترجمہ کا دقیق کام سرانجام پانا یقیناً فضل الٰہی اور تصرف قطب ویلوری ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف اور مترجم کی مساعی جملہ کو شرف قبولیت بخشے اور زاد آخرت بنادے۔ واخر دعونا ان الحمدللہ رب العالمین۔

حافظ بشیر الحق قریشی غفر له ولوالدیه الکریمین ۱۳رجب ۱۴۳۲ھ

# انتساب

حضرت مولانا

## ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری

علیہ الرحمہ

سابق ناظم دار العلوم لطیفیہ ویلور

کے

نام

جن کی علمی ترغیب اور قلمی تشویق اور حوصلہ افزائی وقدردانی کے باعث
تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم بڑھانے کا حوصلہ ملا

حافظ بشیر الحق قریشی

**غفر له ولوالديه الكريمين**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فصل الخطاب بین الخطاءِ والصّواب

الحمد للّٰہ العلی الاعظم والصّلوٰۃ والسّلام علی المظھر الاتم قائد الخلق الی الطریق الاقوم وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وورثائہ الافخم۔ حمد وصلوٰۃ کے بعدار بابِ بصائر کے دلوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ غربتِ اسلام کے ان دنوں میں بعض برادران دین اور مسلم عوام نے باوجود قلت علم کے علماء کے علم میں دخل اندازی کی اور فقہاء کے اجتہاد پر طعنہ زنی شروع کی اور بہتر ۷۲ بدعتی فرقوں کے مانند بزرگانِ عالی مقام کی تضلیل وتکفیر اور مجتہدانِ ذی شان کے خلاف لب کشائی کی اور انتہائی تعصب سے فساد اور عناد کا حق ادا کیے ہیں۔ان کی یہ مخالفت اور بزرگوں کی یہ تضلیل وتکفیر مسلمانوں کے درمیان اختلاف وتفرقہ اور اس دین متین کے اندر جدال اور نزاع کا باعث بنی۔امام حجۃ الاسلام محمد غزالیؒ ''احیاء'' ابوابِ مداخل شیطان میں فرماتے ہیں۔

عوام کا حق صرف یہ ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں اور اپنی عبادت میں اور اپنی معاش وروزگار میں مشغول رہیں اور علم کو علماء کے لئے چھوڑ دیں۔پس ایک عامی زنا یا چوری کرے تو اس کے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ علم میں گفتگو کرے۔پس بے شک جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے بارے میں اتقانِ علم کے بغیر گفتگو کرے تو وہ انجانے طور پر کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور سمندر کی موج پر سوار ہو اور عقائد ومذاہب کے باب میں شیطانی مکائد کی کوئی حد نہیں۔

اس مقدمہ کی تفصیل تیسرے مقدمے میں دیکھی جائے اور سنّیت کے دعوے کے باوجود معتزلہ،شیعہ اور دیگر بدعتی فرقوں کے مانند اہل سنت وجماعت کے اختلافی مسائل میں

ایک دوسرے کی تضلیل وتکفیر کا فیصلہ کرتے ہیں حالاں کہ ان اختلافات میں ہر ایک کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ زیادہ ہدایت کی راہ پر کون ہے اور ایک دوسرے پر عیب لگانا نہیں چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' علماء کا اختلاف رحمت ہے۔ان اختلافات کے اندر کسی مجتہد کو کوئی ایک بات کا یقین میّسر نہیں ہے تو پھر مقلد کو کیسے ہوسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مجتہدین میں سے کوئی شخص بھی دوسرے مجتہد کو گمراہ نہیں قرار دیتا۔

شیخ جلال الدین سیوطی ''جزیل المواہب'' میں لکھتے ہیں : یہ جاننا چاہئے کہ اس ملت میں مذاہب کا اختلاف بڑی نعمت اور عظیم فضیلت ہے اور اس کا ایک لطیف راز ہے۔ جس کا علماء نے ادراک کیا اور اس سے جاہل ناواقف ہے، حتیٰ کہ بعض جاہلوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک ہی شریعت لائے پھر یہ مذاہب اربع کہاں سے نکل آئے۔اس مقدمہ کے تفصیل پانچویں مقدمہ میں تلاش کی جائے اور دعوی حنفیت کے باوجود بلاوجہ اہل سنت وجماعت کے دوسرے ائمہ کرام کے مذہب پر عمل کررہے ہیں۔ حالاں کہ کوئی حنفی شخص اپنے امام کے اجتہاد کے خلاف اگر بے وجہ عمل کرے تو گناہگار ہوگا۔اس مقدمہ کی تفصیل ساتویں مقدمہ میں آئے گی۔

امام ربانی مکتوبات جلد اول کے ۲۸۶ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں۔ مقلد کو یہ حق نہیں کہ مجتہد کی رائے کے خلاف قرآن وحدیث سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل کرے۔

اس مقدمہ کی تفصیل تیسرے مقدمہ میں آئے گی۔

غرض عوام کی یہ افراط وتفریط اور نفس بدانجام کا تعصب مسلمانوں میں اختلاف و تفریق کا باعث ہوا اور اسی چیز نے ہر ہر گروہ کو دوسرے گروہ کی ایذارسانی اور دشمنی پر آمدہ کردیا۔ اگر ذرا غور وفکر کیا جائے تو یہ بات روشن ہوجائے گی کہ اس تمام بے سروپا اور بے

بنیاد غلو و مبالغہ اور فساد بے جا کا سبب صرف اور صرف طلب و جاہت ہے اور سوء ادب، وبددیانتی ہے اور ائمہ متبوعین کی ترکِ تقلید اور اپنی اپنی بے اصل رائے کی اشاعت ہے۔ زہی تصّور باطل زہی خیال محال۔ کیا ہی باطل تصور ہے اور کیا ہی خیال محال ہے۔

یہ رسالہ ''فصل الخطاب بین الخطاء والصواب'' خطا کاروں کی افراط وتفریط اور اہل سنّت و جماعت کے طریق اعتدال کے بیان میں تالیف ہوا اور معرض وجود میں آیا تا کہ لوگ حق کی پیروی کریں اور سادہ لوح افراد، ان خطا کاروں کی ہمنوائی اور ان کی پشت پناہی نہ کریں۔

نیز اس کتاب سے نکتہ چینی بھائیوں کی زبان بندی اور خطا کاروں کی اصلاح ہے۔ عیب داروں کی عیب چینی اور ان کے نام کا اظہار مقصود نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب** باہم ایک دوسرے کا عیب بیان نہ کرو، تحقیر آمیز القاب سے یاد نہ کرو۔

اور یہ گفت وشنید اور مناظرہ کی ہار جیت کوئی عیب نہیں ہے۔ اس افراط کی اصلاح میں اگر چہ کہ بہت سی کتابیں (جیسے مولوی کرامت علی جونپوری کی ''قوت الایمان'' اور مولوی وجیہہ مدرس اول مدرسہ عالیہ کلکتہ کی ''نظام الاسلام ودفع الشرور'' اور مولوی لطف الحق ہندوستانی کی ''سلاح المومنین'' وغیرہ) لکھی گئیں جن میں خطا کاروں کے اعتراضات کا جواب اور قاصروں کے شبہات کا حل آفتاب نصف النہار کی طرح موجود ہے لیکن اس رسالہ یعنی ''فصل الخطاب بین الخطاء والصواب'' میں ان شبہات کا حل ہے جن میں سے اکثر کا حل دوسری کتابوں میں نہیں پایا جاتا ہے اور ان میں سے بعض کا تعلق علم باطن سے ہے۔ یہ رسالہ اسناد معتبرہ سے اور خاص طور پر دونوں فریقوں کے مقتداؤں کے اسناد سے مرتب و مزیّن ہے تا کہ دونوں جماعتوں میں لعن وطعن کرنے والوں کے دلوں پر اثر ہو۔

شیخ الہند سے شیخ عبدالحق دہلوی اور امام ربانی سے شیخ احمد سرہندی اور بحرالعلوم سے ملک العلماء مولانا عبدالعلی انصاری لکھنوی اور مولانا دہلوی سے شاہ ولی اللہ دہلوی اور سند العلماء سے مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولوی مدراسی سے مولوی محمد باقر آگاہ مدراسی اور سید ماجد سے مولوی اسحٰق دہلوی ۔ اور سید واعظ سے مولوی سید محمد علی مصطفیٰ آبادی (رامپوری) اور مولوی صفوی سے مولوی ارتضا علی خاں صفوی رحمۃ اللہ علیہم مراد ہیں۔

جو کوئی بھی کتاب کا حوالہ دے اور سند پیش کرے تو وہ امانت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے۔ لیکن اسکے باوجود پھر بھی اس میں چوں چرا اور کلام کرنا، قواعد علم مناظرہ اور طریقۂ علماء سے خارج ہے بلکہ ابجد خوانوں اور مبتدیوں کی ہنسی کا باعث ہے۔

اس رسالہ کے قارئین اور اس مقالہ کے سامعین کو چاہئے کہ مطالعہ کے وقت ان بیس مقدمات کو ذہن میں ملحوظ رکھیں جو ذیل میں آرہے ہیں۔ کیونکہ یہ مقدمات، اوہام کی آلودگیوں کو دور کرنے اور خیالاتِ خام کے دفع کرنے میں کبریتِ احمر کی طرح مفید ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **ولو كان من عند غير الله لو جدوا فيه اختلافا كثيرا** اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت اختلاف پاتے۔ عقائد میں ہے کہ مجتہد مخطی بھی ہے اور مصیب بھی ہے تو مجھ جیسے مقلد سے خطا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ موفق حقیقی اللہ تعالیٰ لوگوں کو توفیق دے کہ سنت و جماعت کے صراط مستقیم پر وہ چلیں اور بے ہودہ فضولیات سے محفوظ رہیں جو ابدی آخرت میں مفید نہیں ہیں اور آخر کار فنا ہو جاتے ہیں اور قلم کی بے راہ روی اور قدم کی لغزش کی اصلاح سے ثواب کمائیں **ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم** ۔

# پہلا مقدمہ

دلائل شرعیہ چار ہیں۔قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس مجتہد۔ مذکورہ چار دلائل کے بعد کوئی دلیل بھی احکام شرعیہ کو ثابت کرنے والی نہیں۔

بحر العلوم مولانا عبد العلی انصاری لکھنوی شرح مسلم الثبوت میں فرماتے ہیں، اصول تو چار ہیں کتاب وسنت، اجماع اور قیاس۔اس لئے کہ دلیل شرعی یا تو وحی ہے یا وحی نہیں، اور وحی پہلے سے دو اصولوں یعنی کتاب وسنت میں منحصر ہے۔اس لئے کہ وحی یا تو متلو ہے (یعنی جسکی عبارتوں کی رعایت واجب ہے۔، وہ قرآن ہے) یا تو غیر متلو ہے اور وہ حدیث ہے۔اور غیر وحی یا تو وہ تمام امت کاملہ کا قول ہے جو اہل اجتہاد سے ہیں اور یہی اجماع ہے اور یا تو علت میں مشارکت کی وجہ سے، دوسرے حکم پر اعتبار اور یہی قیاس ہے لیکن ہم سے پہلے کی شریعتیں اور استحسان اور استصحاب یہ سب اسی میں داخل ہیں۔

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مکتوبات جلد دوم کے ۵۵ ویں مکتوب میں رقمطراز ہیں ۔احکام شرعیہ کے اثبات میں کتاب وسنت معتبر ہیں، مجتہدوں کا قیاس اور امت کا اجماع بھی مثبت احکام ہیں۔ان چار ادلۂ شرعیہ کے علاوہ کوئی دلیل احکامِ شرعیہ کی مثبت نہیں ہے۔

مولوی شاہ محمد اسحٰق مہاجر ''مائۃ المسائل'' کے چوتھے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔اصول فقہ میں جو ادلۂ شرعیہ بیان کئے جاتے ہیں۔وہ چار ہیں، کتاب وسنت، اجماع اور قیاس کذافی التوضیح والمنار والحسامی والشاشی والمسلّم والبزدوی وغیرھا من الکتب الاصول لیکن وہی قیاس حجت ہے جس میں وہ شرطیں پائی جاتی ہوں جو اصولِ فقہ میں مذکور ہیں اور استحسان واستصحاب وغیرہ قیاس میں داخل ہیں۔ پس اس سے معلوم ہونا چاہئے کہ مجتہد کو فقیہہ کہتے ہیں۔

بحر العلوم عبد العلی انصاری لکھنوی شرح مسلم میں فرماتے ہیں الفقہ حکمۃ فرعیۃ شرعیۃ یعنی فقہ وہ علم واقعی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، نبوت اور آخرت پر ایمان سے متفرع ہے اور اولۂ شرعیہ سے ثابت ہے اور مقلد کی فقہ کو فقہ نہیں کہا جاتا کیونکہ اس میں اجتہاد کی طاقت نہیں اور وہ اپنی تقلید میں مدح کا مستحق نہیں۔ فقہ کی مدح تو کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کی گئی ہے۔ پس تقلید کی راہ سے جو چیز حاصل کیا ہے اسکو فقہ نہیں کہا جاتا۔ لیکن عرف میں اس مقلد کو بھی جس نے فقہ کے اندر مہارت حاصل کی اور کسی امام کے مذہب کے اقوال کو حفظ کیا تو اس کو بھی فقیہہ کہتے ہیں۔ جمہور علماء نے لوگوں کی فہمائش کے لئے فقہا کے سات طبقات بیان کئے ہیں جیسا کہ طحطاوی میں ہے۔

پہلا طبقہ مجتہدین فی الشرع جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے امثال جنہوں نے قواعد کی بنیاد رکھی اور اولۂ اربعہ سے احکام فروع استنباط کیا، یہ مقلد نہیں ہیں۔

دوسرا طبقہ مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابو یوسف اور امام محمد جنہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ کے مقررہ اصول کی بنیاد پر دلائل سے احکام کا استخراج کیا، اگر چہ کہ بعض احکام میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی۔ اور (یہ لوگ امام کے اصول کی مطابقت کی بناء پر) دوسرے مخالفوں جیسے امام شافعی امام مالک اور امام احمد بن حنبل سے ممتاز ہیں۔

تیسرا طبقہ مجتہدین فی المسائل، یہ وہ لوگ ہیں جو ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں، جن میں صاحب مذہب کا کوئی قول نہیں جیسے طحطاوی، خصاف، کرخی، حلوانی، سرخسی، بزدوی، قاضی خان اور ان کے امثال، اور یہ لوگ اپنے امام کی نہ اصول میں مخالفت کرتے ہیں نہ فروغ میں، لیکن ان مسائل میں احکام کا استنباط کرتے ہیں جن میں حسب قواعد کوئی نص وارد نہیں۔

چوتھا طبقہ اصحاب التخریج، یہ مقلدین ہیں جیسے رازی اور ان کے مانند کیونکہ ان

کے اندر اجتہاد کی کوئی قدرت نہیں لیکن تمام اصول کے احاطہ اور تمام ماخذوں کے حفظ وضبط کی وجہ سے ان میں یہ قدرت وصلاحیت ہوتی ہے کہ اپنے امام اور امام کے اصحاب سے منقول ہونے والے دورخی اور ذی وجہین قولِ مجمل اور محتمل الامرین حکم مبہم کی تفصیل و وضاحت کریں۔

پانچواں طبقہ اصحاب ترجیح۔ یہ بھی مقلدین ہیں جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ علامہ علی ابوالحسن برہان الدین اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اس قول (ھذا اصح دراية اواولى یہ درایت کے پہلو سے صحیح ترین اور اولیٰ ہے) سے بعض روایات کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔

چھٹا طبقہ۔ مقلدین کی وہ جماعت ہے جو قوی، اقوی، ضعیف، ظاہر الروایۃ اور ظاہر المذہب کے درمیان امتیاز کرنے پر قدرت رکھتی ہے جیسے اصحاب متون متاخرہ ۔ مثلاً صاحب الکنز الدقائق علامہ عبداللہ ابوالبرکات حافظ الدین صاحب مختار۔ علامہ ابن عابدین شامی صاحب وقایہ۔ علامہ عبداللہ صدرالشریعہ صاحب المجمع اور ان کی خصوصیات یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں کوئی قولِ مردود نقل نہیں کرتے۔

ساتواں مقلدین کا وہ طبقہ جو، ان مذکورہ امور میں سے کسی پر قدرت نہیں رکھتا اور کھرے کھوٹے میں فرق نہیں کرسکتا۔ نیز طحطاوی میں یہ بھی ہے کہ ساتواں طبقہ ان مقلدین کا ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے اور چھٹواں بھی اسی طرح کے مقلدین کا ایک طبقہ ہے، اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ مجتہد دو قسم کے ہیں۔ مجتہد مطلق وہ جو ہر قسم کے حادثہ میں (جو پیش آئے) اجتہاد کی قدرت رکھتا ہے اور مجتہد فی البعض۔ تجزی اجتہاد کے باب میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ جائز ہے۔

بحر العلوم، شرح مسلم میں لکھتے ہیں، تجزی اجتہاد اس طرح کہ بعض مسائل میں

مجتہد ہو اور بعض میں مجتہد نہ ہو۔ اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے (اور اسی سے فرائض میں اجتہاد کا حکم متفرع ہے) یعنی وہ شخص جسکو فرائض سہام کے نصوص اور فرائض سے متعلق آثار و اروہ کی معرفت حاصل ہے اور اجتہاد کرتا ہے فقط، یعنی وہ دوسرے احکام میں اجتہاد نہیں کر سکتا

اکثر نے کہا، ہاں! اجتہاد کا تجزیہ ممکن ہے، اور یہ کہنے والوں میں سے چافیعوں میں امام حجۃ الاسلام غزالی ہیں اور ہم حنفیوں میں سے شیخ ابن ہمام ہیں۔

نیز صاحب البدیع کا بھی کہنا ہے اور قرین صواب بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا کہ اجتہاد کی تجزی جائز نہیں، اور ابن حاجب نے اس باب میں توقف کیا ہے۔

حاصل کلام مجتہدین کے ان طبقات میں سے پہلے طبقہ کو مجتہد مستقل اور دوسروں کو غیر مستقل کہتے ہیں۔

اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صاحب ''قوۃ الایمان'' مولوی کرامت علی جونپوری، رسالہ ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' مصنف مولوی دہلوی سے نقل کرتے ہیں۔

مولانا محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مجتہد وہ شخص ہے جس میں یہ پانچ قسم کے علم جمع ہوں، ۱۔ کتاب اللہ کا علم، ۲۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم، ۳۔ علماء سلف کے اقوال کا علم کہ کس بات میں اُن سب نے اجماع کیا اور کس بات میں اختلاف کیا، ۴۔ لغت کا علم، ۵۔ قیاس کا علم۔

اور قیاس اس کو کہتے ہیں کہ جس وقت کوئی حکم قرآن، حدیث اور اجماع میں نہ مل سکے تو اس حکم کو قرآن اور حدیث سے قیاس کر کے نکالا جائے اور اس کام کے لئے ضروری ہے کہ علوم قرآن میں سے ان تیرہ باتوں کا علم ہو۔

ناسخ، منسوخ، مجمل، مفسّر، خاص، عام، محکم، متشابہ،

ان وجوب، ندب، اباحت، تحریم، کراہت،
الفاظ کی تفسیر کی چنداں ضرورت نہیں۔ اہل علم اصول فقہ سے معلوم کر سکتے ہیں اور عوام کے لئے یہ ضروری نہیں۔

جس طرح علوم قرآن میں سے مذکورہ امور کی معرفت ضروری ہے اسی طرح حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان ۱۳ چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ صحیح، ضعیف، سند اور مرسل کا جاننا، اور ترتیب کتاب کی سنت پر، اور ترتیب سنت کی کتاب پر یعنی دونوں کے رتبہ کا نگاہ رکھنا اور ان کے حکم کو موافق (تطبیق) کرنا، جس میں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی حدیث پائیں کہ وہ ظاہر میں قرآن کے خلاف ہو تو پھر حکم مجمل رہ جائے۔ اور حدیث نبویؐ تو ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو قرآن کے معنی و مضمون کی تفسیر ہوتی ہے۔

اور ان احکام شرع کا جاننا واجب ہے جو آیات اور احادیث میں وارد ہیں اور قصے، اخبار اور وعظ کے طور پر جو آیت وحدیث ہیں ان چیزوں کا جاننا واجب نہیں۔

اور اسی طرح اُس قدر علم لغت کا جاننا واجب ہے جس قدر لغتیں ان آیات، حدیثوں میں آئے ہیں جن میں احکام شرع ہیں، عرب کی تمام لغتوں کا جاننا ضروری نہیں۔

اور لغت میں اس قدر دخل ہونا چاہئے جس سے کلام عرب کے مطلب کو دریافت کر سکیں اور مقام اور احوال کا اختلاف سمجھ سکیں، کیونکہ اللہ اور رسولؐ نے عربی زبان میں حکم فرمایا ہے۔ لہٰذا جو کوئی اس زبان (عربی) سے ناواقف رہیگا وہ شرع کے احکام سے بھی ناواقف ہوگا۔

اور اس بات کا جاننا اور واقف ہونا بھی ضروری ہے کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال جو احکام شرع میں وارد ہیں اور فقہائے امت کے اقوال معتبرہ سے جو فتاوی صادر ہوئے ہیں۔ تا کہ اس شخص کا حکم ان لوگوں کے قول کے مخالف نہ ہو۔ ان کے اقوال کی مخالفت کرنا گویا

اجماع کی خلاف ورزی ہے۔

پس جس شخص نے مذکورہ باتوں کو بخوبی جانا وہ مجتہد ہے اور یہ شرط نہیں کہ صحابہ اور تابعین کے سارے اقوال سے واقف ہو کہ ان کا کوئی قول چھوٹنے نہ پائے۔ اور جو شخص مذکورہ باتوں سے واقف نہیں ہے تو اس کو تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں، اور ایسا شخص جو اماموں کے مذہب میں سے کسی ایک امام کے مذہب کو اختیار کر چکا ہے تو اس کو اپنی رائے اور اجتہاد پر حکم

کرنا اور فتویٰ دینا نہیں چاہئے اور اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں۔

اور جب کسی شخص میں مذکور تمام باتوں کا علم جمع ہو اور وہ شخص خواہش نفسانی اور بدعات سے کنارہ کش ہو اور صاحب تقویٰ ہو اور گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ پر مداومت کرنے والا نہ ہو تو اس کو درست ہے کہ شرع میں اپنے اجتہاد اور فتویٰ سے حکم لگا دے اور جس شخص کے اندر یہ سب شرطیں جمع نہیں ہیں تو اس پر مجتہد کی تقلید واجب ہے، ان نئے حادثوں اور واقعات کے اندر، جو پیش آئیں۔

# دوسرا مقدمہ

فقہ اور اجتہاد فقہا و صوفیا کی ماہیت، سرور انام صلی اللہ علیہ وسلم کے الہام کا حکم، اولیائے کرام کے الہام کا حکم علوم دینیہ کے اقسام۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا معرفة النفس مالها وما عليها نفس کو نفع دینے والے اور ضرر پہنچانے والے امور کی معرفت اور پہچان، فقہ ہے۔ پس یہ تعریف اعتقادیات (علم کلام) وجدانیات (علم تصوف) عملیات (علم فقہ) کو بھی حاصل ہے۔

اس تعریف میں عملاً زیادہ کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں فقہ کی حد و تعریف سے

پہلے دو علوم (یعنی علم کلام و تصوف) خارج ہو جاتے ہیں۔ **کذافی التوضیح۔**

بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں لکھا ہے حسیات کے ساتھ مخصوص کرنا جو اعضاء سے متعلق عملیات ہیں، تصوف سے احتراز کرنا ہے کیونکہ اس میں قلوب کے اعمال سے بحث ہوتی ہے مثلاً وجوبِ توبہ، حرمت بُخل و کبر اور قضاء تقدیر الٰہی سے رضا کا وجوب ولزوم۔ یہ سب بعد کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں اور یہ تخصیص صحابۂ کرام اور تابعین کے زمانہ میں نہ تھی، اور اصطلاح کے بدلنے میں کوئی فائدہ اور نقصان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اولیٰ یہی ہے کہ ''فقہ'' اعمال جوارح اور قلب دونوں کو شامل ہو۔ ہاں علم کلام سے احتراز کرنا یہ بھی اگرچہ کہ بعد کی بنائی ہوئی بات ہے، صحابہ اور تابعین کے درمیان رائج نہ تھی، اس لئے الفقہ کو امام اعظم نے فقہ اکبر کہا ہے اور فقہ کی تعریف بھی ایسی کی ہے جو اس کو بھی شامل ہے اور وہ ہے **معرفة النفس مالها وما عليها**۔ لیکن یہ متاخرین کے درمیان مشہور عرف ہے۔ اس کے خارج کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ غرض الفقہ سے علم تصوف اور علم کلام کا خارج کرنا، متاخرین کی اصطلاح ہے۔

پس اسی سے جاننا چاہیئے کہ اجتہاد، علماء فقہ ساتھ ہی خاص نہیں۔ صوفیاء بھی اجتہاد میں فقہا کے ساتھ شریک ہیں۔ شیخ الہند ''مرج البحرین'' میں فرماتے ہیں۔ اس طائفہ صوفیہ کے بھی خاص طریقے، آداب، اصطلاحات اور مستحسنات ہیں، جیسے خانقاہوں کی تعمیر، الباس خرقہ، اجرائے مقراض، کیفیات ذکر، خلوت گزینی اور اجتماع سماع وغیرہ اور علماء فقہ کی طرح ان امور کے اندر صوفیہ کے اجتہادات اور استنباطات ہیں۔ اور یہ بھی ابواب علم کی ایک قسم ہے کہ جس میں اجتہاد کی صحت اور اس کے شرائط اور سنت و بدعت کی تحقیق سے بحث ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر صوفی اور فقیہ دونوں برابر ہیں اور دونوں سے اپنے اصل کے وجود اور دلیل کی صحت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

مولوی دہلوی ''صراط مستقیم'' کے پہلے باب میں لکھتے ہیں، شریعت کا ایک باطن ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے قلب کا تعلق ہے۔ ایک ظاہر ہے اور وہ اوامر کی پیروی اور مناہی سے اجتناب ہے۔

نیز اسی میں لکھتے ہیں اور چونکہ اصحابِ طرق (مختلف سلاسل) کے اولیاء کبار نے فنِ باطن شریعت میں امامت حاصل کی اور اصلاحِ قلب کے قواعد میں (جو دین متین کا خلاصہ ہیں) اجتہاد کی قوت حاصل کی تھی۔

جب حب ایمانی کو متواترات اور یقینیات دینیہ سمجھا اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو جمہور اہل ملّت نے محفوظ پایا۔ یہاں تک کہ عوامِ اہل ملّت میں سے ہر عامی شخص (جو ان کے بابرکت زمانہ میں موجود تھا) اللہ کی اطاعت، جوازِ مطلق کے احکام کی پیروی، شرعِ نبویؐ کی پابندی اور دین مصطفوی کو اپنا دین بنالینے کو یقینی طور پر اپنے ذمہ فرض جانتا تھا اور شکر منعم اور اس کی محبت کی اچھائی اور کفرانِ منعم اور اسکی مخالفت کی برائی کو تمام بدیہات میں سے سب سے زیادہ بدیہی شمار کرتا تھا۔ اس بناء پر ان اولیاء کرام نے اپنے پیروں کے اذہان میں ان حقائق کو مسلم الثبوت پایا تو حب ایمانی (یعنی طور ولایت) اور اسکے لوازم کی بحث تحصیل حاصل سمجھ کر احکامِ حب عشقی (یعنی طریقۂ ولایت) کی تفصیل اور اس کے ثمرات کی وضاحت اور ان کی تحصیل کی راہوں کے احاطہ کا قصد کیا اور اس امر میں بڑی کوشش کی اور اہل اسلام کے جم غفیر کو نفع عظیم پہنچایا اور اس سبب سے بارگاہِ رب العالمین میں عظیم وجاہت اور بڑی عزت پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے، اور اعلیٰ علیین میں ان کے مراتب ودرجات بلند کرے۔

اسی وجہ سے شیخ الاسلام نے ''منازل السائرین'' میں ان سو مقامات کا ذکر کیا ہے جو سفر اول بین العبد والرب میں واقع ہیں اور ان تمام مقامات کو آیاتِ قرآنی کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔

اور سند العلماء ''سورۃ البقرہ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ چھ گروہ ہیں جن کی پیروی اللہ کے حکم سے فرض ہے۔ ان میں سے مجتہدین شریعت اور شیوخ طریقت بھی ہیں، کہ جن کا حکم عوام کے لئے بطریق واجب مخیر، لازم الاتباع ہے، اس لئے کہ اسرارِ شریعت اور دقائق طریقت کا سمجھنا ان (مجتہدین اور صوفیاء) کے لئے آسان اور سہل بنایا گیا ہے۔ **واسئلو اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون** اہل ذکر سے دریافت کرلو اگر تم نہیں جانتے۔

یہ بھی جاننا چاہئے کہ سرورِ انام صلی اللہ علیہ وسلم کا الہام حجتِ قطعی ہے اور اولیائے کرام کا الہام، اختلافی اور غیر قطعی ہے، ''صاحب مسلم الثبوت'' نے کہا۔ حضور اکرم کا الہام حجتِ قطعی ہے۔ آپ کے لئے بھی اور غیروں یعنی امت کے لئے بھی حجت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے الہام سے متعلق یہ جو کہا گیا ہے کہ احکام میں حجت ہے، یہ قول ایک صوفیاء کے گروہ اور جماعت جعفریہ کی جانب منسوب ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''صرف صاحب الہام پر حجت ہے'' یہ قول عامۃ العلماء کی طرف منسوب ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''اصل میں حجت نہیں'' یہ قول ابن الہمام کی جانب منسوب ہے۔

بحر العلوم نے ''شرح مسلم الثبوت'' میں لکھا ہے کہ اس طریقہ کا علم، اس علم سے زیادہ بلند ہے جو غیر قطعی ادلّہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس شیخ (ابن ہمام) جیسوں سے یہ نہایت تعجب انگیز بات ہے، ایک ظرف علم (یعنی الہام) کو ترک کر دیا۔ شاید انہوں نے یہ زعم کیا ہے کہ الہام خطرات کی قسم کی ایک بات ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔ کیا تم نے اپنے زمانہ کے قطب شیخ ابو یزید البسطامی سے نہیں سُنا کہ انہوں نے ایک محدث کو لکھا۔ تم ایک میت سے، جو دوسری میت سے روایت کرتا ہے علم حاصل کرتے ہو اور پھر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہو۔ لیکن ہم اس زندہ وحی (اللہ) سے علم حاصل کرتے ہیں جس کو موت نہیں۔

اور اگر تم شیخ محی الدین ابن عربی، قطب وقت سید محی الملۃ والدین سید عبد القادر جیلانی جن کا قدم تمام ولیوں کی گردنوں پر ہے، شیخ عبداللہ تستری، شیخ ابومدین الغربی، شیخ ابو یزید بسطامی، سید الطائفہ جنید بغدادی، شیخ ابوبکر شبلی، شیخ عبداللہ انصاری اور شیخ احمد النامقی الجامی اور ان کے علاوہ دیگر اولیائے کرام کے مقامات وحالات وجد اور اذواق میں غور وفکر کرو تو عقل یقین سے جان لوگے کہ ان کو جو الہام کیا گیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں پا سکتا، بلکہ وہ حق ہے، حق ہے، حق ہے۔ اور نفس الامر کے مطابق ہے اور اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ یہ علم ضروری پیدا کر دیتا ہے کہ وہ الہام اللہ کی طرف سے ہے لیکن وہ (اولیاء) اس ظرفِ علم (الہام) کو صرف مدد اور تائید محمدیؐ ہی سے پاتے ہیں۔ بالذات بغیر وسیلہ کے ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اگر شیخ اکبر خلیفۃ اللہ فی الارضیین خاتم فص ولایت محی الملۃ والدین شیخ ابن عربی قدس سرہٗ **وقفنا بفهم كلماته الشريفه** کے کلام میں غور وفکر کریں تو تمہیں کسی قسم کا وہم اور شک وشبہ باقی نہیں رہیگا کہ ان کو جو الہام کیا جاتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو اس قابل ہے کہ وہ تم کو اس بات کی تنبیہ کرے کہ وہ (الہام) دین کے علم ضروری میں سے ہے۔ کیونکہ اس امت کے اولیاء گذری ہوی امتوں کے اولیاء سے افضل ہیں۔ جیسا کہ امت کے نبی، انبیائے سابقین سے افضل ہیں اور کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل میں جو اولیاء موجود تھے مثلاً حضرت مریم، ام موسیٰ، اور زوجۂ فرعون، جن کی طرف وحی کی جاتی تھی جو کم از کم ایسا الہام تھا جس کے ساتھ یہ علم ضروری بھی پیدا ہوتا تھا۔ کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے پس وہ قطعی حجت ہے، اگر اس امت مرحومہ میں سے تحصیل علم قطعی میں کوئی ان سے فاضل تر نہ ہو تو ایسی صورت میں امت مرحومہ کا شخص، ان اولیاء بنی اسرائیل سے فضیلت میں انتہائی درجہ کم مرتبہ ہوگا اس لئے کہ تفاضل (ایک دوسرے پر فضیلت) صرف علم سے ہے اور علم کے ماسوا کسی اور چیز میں فضیلت کا اعتبار نہیں۔

شیخ کبیر صدرالدین قونوی ''تبصرہ'' میں فرماتے ہیں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کامل اولیاء کی ایک جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ السلام کے اذواق میں سے ایک حصہ میسّر ہے اور ان کو اولیاء کے انبیاء کہتے ہیں اور حقیقت میں یہی حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخوان، وارث اور خلفاء ہیں اور فرمانِ مصطفیٰ میرے بعد آنے والے بھائیوں کی ملاقات کا کیا ہی شوق ہے۔ اسی خاص طبقہ کی طرف اشارہ ہے اور یہی طائفہ اس فرمانِ محمدیؐ کا مصداق ہے۔ علماء امتی کا نبیاء سائر الاسم وممن خلقنا امة یهدون بالحق وبه یعدلون اور جن کو ہم نے پیدا کیا اس میں ایک امت ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو حق کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں اور حق کے ساتھ عدل کرتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جب اوپر جاتے ہیں تو فائدہ حاصل کرتے ہیں اور جب نیچے اترتے ہیں تو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

''تبصرہ'' میں ایک اور جگہ شیخ قونوی لکھتے ہیں: بجز نبوت تشریع کے ( جو ان کے درمیان نہیں ہے اس لئے کہ وہ نبوت تشریع ایک بند دروازہ ہے ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین ) دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اذواق ومکاشفات میں ان کا حصہ ہے یا ابابکر لیس بینی وبینك فوق الا اننی بعثت اے ابوبکرؓ مجھ میں اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ میں مبعوث ہوا ہوں یا عمر لولم ابعث لبعثت اے عمر! اگر میں مبعوث نہ ہوتا تو تم مبعوث ہوتے۔

امام ربانی جلد دوم کے ۵۵ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں یہ بات صحیح ہے کہ خواص اہل اللہ، اللہ کی ذات وصفات اور افعال کی معارف میں بعض ان اسرار ودقائق کا علم رکھتے ہیں جن سے ظاہر شریعت ساکت ہے۔ علماء ظاہر امور دین کے اندر اخبار غیبیہ کو اخبار پیغمبراں کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں اور دوسروں کو ان غیبی اخبار میں شریک نہیں سمجھتے، یہ

بات معنی وراثت کے منافی ہے، اور بہت سارے علوم ومعارف صحیحہ جو دینِ متین سے متعلق ہے، ان کی نفی ہے، البتہ شرعی احکام کا ادلہ اربعہ سے تعلق ہے، جن میں الہام کی گنجائش نہیں۔ لیکن امور دینیہ جو احکامِ شرعیہ کے علاوہ ہیں، وہ بہت ہیں، اوران میں اصل خاص، الہام ہے اور یہ اصل، عالم کے فنا ہونے تک قائم ہے پس دوسروں کو ان بزرگوں۔ سے کیا نسبت؟

سوال: جب کتاب وسنت سے دین مکمل ہوگیا تو! کمال کے بعد الہام کی کیا ضرورت ہے اور وہ کونسی کمی رہ گئی تھی جو الہام سے پوری کی جائے؟

جواب: الہام، دین کے کمالاتِ خفیفہ کو ظاہر کرنے والا ہے نہ کہ دین میں زائد کمالات کو ثابت کرنے والا، جس طرح اجتہاد، مظہر احکام ہے، اسی طرح الہام، مظہر دقائق و اسرار ہے۔ جن کے جاننے سے اکثر لوگوں کی عقل قاصر ہے۔ اگر چہ کہ اجتہاد اور الہام میں فرق واضح ہے، کیونکہ اجتہاد کا اعتماد، عقل ورائے پر ہے اور الہام کا اعتماد خالق عقل ورائے (اللہ) پر ہے۔ بس الہام میں ایک قسم کی اصلیت پیدا ہوگئی جو اجتہاد میں نہیں ہے۔ الہام، نبیؐ کے اعلام اور اخبار کے مانند ہے جو ماخذ سنت ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا۔ الہام اگر چہ کہ ظنی ہے اور نبی کا اعلام قطعی ہے ربنا اتنا من لدنك رحمۃ وھیئ لنا من امرنا رشدا۔

مولوی دہلوی صراط مستقیم کے پہلے باب میں لکھتے ہیں اس سے اعلیٰ وارفع درجہ نیابت عن اللہ کا مقام ہے جس کا تعلق حدودشرعیہ کے مقرر کرنے اور حقیقت حکم کی جگہ مظنتِ حکم کو قائم کرنے اور عموماً تربیت نوعِ انسانی کے ارکان، آداب شروط اور مفسدات کے معین کرنے سے ہے۔ فی الحقیقت یہ مقام، اصحاب شرائع انبیاء ومرسلین کا مقام ہے۔ اور ان (انبیاء ومرسلین) کی مکمل طاعت کے سبب اس مقام کا ایک پرتو اور عکس انبیائے کرام کے عظیم المرتبت متبعین کو حاصل ہوتا ہے جن کو صوفیہ کے عرف میں مضہمین کہتے ہیں اس مقام کو پیشوائے اربابِ تعلیم ومقتدائے اصحابِ تفہیم حضرت شیخ ولی اللہ قدس سرہٗ کی اصطلاح میں

مقام قرب فرائض سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولوی دہلوی ''خاتمہ صراط مستقیم'' میں لکھتے ہیں کمالات ولایت کے طریق استفادہ کے باب میں پہلے یہ جاننا چاہئے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقہ میں مجاھدات، ریاضات، اذکار، اشغال اور مراقبات متعین کئے گئے ہیں۔

نیز اسی میں لکھتے ہیں کہ اشغال، اذکار، مجاہدات اور مراقبات فی الحقیقت تشریع کا ظل اور پرتو ہیں، اور جو شخص مقام قرب فرائض میں قائم ہے اگر وہ عزیز، انبیاء کی قسم سے ہو تو لازم ہے کہ صاحب شریعت مجددہ ہو۔۔ ورنہ اللہ تک پہنچانے والے طریق کے اوضاع کا تعین اسکے اصلِ طبیعت سے فوارہ کے مانند **جوشندن** ہوتا ہے اور اس میں تعلیم و تعلّم کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور یہ جاننا چاہئے کہ علوم دینیہ کی کئی قسمیں ہیں، شرح مشکوٰۃ ''کتاب العلم میں شیخ الھند لکھتے ہیں کہ علم سے علمِ دین مراد ہے جو کتاب وسنت سے متعلق ہو، اسکی دو قسمیں ہیں۔ مبادی اور مقاصد۔ مبادی وہ علوم ہیں، جن کا تعلق اعمال واخلاق اور عقائد سے ہے اور یہ سب علم معاملہ ہیں۔ اور علم مکاشفہ وہ نور ہے، جو طریق حق کے سلوک اور صدق معاملہ کے بعد دل میں پیدا ہوتا ہے جس کے بعد حقائق اشیاء کی کما ہی معرفت، منکشف ہوتی ہے اور ذات وصفات اور افعال حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور اسکو علم حقیقت اور علم وراثت کہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے، **من عمل بما علم ورثه اللّٰه علما مالا يعلم** جو شخص اپنے حاصل کئے ہوئے علم پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس علم کا وارث بناتا ہے جس کو وہ نہیں سیکھا ہے۔ چنانچہ آیت **واتقوا اللّٰه ويعلمكم اللّٰه** میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اور علم ظاہر و باطن، جو کہتے ہیں اس کے بھی یہی معنی ہیں اور ان میں سے ایک کی دوسرے سے نسبت، بدن اور جان اور پوست اور مغز کی ہے۔ آیات و احادیث جو علم کی شان وفضیلت کے باب میں وارد ہیں، وہ ان تمام اقسام پر تفاوتِ مراتب و

درجات کے ساتھ شامل ہیں۔

مولوی دہلوی ''مقدمہٗ ایضاح الحق'' کی فصل اول میں لکھتے ہیں: امر دین سے مراد وہ چیز ہے جس سے احکام شارع کا تعلق ہوسکتا ہے جیسا کہ فرمایا اذا امرتکم بشیء من امر دین فاخذوا بہ جب میں تمہارے دین کے امر میں کسی چیز کا حکم دوں تو اس پر عمل کرو۔ اس معنی امرِ دین، بطریق استقراء، عقائد حقہ، اخلاق جمیلہ، مقامات، حالات، واردات قلبیّہ، اقوال لسانیہ اور افعال جسمانیہ میں خواہ جنس عبادات سے ہوں یا جنس عادات سے ہوں، یا جنسِ معاملات سے ہوں، منحصر ہے۔

اسی سے یہ بات ظاہر ہے کہ احکام شرعیہ، ادلّہ اربعہ سے مربوط ہیں جن میں الہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احکام شرعیہ کے علاوہ امور دینیہ بہت ہیں جن میں اصل خاص الہام ہے۔ مقامات، حالات، واردات اور اخبار غیبیہ جو اولیائے کرام اور وارثین انبیائے کرام کی امتیازی خصوصیات ہیں، الہام سے مربوط ہیں۔

اور امور غیبیہ عقائد حقہ ہیں یا اعمال انسانیہ، اول کو علم کلام کہتے ہیں اور ثانی (یعنی اعمال انسانیہ) اعمال بدنیہ ہیں یا اعمال قلبیہ اور ان میں سے اول (یعنی اعمال بدنیہ) کو جو اقوال لسانیہ اور افعال جسمانیہ ہیں، علم فقہ کہتے ہیں۔ اور ان میں سے ثانی (یعنی اعمال قلبیہ) کو اگر رذائل سے خالی اور فضائل سے مزین ہو تو اس کو اخلاقِ جمیلہ کہتے ہیں اور اگر حالات قدسیہ کے انوار سے قلب منور ہو تو اس کو علم تصوف کہتے ہیں۔

# تیسرا مقدمہ

قرآن وحدیث سے احکام استنباط اور اجتہاد کرنے کا حق مقلد کو نہیں پہنچتا، مجتہد کا قول ہی اس کے لئے دلیل وحجت ہے۔ نہ مقلد کا ظن ہے اور نہ مجتہد کا ظن جیسا کہ کتب

اصول میں مذکور ہے۔

شرح المسلم میں بحر العلوم نے فرمایا۔ وجوب العمل کے لئے ظن کے توسط سے علم حاصل کرنا اجماعاً مجتہد کی خصوصیات میں سے ہے جس میں مقلد کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ مجتہد کا وہی قول، جس میں وہ فتویٰ دے۔ مقلد کے لئے دلیل اور سند ہے۔ نہ مقلد کا ظن ہے اور نہ مجتہد کا ظن ہے۔ اس وقت طرد (ا) حاصل ہوگا کیونکہ مقلد کی معرفت اس تعریف سے خارج ہے۔ اس لئے کہ مقلد کو وجوب عمل کا علم ہی نہیں۔

اور امام ربانی مکتوبات کی جلد اول کے ۲۸۶ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں، مقلد کو اس بات کا حق نہیں کہ مجتہد کی رائے اور اس کے قول کے خلاف، کتاب وسنت سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے۔

اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مقدمہ ''ایضاح الحق'' کی فصل اول کے اندر مسئلہ استنباطِ احکام میں فرماتے ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قیاس کنندہ طبقہ مجتہدین میں سے ہوگا نہ کہ مقلدین میں سے۔

ان شہادتوں سے واضح ہے کہ مرتبۂ اجتہاد سے احکام اخذ کرنے کا حق پیدا ہوتا ہے۔ اور مقلد کو مجتہد کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اور علامہ میبذی ''فواتح'' کے پہلے فاتح میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے تقلید کی رسی اپنے سر سے دور کر کے فطرت اصلی کو سرنگوں کر دیا ہے۔ بہت سے اولیاء کرام اور صوفیہ کرام کی نفی کر رہے ہیں۔ اور جو بات بھی ان کے کانوں میں پہنچتی ہے، انکار کرتے ہیں۔ اور ظاہر نبوت اور اس کے توابع پر قناعت نہیں کرتے اور اپنی طرف سے چند ایسی بے ہودہ باتیں گھڑتے ہیں کہ ان کی طبیعت نہ تقلید کی راہ چلنے دیتی ہے اور نہ انہیں توفیق ہوتی ہے کہ تحقیق کی بو بھی سونگھیں ۔مذبذبین بین ذلک لا الیٰ ھولاء ولا الیٰ ھولاء ۔

(۱) طرد۔ تلازم فی الثبوت کو کہا جاتا ہے یعنی حد جہاں ہو، وہاں محدود بھی پایا جائے۔ مثلاً انسان کو حیوان ناطق سے حد کیا جائے یہ لازم ہے کہ جہاں حیوان ناطق ہو، وہاں انسان ہونا لازمی ہے (مترجم)

از بہر فساد و جنگ جمعے مردم — کردند بکوے گمراہی خود را گم

در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند — فی القبر یضرھم ولا ینفعھم

لوگوں کی ایک جماعت نے فساد اور جنگ کے واسطے گمراہی وضلالت کی راہ میں اپنے تئیں گم کر دیا ہے۔ مدرسہ میں جو علم کہ سیکھا ہے، قبر کے اندر انہیں نقصان پہنچائے گا۔ اور کچھ نفع نہ دیگا۔ یعنی جن لوگوں نے علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں میں فتنہ وفساد، اور انتشار پھیلایا تو یہی علم ان کے لئے آخرت میں ضرر رساں ثابت ہوگا۔

نیز علامہ میبذی ''فواتح'' میں لکھتے ہیں، کہ کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں امام غزالیؒ نے ابونصر فارابی اور ابوعلی سینا (جو حکمائے مشائین کے اکابرین میں سے ہیں) کی تکفیر فرمائی ہے، کیونکہ ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں اور حشر اجساد نہیں اور عالم کا قدیم ہونا واجب نہیں ہے۔

ترک تقلید سے اکابر عقلاء اور حکمائے اسلام کا جب یہ حال ہوا تو دوسروں کا حال کیا ہو سکتا ہے۔

محمدی فرقوں میں بہتر ۷۲ بدعتی فرقے۔ مجتہدین اہل سنت وجماعت کی تقلید چھوڑنے کے باعث گمراہی وضلالت کی وادی میں حیران و پریشان ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے غیر معتبر قیاس سے مقلدین کتاب وسنت سے احکام اخذ کریں تو ہزاروں گمراہ اور باطل مذاہب پیدا ہوتے رہیں گے۔

# چوتھا مقدمہ

مقلد کو حق نہیں کہ بعض فقہاء کے مذہب کو بعض دوسرے فقہا کے مذہب پر ترجیح

دے۔زیادہ سے زیادہ اس کا کام اتنا ہے کہ وہ فقہا کے اختلاف اور فقہا نے جس چیز کو اختیار کیا ہے، اس کا بیان کردے۔ مجدد و مجتہد حافظ احادیث نبوی شیخ جلال الدین سیوطی ''جُزیل المواہب فی اختلاف المذاہب'' میں فرماتے ہیں:

یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ کچھ لوگ بعض مذاہب کی فضیلت اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ اس سے دوسرے مذاہب کی تنقیص لازم آتی ہے اور اس کی وجہ سے بسا اوقات، بے علم نادانوں کے درمیان خصومت و دشمنی اور جنگ وجدال کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ اہل علم کا دامن اس قسم کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہے اور بے شک فروعات میں صحابۂ کرام کے درمیان میں بھی اختلافات رونما ہوئے، حالانکہ یہ حضرات خیر امت ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی آپس میں ایک دوسرے کو خطا اور غلطی سے منسوب کیا۔

مولانا خرم علی ''شفاء العلیل ترجمۂ قول الجمیل'' میں فرماتے ہیں: کہ بعض فقہا کے مذہب کو بعض دوسرے فقہا کے مذہب پر ترجیح اور فوقیت دینے کے بارے میں گفتگو نہ کریں بلکہ جملہ مذاہب کو قبولیت کے درجہ میں رکھیں۔ کیونکہ جمہور اہل سنت و جماعت کے نزدیک مذاہب اربعہ میں حق دائر ہے۔ لہٰذا سب کو مجملاً حق جاننے کو فرمایا، اور ترجیح مذہب کی گفتگو سے اس واسطے منع کیا کہ ایک مذہب کو ترجیح دینا، اکثر ذہنوں میں باقی مذاہب کی تنقیص اور تذلیل کا باعث ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی سبب سے بعضے حنفی، شافعی کے مذہب کو بُرا کہنے لگتے ہیں۔ اور بعضے شافعی، مذہب حنفی پر طعن کرتے ہیں، اسی بھید سے افضل الخلق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مجھے یونس علیہ السلام سے افضل نہ کہو۔ واللہ اعلم۔

اور اسی طرح صوفیاء کے طریقوں کو بعض دوسرے صوفیہ کے طریقوں پر ترجیح دینے کا حق مقلد کو نہیں پہنچتا۔ صاحب شفاء العلیل فرماتے ہیں کہ بعض صوفیاء کے طریقوں کو بعض دوسرے صوفیاء کے طریقوں پر ترجیح دینے کی بات نہ کی جائے اور ان میں سے، جو مغلوب

الحال ہیں ان کا انکار نہ کیا جائے۔

# پانچواں مقدمہ

اہل سنت و جماعت کا اختلاف چاہے وہ ظاہر شریعت کے مسائل میں ہوں یا باطنِ شریعت کے مسائل میں ہوں، وہ اختلاف، اہل اسلام اور اہل کتاب کے اختلاف یا سنّی ورافضی یا سنّی وخارجی کے اختلاف کی طرح نہیں ہے۔ کہ ایک جانب سے دوسرے جانب کی تکفیر و تضلیل کی جائے بلکہ حق ان مختلف اقوال میں منحصر ہے۔ مجتہد اور مقلد ان دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ اگر ایک قول کی دلیل زیادہ راجح ہو تو دوسرے قول کو گمراہی کی ضلالت نہیں سمجھنا چاہئے۔

صاحب ''نورالانوار'' لکھتے ہیں، اہل سنت کا جو اختلاف ہے وہ صرف احکام فقیہہ کے اندر ہے۔ عقائد دینیہ میں نہیں ہے، کیونکہ اعتقادیات میں خطا کرنے والا یقیناً کافر ہے جیسے روافض، خوارج، معتزلہ اور ان جیسے دوسرے فرقے، اس سے یہ اشکال نہیں پیدا ہوتا کہ اشعریہ اور ماتریدیہ نے بھی بعض اعتقادی مسائل میں اختلاف کیا ہے اور ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کو گمراہ نہیں کہا۔ اس لئے کہ وہ اختلاف، امہات مسائل میں سے نہیں ہے کہ جن پر دین کا دار و مدار ہو۔

نیز ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے پر تعصب اور عداوت سے کچھ نہیں کہا۔ اور اسی طرح بعض کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اختلاف جو ماتریدیہ اور اشعریہ کے درمیان ہے وہ صرف مسائل اجتہادیہ کے اندر ہے۔ کتاب وسنت کی تاویل میں نہیں ہے کیونکہ ان میں یعنی قرآن وحدیث میں بالاجماع حق ایک ہی ہے اور تاویل میں خطا کرنے والا قابل عتاب ہے۔

اور شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج'' کے دسویں باب کی چھٹی نوع میں فرماتے ہیں۔ اختلافی اور فروعی مسائل میں ایک جانب کا یقین کرنا اور اسی کو ترجیح دینا اور اس میں تعصب کا اظہار کرنا اختلاف کا مناسب طریقہ نہیں ہے۔

نیز اسی میں لکھتے ہیں، اختلافی امر میں ایک دوسرے پر عیب نہیں لگانا چاہئے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ فربکم اعلم بمن ھوا ھدیٰ سبیلا تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ زیادہ ہدایت کی راہ پر کون گامزن ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولوی نور اللہ کے نام لکھے ہوئے مکتوب میں فرماتے ہیں، ہم لوگ جو اس اختلاف کے پیدا ہوئے ہیں طرفین میں سے کسی ایک طرف کا یقین نہیں کر سکتے، ہم لوگوں کے لئے یہی راہ باقی رہ گئی ہے، کہ جس طرح مذاہب اربعہ میں حق کو دائر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مثلاً مذہب حنفیہ درست وصواب ہے لیکن خطا کا احتمال ہے اور مذہبِ شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے مذاہب خطا ہیں لیکن درست ہونے کا احتمال ہے بالکل اسی طرح مذہب توحید وجودی اور مذہب توحید شہودی کا حال ہے اگر ان میں سے ایک دلیل کی وجہ سے راجح ہو تو دوسرے کو گمراہی وضلالت نہیں سمجھنا چاہئے۔

نیز اسی مکتوب میں فرماتے ہیں، توحید وجودی اور توحید شہودی کے فرق کی وجہ سے امت کے درمیان جو اختلاف کھڑا ہوا، وہ سنّی وخارجی یا سنّی ورافضی کے اختلاف کی طرح نہیں ہے کہ جانبین سے ایک دوسرے کی تکفیر وتضلیل کی جائے۔ بلکہ یہ اختلاف، مذاہب اربعہ کے اختلاف کے مانند ہے۔ فقہاء، صوفیاء اور محدثین کے تمام اختلافات اہل سنت وجماعت ہی کے اختلاف ہیں جو رحمت کا باعث ہیں۔ اور وہ واہل سنت وجماعت اور بدعتی فرقوں کے درمیان باہمی اختلاف کی طرح نہیں ہیں کہ جانبین سے ایک دوسرے کی تکفیر وتضلیل کی جائے۔

شیخ ابو نجیب ضیاء الدین عبدالقادر سہروری ''آدابِ مریدین'' میں فرماتے ہیں۔

صوفیاء نے فقہاء اہل سنت کا مذہب اختیار کیا، اور یہ حضرات، فروع میں علماء کے درمیان، اختلاف کا انکار نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، علماء کا اختلاف رحمت ہے بعضوں نے ان علماء کے بارے میں دریافت کیا، جن کا اختلاف رحمت ہے، فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنے والے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت و پیروی میں جہاد، اور سعی بلیغ کرنے والے اور حضرات صحابہ کی اقتداء کرنے والے ہیں اور وہ تین گروہ ہیں۔ محدثین، فقہاء، علماء صوفیہ۔ اس اختلاف کی تفصیل، آداب المریدین اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور شیخ محمد گیسودراز کی شروحات میں ملاحظہ کریں۔

شیخ جلال الدین سیوطی ''جزیل المواہب'' میں فرماتے ہیں، جاننا چاہئے کہ اس ملت میں مذاہب کا اختلاف بڑی نعمت اور عظیم فضیلت ہے اور اس کا لطیف راز ہے، جس کا علماء نے ادراک کیا ہے اور اس سے جاہل ناواقف ہیں حتیٰ کہ بعض نادان لوگوں کو یہ کہتے ہوے سنا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک ہی شریعت لائے، پھر یہ چار مذہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کہاں سے نکل آئے۔

# چھٹا مقدمہ

زمانۂ وحی کے اجتہادات میں خطا و صواب کا پہلو درمیانی نہیں ہے بلکہ سراسر مفید یقین ہیں جن میں ظن نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل اور اعتقاد واجب ہوتا ہے اور وہ احکام جو زمانۂ نبوت کے بعد مجتہدین کے اجتہاد سے حاصل کئے گئے ہیں وہ المجتہد یخطی ویصیب کے حکم کی رو سے خطا اور صواب کے درمیان ہیں لہٰذا موجب ظن ہے، موجب یقین واعتقاد نہیں، اس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل مفید ہے۔

بحر العلوم شرح المسلّم میں لکھتے ہیں:-

جاننا چاہئے کہ اصول شریعت تین ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور اصل رابع قیاس ہے جس کی بنیاد مذکورہ تین اصولوں سے مستنبط شدہ معنی پر ہو۔ قیاس کا افادہ ظنی ہے اور جمہور فقہا کے نزدیک اس سے یقین حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا قیاس سے عقائد ثابت نہیں ہوسکتے، نیز اصول ثلاثہ میں سے کسی ایک اصل کے ساتھ بھی قیاس معارض ہو جائے تو باتفاق ائمہ اربعہ معتبر نہیں۔ اور تین اصولوں میں کسی ایک اصل کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت باقی نہیں رہتی لہٰذا کسی واقعہ سے متعلق ادلۂ ثلاثہ کے نہ ہونے کی ضرورت میں قیاس ضرورتاً عمل کے لئے حجت ہے اگرچہ کہ وہ بھی شارع علیہ السلام کی طرف سے مقرر ہے۔

اسی لئے شیخ اکبر خاتم فص ولایت محمدی ابن عربی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ واذ قنا ما اذاقہ نے قیاس کو اصول شرعیہ میں سے ساقط کر دیا اور یوں فرمایا۔ کہ اصول شرع کتاب، سنت اور اجماع ہیں اور فرمایا قیاس اسی وقت معتبر ہے جب کہ اصولِ ثلاثہ میں حکم نہ ملے۔ اور وہ موجب یقین نہیں۔

مجتہد سے اگر خطا بھی ہو جائے تو اس کو ایک اجر ہے اور اس مجتہد کی تقلید اگرچہ کہ خطا ہو، نجات کا باعث ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ **ان اخطائت تلك حسنة** ۔ اجتہاد میں اگر تم سے خطا بھی ہو جائے تو ایک نیکی اور اجر ہے' اور دوسری حدیث میں ہے۔ مجتہد اجتہاد میں صحیح ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور اگر اس سے خطا ہو جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔ جیسا کہ توضیح اور دوسری اصول کتابوں میں یوں ہی مذکور ہے۔

امام ربانی شیخ احمد سرہندی، مکتوبات کی تیسری جلد کے ۲۲ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں، مجتہد پر اعتراض کی کیا بات ہے۔ اس کی خطا پر بھی ایک نیکی ہے اور اس کی تقلید اگرچہ کہ غلط ہو، نجات کا باعث ہے۔

# ساتواں مقدمہ

مقلد کے لئے مجتہد کی تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ اور بغیر کسی سبب اور وجہ کے اپنے امام کے مسلک کے خلاف عمل کرنے کا حق اس کو نہیں پہنچتا۔

صاحب شرح ''سفر السعادت''، شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے:

حاصل کلام مذاہب حق اور منزلِ مقصود کو پہنچنے کے راستے اور خانۂ دین میں داخل ہونے کے دروازے چار ہیں۔ اور جو شخص ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کرتے ہوئے اور ان دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کو پسند کرتے ہوئے دوسرا راستہ چلنا اور دوسرا دروازہ اختیار کرنا عبث اور بے ہودہ پن ہوگا۔ اور کارخانۂ عمل کو ضبط و ربط سے خارج کرنا اور راہ مصلحت سے باہر ہو جانا ہے۔ اور اگر ورع و تقویٰ اور احتیاط کے راستہ پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اپنے پسندیدہ مذہب کی وہ روایت اختیار کرے جس کی دلیل احسن اور اقویٰ ہو اور جس کا فائدہ زیادہ عام اور زیادہ مکمل ہو اور اس میں احتیاط زیادہ ہو۔ رخصت و سہل انگاری، اور حیلہ جوئی کی راہ اختیار نہ کرے۔ متاخرین کا یہی طریقہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ بہت ہی مضبوط اور محکم ہے۔

اور کہتے ہیں کہ پیش رو حضرات (متقدمین صحابہ اور اوائل تابعین) کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ یہ حضرات ایک مسلک کے تعین اور ایک ہی مجتہد کی اتباع کی تخصیص کو واجبات میں شمار نہیں کرتے تھے۔۔ مجتہدین کا عمل ان کے اجتہاد کے مطابق تھا اور عوام کا راستہ یہ تھا کہ مجتہدین کی جانب رجوع ہوں۔ لیکن یہ لازم نہیں تھا کہ کسی ایک مجتہد ہی کی پیروی کریں اور دوسرے مجتہد کا انکار کریں۔

اور علمائے متاخرین کی دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ مذہب و مسلک کی تبدیلی

،نفس کی خواہش اور ہوا و ہوس کی پیروی اور فقہی رخصتوں کی تلاش وطلب نہ ہو۔ مگر یہ کہ دوسرے مجتہد کے حق بجانب ہونے کا اعتقاد راجح ہو اور اس کو افضل جانے ، یا دوسرے مذہب میں احتیاط اور ورع زیادہ پائے۔ یا کسی ایسے مشکل واقعہ اور حرج عظیم میں مبتلا ہو جائے کہ اس کو دوسرے مذہب کی جانب رجوع کئے بغیر کوئی چھٹکارا نہ ہو، تو اس صورت میں بحکم ضرورت تبدیلیٔ مسلک جائز ہے۔

علمائے متاخرین میں سے اس جماعت کی یہ دلیل ہے کہ تمام مجتہدین، کتاب و سنت سے تمسک کرتے ہیں اور سبھی دین کے مقتدا اور پیشوا ہیں۔ لہٰذا کسی ایک مجتہد کے تعین اور تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ اور نص فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون اور حدیث اصحابی کالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم کا اشارہ بھی اسی طرف ہے یعنی جو چیز کہ تم نہیں جانتے ہو، اہل علم سے پوچھو اور ان سے سیکھو (قرآن کریم) میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں اور راستہ دکھلانے والے ہیں (حدیث شریف) اور دوسرے علماء کو بھی اسی میں شامل سمجھیں۔

یہ مذہب بظاہر انصاف سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے اور فوراً سمجھ میں آتا ہے، لیکن علماء کی قرار داد اور ان کی مصلحت بینی، آخر زماں میں، ایک مذہب کا تعین اور تخصیص ہے۔ اسی صورت میں امر دین و دنیا کا ربط وضبط بھی قائم رہتا ہے۔ ابتداء میں ہر شخص کو اختیار ہے وہ جس مجتہد کو چاہے، اختیار کرے۔ اس کی ایک صورت ہے اور لیکن کسی ایک مجتہد کو اختیار کرنے کے بعد دوسرے مجتہد کی طرف جانا پہلے مجتہد سے بدگمانی کا خیال اور اعمال و احوال میں تفرق اور تشعب کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی پر علمائے متاخرین کی قرار داد ہے اور وہی مختار ہے اور خیر اسی میں ہے کہ ایک مذہب کا تعین ہمیشہ رہے۔

اور وہ جو امام حجۃ الاسلام غزالی کیمیا کے رکن دوم اصل نہم میں فرماتے ہیں کہ کسی

شافعی کو جائز نہیں کہ وہ حنفی پر اعتراض کرے جب کہ وہ بے ولی نکاح کرے اور شفعۂ جوار حاصل کرے، اور اس جیسے دوسرے امور پر اعتراض کرے لیکن اگر کوئی شافعی شخص بغیر ولی کے نکاح کرے یا کھجور کی نبیذ استعمال کرے تو اس کو منع کرنا جائز ہے کیونکہ اپنے امام کی مخالفت کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

یہ متفقہ بات ہے کہ جو شخص اپنے اجتہاد کے خلاف یا اپنے صاحب مذہب (امام) کے اجتہاد کے خلاف کوئی کام کرے تو وہ عاصی اور گنہگار ہے اور یہ حقیقت میں حرام ہے اور جو شخص قبلہ کے تعین میں اجتہاد سے ایک جہت متعین کرے اور پھر اسی جانب پشت کر کے نماز ادا کرے تو وہ گناہ گار ہوگا۔ اگر چہ دوسرا یہ سمجھے کہ وہ درست جہت میں نماز ادا کر رہا ہے۔ اور یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ ہر شخص جو مذہب چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ بیہودہ بات ہے اور اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ظنِ غالب کے مطابق عمل کرے، جب اس کا ظنِ غالب یہ ہو کہ مثلاً شافعی زیادہ فاضل ہیں تو اس شافعی کی مخالفت میں بجز مجرد شہوت کے کوئی عذر نہیں۔

امام غزالی کا یہ قول وجوب تعین مذہب پر مبنی ہے۔ جس کو متاخرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا جیسا کہ ابھی گذرا۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بادشاہ بخارا کے چھٹے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ حنفی کو بعض احکام میں مذہب شافعی پر عمل کرنے کی اجازت صرف تین صورتوں میں ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شخص دلائل کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ میں مذہب شافعی کو ترجیح دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حنفی مسئلہ پر عمل دشوار ہو اور اس مسئلہ میں شافعی مذہب پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہے جیسے ہمارے ملک میں پانی کے مسائل، مفقود الخبر کے احکام، اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ حنفی شخص صاحبِ تقویٰ ہو اور وہ شافعی

مذہب کے اس مسئلہ میں زیادہ احتیاط پاتا ہوتو عمل کرسکتا ہے جیسے مقدار سے کچھ زیادہ صدقہ دینا (دو آثار یعنی ایک صاع) اور مور کا گوشت نہ کھانا۔ لیکن ان تین صورتوں میں ایک قید یہ بھی رہیگی کہ تلفیق کی صورت نہ پیدا ہو جائے اور دونوں مذہب کی پیروی میں ایسی صورت اور شکل نہ نکلے جو دونوں مذہب کے لحاظ سے صحیح نہ ہو مثلاً امام شافعی کے نزدیک خون نکالنا ناقض وضو نہیں ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک ناقض وضو ہے، اگر کوئی شخص فصد کو ناقض وضو سمجھتا ہو اور پھر اسی وضو سے امام کے پیچھے بغیر قرأت فاتحہ کے نماز ادا کرے تو ان دونوں مذہب میں سے کسی مذہب میں روا نہیں کیونکہ حنفی مذہب کی بنا پر وضو باطل ہے اور شافعی مذہب کی بنا پر نماز باطل ہے۔

اگر تین صورتوں کے سوا حنفی کی اقتدا ترک کی، اور شافعی کی اقتدا کی، یا اس کے برعکس تو یہ چیز مکروہ اور حرام کے قریب ہے کیونکہ یہ دین کے اندر کھیل تماشہ ہے۔

متاخرین کی دوسری جماعت جس طریقہ پر گامزن ہے جس کا ذکر ابھی اوپر گذرا ہے وہ کسی خاص مذہب کے تعین کے واجب نہ ہونے پر مبنی ہے۔

اب جاننا چاہئے کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونا چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ چنانچہ مولانا باقر آگاہ مدراسی کا کلام جو انہوں نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے ۔اس کا خلاصہ یہ ہے :

یہ انتقال مذہب چند شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے پہلے مذہب پر طعن اور عیب کی رُو سے نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ مسلک کی تبدیلی، کھیل اور عبث پر محمول نہ ہو، اور یہ دونوں شرط اجماعی ہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ہر مذہب کی رخصتوں کو تلاش کر کے ان کو اپنا مذہب نہ بنالے اور اس بات کا اکثر علماء نے ذکر کیا ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ مذکورہ رخصتوں کی تلاش کر کے ان کو ایک مذہب کی شکل دینا گناہ اور فسق کا

موجب ہے۔

سلطان العلماء عزالدین بن عبد السلام نے فرمایا کہ عامل کو جائز ہے کہ اپنے مذہب کی رخصتوں پر عمل کرے اوراس کا انکارنادانی ہے۔

محقق کمال الدین ابن الہمام نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کیا چیز اسکو عقل ونقل سے منع کرتی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ تلاش مذکور، مجتہد متبوع کے قول سے وابستہ ہے اور جناب سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے تخفیف کو پسند فرماتے تھے۔ صحابۂ کرام کے زمانے سے لے کر ہرزمانہ میں لوگ سوال کرتے رہے ہیں بغیر کسی پابندی کے جو چاہتے تھے سوال کرتے تھے۔

اور چوتھی شرط یہ ہے کہ دوسرے مذہب کا مسئلہ اختیار کرنے میں دوقول کے درمیان تلفیق نہ کرے، جس سے تیسرا مذہب پیدا ہو کہ دونوں مذہب والے اس کے قائل نہ ہوں۔ اگر چہ کہ تلفیق کی توجیہہ اوراس کے جواز اور عدمِ جواز میں بہت قیل وقال ہے لیکن محققین نے جو تحریر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ناجائز تلفیق وہ ہے جو ایک قضیہ میں واقع ہو جیسے ایک شخص امام ابوحنیفہ کی تقلید میں وضو کرنے کے بعد عورت کو چھوا، اور امام شافعی کی تقلید میں فصد کیا، پھر اسی وضو سے نماز ادا کی تو ایسی صورت میں دونوں اماموں کی متفقہ رائے سے اسکی نماز باطل ہوگی، برخلاف اس کے کہ تلفیق دو قضیوں میں ہو جیسے امام شافعی کی تقلید پر جہتِ کعبہ کی جانب نماز ادا کی تو اس صورت میں اس کی نماز درست ہوگی، کیونکہ دونوں امام (امام شافعی، امام ابوحنیفہ) اس کی طہارت کے بطلان پر متفق نہیں۔

اور بعض علماء نے اس قسم کی تلفیق کو بھی منع کیا ہے لیکن جمہور محققین کے نزدیک مذکورہ ممانعت کی کوئی وقعت نہیں۔

اور زبدۃ المتاخرین مفتی حنفیہ بلد امین شیخ عبد العظیم مکی حنفی نے اپنے رسالہ ''القول

السدید'' میں تلفیق اول کو بھی جائز رکھا۔ اور اس کے جواز پر دلیلیں روایتاً اور درایتہً تفصیلاً بیان کئے ہیں۔ یہاں اس مختصر کتاب میں اس کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا جنہیں تفصیل دیکھنی ہو وہ رسالہ ''القول السدید'' کا مطالعہ کریں۔

نیز جاننا چاہئے کہ شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''شرح سفر السعادت'' میں فرماتے ہیں، صحاح میں جو احادیث آئی ہوئی ہیں، ان پر بسر و چشم عمل کرنا دنیا اور آخرت کی سعادت کا باعث ہے لیکن اس پچھلے زمانہ میں یہ صورت ممکن نہیں۔ کیونکہ دین کے مجتہدین نے احادیث اور آثار کو تلاش کیا، اور ناسخ کو منسوخ سے اور صحیح کو غیر صحیح سے جدا کیا، اور ان کی تحقیق و تاویل کی، اور ان کے درمیان مطابقت اور تطبیق دی۔ اور مسلمان عوام کے لئے ایک مذہب قرار دیا۔ اس زمانہ میں عوام تو درکنار علماء کو بھی یہ قوت و طاقت کہاں ہے کہ مجتہدین کا یہ کام ان سے ہو سکے۔ لہٰذا علماء کو بھی مجتہدین کی متابعت اور ان کے پیچھے چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور نہ کوئی راستہ ہے، اب ان کے اوپر یہ ذمہ داری ہے کہ متقدمین کے کام کو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے سہل اور آسان طریقہ پر پیش کریں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ بغیر قیاس اور اجتہاد کے کام آگے نہیں بڑھ سکتا اور بالآخر اجتہاد اور قیاس کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قیاس کے حجت ہونے اور اس پر عمل واجب ہونے کی دلیلیں، کتاب کے خاتمہ کی شرح میں معلوم ہونگی۔ انشاء اللہ۔

اور مجتہد کا حکم حقیقت میں کتاب وسنت کا حکم ہے اور وہ اس طرح سے کہ یہ حکم کتاب وسنت میں پوشیدہ ہے اور صراحتہً مذکور نہیں۔ اس حکم کے دریافت کرنے کے راستہ میں مقصد تک پہنچنے میں کبھی خطا ہوتی ہے۔ اور کبھی صحت و درستگی ہوتی ہے، اسی وجہ سے آیا ہے کہ **المجتهد یخطی ویصیب**، ہر صورت میں چاہے وہ مخطی ہو یا مصیب، اس کا اجتہاد اس کے لئے باعث اجر و ثواب ہے کیونکہ اس نے حق کے طلب کرنے میں محنت

وکوشش صرف کی، خواہ وہ حق کو پائے یا نہ پائے۔

نیز شیخ الہند عبدالحق محدث دہلوی ''شرح سفر السعادۃ'' میں لکھتے ہیں، اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اکابر سلف اور ائمۂ مجتہدین نے جس چیز کی تنقید یا تصحیح کی ہے، اس پر اعتماد کرنا چاہئے اور جب یہ (مجتہدین) کسی حدیث کو قبول کرلیں اور اس پر عمل کرلیں تو (مشہور علماء محدثین کی تقلید میں) ان پر اعتراض کرنا اور انکار کرنا جائز نہیں اور اس جماعت (علماء محدثین) کے بیان سے ان پر الزام لگانا تحکم اور مکابرہ ہے۔

# آٹھواں مقدمہ

قرآن مجید کے معانی کی وضاحت تفسیر سے یا تاویل سے ہوگی سند العلماء سورۃ القیامۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کلام اللہ کی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ اس میں تین چیزوں کا لحاظ رکھا جائے، پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن کریم کے کلمات میں سے ہر کلمہ کو معنیٰ حقیقی پر، یا اپنے مجاز متعارف پر محمول کریں، اور دوسری چیز یہ ہے کہ اس کلمہ کے سیاق وسباق کا لحاظ رکھیں اور شروع سے آخر تک نظم کلام کا خیال رکھیں کہ کہیں بے ترتیبی اور خلل پیدا نہ ہو۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام جو نزولِ وحی کے شاہد ہیں، ان کا سمجھنا اس کے خلاف نہ ہو، اور جب ان تینوں امور میں سے کوئی ایک فوت ہوجائے اور دوسرے دو باقی رہیں تو اس کو تاویل کہتے ہیں۔

اور اگر پہلی چیز فوت ہوجائے اور دوسری اور تیسری باقی رہے تو تاویل قریب کہتے ہیں۔ اور اگر دوسری چیز فوت ہوجائے اور پہلی وتیسری باقی رہے تو اس کو تاویل بعید کہتے ہیں اور جب ان تینوں امور کا مجموعہ ہی فوت ہوجائے تو اس کو تحریف اور مسخ کہتے ہیں۔ **معاذ اللہ من ذلک۔**

صاحب العوارف کہتے ہیں، یہ کہنا جائز ہے کہ اہل تفسیر کا کلام روح کے باب میں کلام اللہ، اور آیات منزلہ کی تاویل ہے۔ اس لئے کہ اس کی تفسیر حرام، لیکن تاویل جائز ہے۔ اس لئے کہ تفسیر کے معاملہ میں صرف منقول کی گنجائش ہے لیکن تاویل کے معاملہ میں معقول کے لئے بڑی وسعت اور گنجائش ہے اور تاویل نام ہے بغیر کسی جزم ویقین کے ساتھ آیت کے امکانی اور احتمالی معانی بیان کرنے کا۔ اور جب بات ایسی ہے تو روح کے معاملہ میں بحث اور کلام کے لئے کئی وجوہ اور اطلاقات ہیں۔

شیخ الہند ''رسالہ آیت النور'' میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے معانی کے بیان میں بحث کی دو صورتیں ہیں: ایک تفسیر، دوسری تاویل۔

تفسیر یہ ہے کہ یقین کریں کہ اس کے یہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مراد بھی یہی ہے۔ اور یہ بجز شارع علیہ السلام سے بروایت صحیح سننے اور نقل کرنے کے، جائز نہیں ہے۔ اور تاویل کا مفہوم یہ ہے کہ آیت کے امکانی اور احتمالی معانی کو بیان کریں اور بلا جزم ویقین کہیں کہ اس کی مراد یہی ہوسکتی ہے۔ اور اس طرح کہنا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ ایک قانونِ شریعت کی موافقت اور دوسری قوانین عربیہ کی مطابقت، اسی قاعدہ کی بنیاد پر آیت النور کی جو تفسیرات اور تاویلات کی گئی ہیں، وہ اسی قسم کی ہیں۔

نیز اسی ''رسالہ آیت النور'' میں رقمطراز ہیں کہ اس مقام میں لغزش کا محل اور زیغ وزلل کا مقام یہ ہے کہ ان آیات میں جو اشارات اور کنایات واقع ہوے ہیں، ان کے ظاہر وصورت کو ثابت نہ کریں اور صرف ان کے معانی ومضمرات کے وجود پر اکتفا کرلیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوئی نعلین نہیں تھے، کہ ان کے نکالنے کا حکم دیا جاتا بلکہ **فاخلع نعليك** کے خطاب سے مقصود اور مطلوب یہ ہے کہ اپنے ارادے اور ہمت کی نظر سے دونوں جہاں کو ساقط کردینا ہے اور اس کے حضور میں حاضری ہے بلکہ اس

مقام میں کوئی موسیٰ وعصا اور فرعون بھی نہیں ہے۔موسیٰ کنایہ ہے دل سے،عصا کنایہ ہے برہان حقیقت سے،اور فرعون کنایہ ہے نفس سے۔

یہ طرز فکر اور روش،فرقۂ باطنیہ اور ملاحدہ کی ہے،جو قرآن کریم کے ظواہر کو باطل قرار دیتے ہیں اور ایک ہی آنکھ سے اس عالم کو دیکھتے ہیں اور دوسرے عالم کو دیکھنے سے آنکھ بند کر لیتے ہیں۔

اس کے برخلاف فرقہ حشویہ کے افراد،قرآن کریم کے اسرار کو باطل قرار دیتے ہیں اورحق کا انکار کرتے ہیں۔غرض یہ دونوں گروہ مقام جامعیت کے درجۂ کمال سے ہٹے ہوئے ہیں۔اور طریق حق یہ ہے کہ دونوں جانب نظر رہے اور دونوں خانے آباد و معمور رہیں اور صورت و معنی یعنی ظاہر و باطن دونوں ثابت رہیں اور حکمت و شریعت ایک دوسرے کے ساتھ مطابق رہیں۔جیسا کہ کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نعلین نکالنے کا حکم ہوا اور انہیں وادئ مقدس میں جو زمین کا ایک مخصوص حصہ ہے،حاضری کا حکم ہوا تو حضرت موسیٰ نے اس حکم کی پیروی کی اور اس کے ساتھ ساتھ اسقاطِ کونین کا اشارہ بھی سمجھا،اس روش کو اعتبار کہتے ہیں،کیونکہ عبرت سے مراد،ظاہر سے باطن کی طرف اور صورت سے معنی کی طرف عبور کرنا ہے اور **فاعتبروا یا اولی الابصار** کا حکم بھی اس بات کو ثابت کر رہا ہے۔

اور شیخ عبدالوہاب ذکر اللہ بالخیر فرماتے ہیں۔ظاہر پر باطن کو مقدم نہ کیا جائے اور نہ باطن کو چھوڑ کر صرف ظاہر پر اکتفا کیا جائے نیز علم باطن اور اس کی رعایت کو ظاہر پر مقدم نہ رکھا جائے،کہیں رفتہ رفتہ اس سے الحاد کے بھنور میں نہ پڑ جائیں اور مذہب باطنیہ اختیار نہ کرلیں۔ نیز باطن کو چھوڑ کر ظاہر پر اکتفا،اور قناعت نہ کریں تا کہ مرتبۂ کمال کو پہنچنے اور اس کی طلب سے محروم نہ رہ جائیں۔

نیز اسی میں لکھتے ہیں،ایک شخص نے جو اسقاطِ عمل کا قائل تھا حضرت جنید بغدادی کے حضور میں کوئی بات کہی تو آپ نے فرمایا۔ہمارے نزدیک زنا کرنا،اور چوری کرنا ایسی

باتوں سے زیادہ آسان ہے، بزرگوں نے فرمایا ہے کامل وہ شخص ہے کہ اس کی معرفت کا نور اس کے تقویٰ اور ورع کے نور کو نہ چھپالے، اور نہ عمل ساقط ہو، ان باطنیوں سے جو حقائق و معانی میں مستغرق اور فنا ہوں اور جن پر ان کے حال اور حقیقت کا غلبہ ہو، اور محبت کے نشہ میں سرشار ہوں جیسا کہ مجذوبوں اور مستانوں کا حال ہے جو اپنے آپ میں نہیں ہوتے ہیں۔ اور غلبۂ حال کی وجہ سے انکے اختیار کی لگام، ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ یہ حضرات بھی صحیح حال کے باوجود ناقص اور عقلاء کے مقام و مرتبہ سے کم ہیں۔ جیسا کہ ہمارے شیخ اور سردار غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہٗ نے ارشاد فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ کے بندے جن میں مجنوں بھی ہیں اور عقلاء بھی ہیں اور عقلاء مجنونوں اور مجذوبوں سے افضل ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ملحدین کا مقصد حق کو جھٹلانا، اور عمل کو ساقط کرنا اور دین کا انکار کرنا ہے۔ پھر اس دور میں درویشوں کے روپ میں کچھ لوگ ظاہر ہوے ہیں جن کا ظاہر درست ہے اور نہ باطن اور حقیقت ہے نہ مجاز، اور بھولے بھالے سادہ لوح اشخاص جو دین میں بصیرت اور کمال نہیں رکھتے وہ ان کے گردیدہ ہو جاتے ہیں اور فریب کھا جاتے ہیں۔ دین میں اس سے بڑی مصیبت اور آفت کوئی نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا دہلوی ''الطاف القدس'' میں لکھتے ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فن اعتبار کو تدبر قرآن کے قریب رکھا ہے، جس کی بناء پر ایک دریا رواں ہوا۔ یہ علم اعتبار اس کتاب کا وظیفہ اور موضوع نہیں ہے۔ الغرض اعتبار ایک عمدہ اور عجیب فن ہے جس کے حدود وسیع ہیں۔ تفسیر عرائس، حقائق سلمی، شیخ اکبر اور شیخ الشیوخ سہروردی کا بہت سارا کلام اسی نوعیت کا ہے۔

جواہر القرآن کے اصل خامس میں امام حجۃ الاسلام نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ

یہ ہے کہ وہ بندے جو سب کچھ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو گئے ہیں۔ وہ دو طرح محجوب ہیں۔ ان میں سے پہلا حجاب وہ وسواس جو نیت میں تفکر کی جانب دل کو مائل کرتا ہے۔ دوسرا حجاب قرآن کے ظاہری معنی کی تقلید اور اسی پر جم جانا اور قائم رہنا اور یہ فہم کی راہ میں بہت بڑا حجاب ہے۔ میری مراد اس سے تقلید باطل نہیں جیسے بدعتی کی تقلید ہے بلکہ حق کی تقلید ہے، اس لئے کہ جس حق کے اعتقاد کی بندوں کو تکلیف دی گئی ہے، اس کے کئے درجے ہیں۔ اس کا ایک ظاہری مبداء ہے۔ اور وہ مثال میں جھلکہ کے مانند ہے اور اسکی ایک گہرائی باطن ہے اور وہ مغز کے مانند ہے۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا، بے شک قرآن کا ایک ظاہر ہے اور اس کا ایک باطن ہے اور ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے جو ظاہر پر جم جاتا ہے۔ وہ یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اس مقام سے بلند تر کوئی مقام نہیں، جہاں وہ پہنچ سکے، پھر وہ کیسے یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس کے لئے اسرار منکشف ہوں گے۔

نیز جواہر القرآن کی دسویں اصل میں لکھتے ہیں پس اگر تو قرآن کے معانی کو اس طرح سے نہیں سمجھا تو تیرے نصیب میں بجز قرآن کے پوست کے کچھ نہیں جیسا کہ بہائم کو گیہوں سے بجز اس کے جھلکے کے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ قرآن تمام مخلوقات کی، اُن اُن کے اصناف واجناس کے اختلاف کے مطابق غذا ہے، لیکن اُن اُن کی غذا میں مغز، بھونسی اور چھلکے ہیں اور گدھا مغز سے بنی ہوئی روٹی کے مقابلے میں سوکھی گھاس کا زیادہ حریص ہے۔ اور تو بہیمیت کے درجہ سے جدا نہ ہونے کا زیادہ حریص ہے اور تو انسانیت کے درجہ تک ترقی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ملکیت کے درجہ اور قرآن کریم کے باغوں سے استفادہ کر سکے، جس میں تمہارے لئے اور تمہارے چوپایوں کے لئے بھی فائدہ ہے۔

صاحب ''امحاض النصیحہ'' فقیہہ علی مہایمی، شیخ ابن عربی پر طعن و تشنیع کرنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں، اس کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں گدھے کی طرح رینک رہا

ہے۔اوراس عورت کی طرح چیخ و پکار کررہا ہے جس کا بچہ مرچکا ہو۔وہ یہ کہتا ہے کہ شیخ قرآن کریم میں تحریف کررہے ہیں حالاں کہ قرآن کے ظاہری معنی کو برقرار رکھتے ہوئے بطریق اشارہ، ان اسرار وحقائق کا استخراج کرتے ہیں جن کے سمندر کبھی پایاب اور خشک نہیں ہوتے۔اورانہوں نے کبھی ان اسرار کے انکشاف سے ظاہر تفسیر کی نفی نہیں ی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول مافرطنا فی الکتاب من شیٔ اور قل لوکان البحر مداد لکلمات ربی لنفد البحر اس کا انکار کرتا ہے،حالانکہ بہت سارے اُمور ایسے ہیں جن کا بظاہر قرآن کریم میں ذکر نہیں۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے قرآن کا ایک ظاہر، باطن، حداور مطلع ہے۔اسی طرح احادیث نبویؐ کا بھی ایک ظاہراور ایک باطن ہے۔

شیخ ابراہیم کروی ''شرح تحفۃ المرسلہ'' میں فرماتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم کا عطا کیا جانا اور یہ کہ وہ اپنی خواہش سے کسی بات کا نہ کہنا مگر یہ کہ وہ وحی ہو جو، ان کی طرف وحی کی گئی اور یہ بھی کہ آپ علم اولین وآخرین جانتے تھے۔یہ یقینی طور پر معلوم ہے۔پس رسولِ کریمؐ کا کلام اپنے مفہوم اول کے مطابق، جو اہل لسان اور علمائے ظاہر پر واضح ہے۔افادہ کرنے کے علاوہ ایسے، حکم واسرار پر مشتمل ہے جن کو محققین جانتے ہیں۔اور حدیث کے لئے بھی قرآن کے مثل ظاہراور باطن ہے جیسا کہ حجۃ الاسلام نے اس سے آگاہ کیا ہے۔

علامہ میبذی فواتح کے فاتح سادسہ میں فرماتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ اولیاء اور خواص قرآن وحدیث کی تاویل کے مکلّف ہیں اور عوام ان دونوں کی تفسیر کے مکلّف ہیں۔ اور حق بات یہ ہے کہ ہم تمام قرآن وحدیث کے ظاہر پر مکلف ہیں اور خواص، تاویل کے بھی مکلّف ہیں۔اور تاویل میں بہت طبقات ہیں اور خواص کا ہر فرد ایسی تاویل کا مکلّف ہے، جو

اس کے مرتبہ اور صفائے قلب کے مطابق ہے۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ تفسیر ایک چیز ہے اور تاویل دوسری چیز ہے اور تاویل سے تفسیر کی نفی لازم نہیں آتی۔ بلکہ تاویل کرنے والا تفسیر کے اثبات اور اقرار کے ساتھ قرآن وحدیث کے اسرار بطریق اشارہ استخراج واستنباط کرتا ہے۔ کم فہم اشخاص تفسیر اور تاویل میں فرق نہیں کرتے اور ظاہر تفسیر ہی میں قرآن وحدیث کے معنی کو منحصر جانتے ہیں اور صاحبِ تاویل کو ظاہر تفسیر کا انکار کرنے والا اور قرآن وحدیث کے معانی کی تحریف کرنے والا تصور کرتے ہیں یہ لوگ مانند اس کیڑے کے جو پتھر میں پوشیدہ ہے، جس کی زمین وآسمان وہی پتھر ہے۔

# نواں مقدمہ

بدعت کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدعت ھدیٰ جس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں۔ دوسری بدعتِ ضلالت جس کو بدعت سیئہ کہتے ہیں۔

''النھایہ'' میں علامہ جزری کہتے ہیں۔ بدعت دو قسم کی ہے۔ ایک بدعت ھدیٰ، دوسری بدعت ضلالت، پس اللہ اور رسولؐ نے جو حکم دیا ہے اس کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ مقام مذمت میں ہے اور جس چیز کی طرف اللہ اور رسولؐ نے دعوت دی اور اسکی رغبت دلائی ہے، اس عموم میں جو بھی داخل ہے وہ مدح کے مقام میں ہے اور کل بدعة ضلالة (ہر بدعت گمراہی ہے) کی حدیث عام ہے جس سے بعض مستثنیٰ ہیں اور عمومات میں استثناء دلیل شرعیہ یا عقلیہ کے ذریعہ سے ہے جو شرع شریف میں مشہور ہے اور کتب اصول میں مفصلاً مذکور ہیں۔ لہٰذا حدیث مذکور کا معنی یہ ہوگا کہ ہر وہ بدعت جو سیئہ ہے وہ ضلالت ہے، اور اس میں استثناء کرنے والی حدیثیں یہ ہیں۔

(۱) **من سن فی الاسلام سنة حسنة** جو شخص اسلام میں کوئی اچھا اور مفید طریقہ جاری کرے گا اس کو اس ثواب ملیگا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل کرینگے بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کوئی کمی ہو۔

(۲) **من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهورد۔** جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو دین سے نہیں ہے، وہ مردود ہے۔

(۳) **من ابتدع بدعة الخ** جس کسی نے بھی بدعت ضلالت جاری کی اس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناخوش ہوں گے۔

پہلی حدیث میں امرِ مستحدث (نئی پیدا کردہ چیز) کو احسن قرار دیا گیا ہے اور دوسری حدیث میں بدعت کا مردود ہونا ''مالیس منہ'' کی قید سے مقید ہے، اور تیسری حدیث میں بدعت کی اضافت، ضلالت کی طرف کی گئی ہے، لہٰذا وہی بدعت مردود ہوگی جو ضلالت و گمراہی کا باعث ہو، نہ کہ نفس بدعت (نہ ہر کوئی نیا عمل)۔

اور شرح مصابیح میں حضور اکرمؐ کی جو حدیث (کل بدعة ضلاله) ہے وہ عام و مخصص اور مستثنٰی ہے اور امام نووی کی ''شرح مسلم'' میں ہے، حضور اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی ''کل بدعة ضلاله'' عام مخصوص ہے اور اس سے مراد اکثر بدعات ہیں۔

بدعت کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک واجبہ جیسے تفاسیر اور شروح احادیث کی تصنیف، حدیث کے متون اور اسانید میں بحث، غرائب کتاب وسنت کا حفظ کرنا یعنی مشکل الفاظ کا حفظ کرنا، علم کلام، تصوف، فقہ کے اصول وفروع کی تدوین، نحو، صرف، لغت، اشتقاق معانی، بیان، بدیع، عروض اور قوانی کے قواعد بیان کرنا اور وہ تمام چیزیں جو دین میں اصلاح معاش و معاد کے لئے ضروری ہوتی ہیں جیسے بقدر ضرورت فنون طب، حساب، نجوم، علم ہیئت، علم اسطرلاب اور منطق تا کہ اس کے ذریعہ دلائل کی ترتیب قائم کرسکیں اور علوم رسم الخط اور

اعراب ونقاط قرآن کریم اوران علوم شرعیہ کا سیکھنا اور سکھانا اور بدعتی فرقوں کا رد کرنا۔

بدعت کی دوسری قسم مستحب ہے جیسے مدارس، سرائے اور مسافر خانے وقف کرنا، اور سرورانام علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے یوم ولادت پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا اور نکوکاری کی وہ تمام قسمیں جو قرن اول میں نہیں تھیں، اور بعض کے قول کے مطابق علم تصوف

بدعت کی تیسری قسم مباح ہے جیسے نماز فجر وعصر کے بعد مصافحہ کرنا۔ لذیذ ماکولات ومشروبات اور ملابس فاخرہ بشرطیکہ حلال ہوں اور فخر وغرور کا باعث نہ ہوں اور مقدار سنت سے زیادہ چوڑی آستینوں کا لباس پہننا اور آٹے میں چھلنی کا استعمال کرنا۔

بدعت کی چوتھی قسم مکروہ ہے جیسے مسجد کا نقش ونگار سے آراستہ کرنا اور بعض کے قول کے مطابق سونے چاندی سے مصاحف کو مزیّن کرنا۔

بدعت کی پانچویں قسم حرام ہے اور وہ یہ مذاہب ہیں، روافض، خوارج، قدریہ مرجیہ، مجسمہ وغیرہ جیسا کہ شیخ دہلوی کی ''شرح مشکوٰۃ'' مہمائی کی ''امحاض النصیحہ'' اور مولانا اسلمی مدراسی کی ''سفینۃ النجاۃ'' میں بیان کیا گیا ہے۔

اور بدعت کسی ایک زمانہ اور دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ قیامت تک غیر محدود ہے۔ ادنیٰ بدعت سیۂ مکروہ ہے اور اعلیٰ بدعت سیۂ کفر ہے جیسا کہ ''مائۃ المسائل'' میں مذکور ہے۔

بعض کے نزدیک بدعت حسنہ وسیۂ میں منقسم نہیں ہے۔ بلکہ بدعت ضلالت میں منحصر ہے اور جو بھی موئد سنت ہے، وہ سنت میں داخل ہے اور اس کو سنت غیر حقیقیہ اور ملحق بالسنۃ کہتے ہیں۔ اس طائفہ کے نزدیک جمع قرآن، سورتوں کی ترتیب، ہیئت مخصوصہ کے ساتھ نماز تراویح، نماز جمعہ کے لئے پہلی اذاں، قرآن مجید کو اعراب لگانا، دلائل نقلیہ کے ذریعہ اہل بدعت سے مناظرہ کرنا، حدیث کی کتابوں کی تصنیف وتدوین، قواعدِ نحو کا بیان کرنا، راویانِ حدیث پر تنقید اور بقدرِ ضرورت احکام فقہ کے استنباط میں مشغولیت، یہ ساری

چیزیں ملحق بالسنۃ کی قسم سے ہیں۔

اور میلاد سرورانام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر خوشی ومسرت کا ظاہر کرنا جو مجتہدین کے اجتہاد سے ثابت ہے، قیاس میں داخل ہے۔

صاحب ھلالین تفسیر جلالین میں ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں۔ جو بدعت کو حسنہ اور سیئہ کے ذریعہ تقسیم نہیں کرتے بلکہ اس کو بدعتِ ضلالت میں منحصر جانتے ہیں۔انہوں نے بدعت کی تعریف یوں کی ہے۔

بدعت وہ علم یا عمل یا حال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ حق کے خلاف کسی شبہ یا استحسان کی وجہ سے ایجاد کیا گیا ہو، اور اس کو دین قویم اور صراط مستقیم سمجھا گیا۔پس اس کے نزدیک قرآن کا اعراب لگانا سنت میں داخل ہے۔

اشرف العلماء نے اپنے بعض رسالوں میں لکھا ہے، ہر وہ کام جو امورِ معاش یا معاد کے لئے مفید ہے، وہ سنت کے تحت داخل ہے جیسے مصحف میں قرآن شریف لکھنا اور حرکات وسکنات اور نقطوں کا لگانا، اس میں دین کا فائدہ ہے، قرآن ضائع ہونے اور اس کے پڑھنے میں خطا سے بچانا ہے۔

اس مقام پر جاننا چاہئے کہ سالانہ فاتحہ کے جواز میں اختلاف ہے۔اسکی تفصیل آٹھویں فائدہ میں آئیگی۔اور میلا د رسولؐ پر خوشی ومسرت کے اظہار میں بھی اختلاف ہے، اسکی تفصیل بارہویں فائدہ میں آئیگی۔کسی مختلف فیہ مسئلہ میں ایک ہی جانب کے حق ہونے کا جزم یقین کر لینا اور دوسری جانب کا انکار کرنا غلو سے خالی نہیں۔ (جزی)

☆☆☆☆☆☆☆☆

# دسواں مقدمہ

اسرار وحقائق کے دقیق معانی عوام سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے تا کہ یہ چیزیں انہیں تشکیک وانکار اور علماء وصوفیہ کی تکفیر وتضلیل تک نہ پہنچا دیں۔ چنانچہ کلموا الناس الخ اور دعوا ما ینکرون کی حدیثیں اسی حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہیں۔

سند العلماء مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی سورۃ التسآل کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

اس سورۃ میں مقصود بیان یہ ہے کہ حقائق امور اُخرویہ، مباحث ذات وصفات، مسئلہ قضا وقدر، جبر واختیار، توحید وجودی، توحید شہودی، مشاجرات صحابہ اور احکام شرعیہ کی حکمتیں جو لوگوں کی عقل وفہم سے بالا تر اور ان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہے۔ ان مسائل کے بارے میں زیادہ سوالات کرنا نہایت قبیح اور مذموم ہے۔ اس لئے کہ لوگ (ان حقائق کے دقیق معانی نہ سمجھنے کی بنا پر) انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ورنہ کم از کم (یہ مسائل ومباحث) اکثر کے ذہن مین تشکیک کا باعث ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایمان ان چیزوں سے متعلق زیادہ تحقیق وتفتیش کرنے اور ان امور ومسائل کی کمیات وکیفیات کی تفصیلات جاننے پر موقوف نہیں ہے، اور یہی وہ خطرناک مرض ہے جو اس امت میں گمراہ فرقہ بندی اور عقائد میں بگاڑ کا باعث بن کر ایک عالم کے ایمان کو ہوا میں اڑا دیا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے مذکورہ سورہ میں اس صورت حال (مذکور الصدر مسائل وامور میں تحقیق وتفتیش اور کثرت سوال ومباحثہ) کی قباحت بیان کی ہے تا کہ لوگ اس قسم کے مسائل میں الجھنے سے احتراز کریں اور گمراہی وضلالت کے بھنور میں نہ پھنس جائیں۔

صاحب ''اجلة التائید فی شرح اولة التوحید'' فرماتے ہیں

اہل باطن کا یہ فرمان کہ اسرار ربوبیت کا افشاء اور اظہار کفر ہے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا گیا کہ ان معانی وحقائق اور دقائق تک عوام کے فہم کی رسائی نہیں ہو سکے

گی۔اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی کہ جس کسی نے لوگوں کے روبرو ایسی نئ اور نامانوس بات کہہ دی جسے ان کا فہم اخذ نہ کرسکا تو یہ صورت حال بعض لوگوں کے لئے فتنہ ہوگی اور یہی چیز اولیائے کرام کے انکار اور بالخصوص ان کی تکفیر کا باعث ہوگی۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بے شک بعضے علوم پوشیدہ صورت ہیں۔جن سے عارف باللہ نفوس ہی واقف ہوتے ہیں، اور جب وہ ان علوم و معارف اور حقائق کو اپنی زبانوں پر لاتے ہیں تو وہی لوگ ان علوم کا انکار کرتے ہیں جو اللہ کے تعلق سے مبتلائے فریب ہیں۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علمائے سلف اہل استعداد ہی کو ان حقائق و معارف کی طرف رہنمائی کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے۔جس نے یہ دولتِ علم کسی نااہل کو عطا کی تو گویا اس نے یہ نعمت ضائع کردی، اور جس نے کسی صاحب استعداد سے اس نعمت کو چھپایا تو ظلم کیا، اور اس علم کے باب میں عوام کے نقصان اٹھانے کا سبب یہ ہے کہ جب وہ کسی حیثیت اور جہت سے سمجھ نہیں پارہے ہیں تو وہ ان حقائق کو یا تو قبول کریں گے یا قبول نہیں کریں گے۔اگر قبول نہ کریں تو اس علم کے عارفین کا انکار کریں گے، اور بعض اوقات ان کے قتل اور ان کی تکفیر و اہانت پر جری و بیباک ہوجائیں گے۔ بیشتر عوام اسی نوع کے ہیں۔اگر قبول کریں تو اس علم کی پہنائیوں کو سمجھ نہ سکیں گے اور کبھی اپنے لئے ربوبیت کا دعویٰ کریں گے اور کبھی اپنی ربوبیت کے زعم میں اباحیت اعمال کے مرتکب ہونگے۔اس دعوے کے ساتھ کہ ان کے لئے ربوبیت حاصل ہے۔ نیز اس ادعاء کے ساتھ کہ یہ امور ان کے اندر عموماً ظلمت و تاریکی کا باعث نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ تمام دعوے اور مزعومات بے سروپا اور گمراہی و باطل ہیں۔ بھلا انہیں الوہیت کیونکہ حاصل ہوسکتی ہے جبکہ وہ اپنی ذات سے موجود نہیں بلکہ ان کا وجود غیر کا رہینِ منت ہے۔اسی طرح وہ نفس وجود ہی نہیں ہیں۔غرض وہ نہ تو اپنی شخصیتوں اور نفوس کے خالق ہوسکتے ہیں نہ زمین و آسمان کی تخلیق کے مالک بن سکتے ہیں۔پھر بھلا ان کے اندر بظاہر جو جو

اعمال قبیح اور شنیع ہیں کیونکر اثر انداز نہیں ہو سکتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ان اعمال شنیعہ کو اپنے نفس کی ظلمت و کثافت کے سبب اختیار کرلیا ہے اگر چہ کہ انہیں اس کا احساس و شعور نہیں ہے۔اسی لئے محققین نے فرمایا:

ہر وہ حقیقت جس کو شریعت نے رد کر دیا ہو وہ باطل ہے اور ہر وہ شریعت جو اپنے عامل کو اپنے اسرار حقیقت کی طرف مائل نہ کرے وہ معطل اور بیہودہ ہے۔

امامِ ربانی مکتوبات کی جلد ثالث مکتوب (صفحہ ۹۵) میں اسرارِ الٰہیہ کے اخفاء سے متعلق فرماتے ہیں، اگر اس نظام کا تھوڑا حصہ جو اس بارگاہ سے مربوط ہے ظاہر کیا جائے یا ایک اشارہ بھی جو ان معاملات سے، جو اس کارخانہ سے وابستہ ہے ظاہر کیا جائے تو شہ رگ کاٹ دی جائے اور گردن اڑا دی جائے، جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ان بعض علوم و معارف کے اظہار کے سلسلہ میں جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کئے تھے قطع البلعوم کہتے ہیں تو دوسروں کے تعلق سے کیا کہا جا سکتا ہے۔حقائق وغوامض، اللہ کے اسرار ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے نہایت خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے، اور نااہل اشخاص کو اس کے آس و پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔حضرت خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوات والتسلیمات نے جو سارے عالموں کے لئے رحمت ہیں اپنے کمال معرفت اور وفور قدرت کی بناء پر یہ اسرار ابو ہریرہؓ وغیرہ کو عنایت فرمایا، اور فیض حاصل کرنے والوں کی استعداد اور قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے ان پوشیدہ موتیوں کو ان پر نچھاور کیا۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:-

اگر تو واقعی عاشقِ صادق ہے تو ان اسرار و رموز کو برسرِ عام بیان نہ کر۔کیا نہیں دیکھا غلبۂ سکر اور مستیٔ عشق سے سرشار ہو کر حلاج نے ایک راز فاش کیا جس کے سبب سولی پر چڑھایا گیا۔

یہی وہ محل ہے جس کے تعلق سے صاحبِ احیاء امام حجۃ الاسلام ''ابواب مداخلِ شیطان'' میں فرماتے ہیں: عوام کا حق صرف یہ ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں اور اپنی عبادات میں اور اپنی معاش و روزگار میں مشغول رہے، اور علم کو علماء کے لئے چھوڑ دیں۔ پس ایک عامی اگر زنا یا چوری کرے تو اس کے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ علم میں گفتگو کرے۔ پس بے شک جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے بارے میں اتقانِ علم کے بغیر گفتگو کرے تو وہ انجانے طور پر کفر میں مبتلا ہو جائیگا۔ اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور سمندر کی موج پر سوار ہوا اور عقائد و مذاہب کے باب میں شیطانی مکائد کی کوئی حد ہی نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

# گیارھواں مقدمہ

:علم ظاہری بلکہ حجامت اور پارچہ بافی کا پیشہ بھی استاذ کے بغیر ہاتھ نہیں آسکتا تو علم باطنی کسی مرشد روحانی اور شیخ مزّکی کے بغیر کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟

مثنوی کس بعلم ظاہر ار حق بین بدی فخر رازی رازدارِ دیں بدی

اگر کوئی شخص صرف علم ظاہری سے حق بیں اور حق شناس ہوسکتا تو امام فخر الدین رازی ''رازدین'' ہوتے۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''الانتباہ فی سلاسل الاولیاء'' میں شیخ تاج الدین سنبھلی خلیفۂ خواجہ محمد باقی سے حکایت نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابو علی دقاق قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا: جو درخت کہ بذاتِ خود اگتا ہے اس کے لئے عموماً پھل نہیں ہوتا اور اگر پھل ہو بھی تو وہ بے لذت ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی سنت اور عادت اسی اصول و ضابطہ پر چل رہی ہے کہ

خارج میں ظاہری سبب موجود رہے جیسا کہ ظاہری توالد اور تناسل ، والد اور والدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح معنوی توالد بھی ہے جس کا حاصل ہونا مرشد روحانی اور شیخ مربی کے بغیر دشوار اور مشکل ہے اور ''الرسالۃ المکیہ'' میں ارشاد فرمایا: جس شخص کے لئے روحانی مرشد اور شیخ مربی نہ رہے تو شیطان ہی اس کا شیخ و مرشد ہے۔

شیخ برکہ ہمدانی سے صاحب ''نفحات'' روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص تھا جس نے اپنے فرزند سے کہا تو ہمیشہ احمق ہی رہا۔ لڑکے نے کہا احمق کون ہوتا ہے اور احمقیت کیا ہے۔ باپ نے کہا جو صبح سویرے گھر سے باہر نکلے اور کہے کہ آج کے دن میں نے ایک خزانہ پالیا۔

محمد دھدار: حاشیہ ''نفحات'' میں لکھتے ہیں: اس حکایت سے مراد یہ ہے کہ جو بھی شخص طلب و جستجو کی زحمت اٹھائے بغیر اور کسی استاذ طریقت کی خدمت کئے بغیر خواہش و آرزو رکھے کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے درجات اور مراتب میں سے کسی درجہ اور مرتبہ پر فائز ہو جائے تو وہ احمق ہے۔ اولاً اس کو تو چاہئے کہ خود کو اس طلب و جستجو کے حصول کا اہل بنائے اور اپنے کو ورودِ فیض کے لائق بنائے اس کے بعد اس طائفہ کے درجات میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کی امید و آرزو لئے ہوئے فضلِ الٰہی کا منتظر رہے اور یہی اصحابِ ارادت کی پند و نصیحت ہے۔

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد      ہیچ آہن خود بخود تیزی نشد
مولوی ہرگز نہ شد ملاّءِ روم      تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

کوئی بھی شئی خود بخود کسی شیئ کا روپ اختیار نہیں کرتی اور کوئی بھی لوہا خود بخود کاٹنے والی دھار نہیں بنتا۔ مولوی نے جب تک شمس تبریزی کی غلامی اختیار نہ کی وہ مولانائے روم نہ کہلا سکا۔

☆☆☆☆☆☆☆

# بارھواں مقدمہ

صوفیاء سے جو بھی منقول رہے اگر وہ ظاہری شریعت کے خلاف ہوتو اس کے لئے تاویلات اور احتمالات ہیں۔ مولانا باقر آ گاہ مدراسیؒ ''ایقاظ الغافلین'' میں فرماتے ہیں کہ امام یافعی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ صوفیاء سے جو کچھ منقول اور منسوب ہے، اگر وہ بادی النظر میں ظاہری شریعت کے خلاف معلوم ہورہا ہے، تو اس کے لئے تاویلات اور احتمالات کی گنجائش ہے اول یہ کہ ہم ان اقوال کا انتساب صوفیاء کی جانب صحیح نہیں سمجھتے جب تک کہ کسی روایت صحیحہ سے ان کا ثبوت نہ ہو۔ دوم یہ کہ ثبوت ملنے کے بعد ان صوفیاء کی طرف سے ان اقوال کے لئے مناسب اور موافق تاویل تلاش کی جائے گی۔ آخرش کوئی احتمال، اور تاویل نہ پائی گئی تو یہ کہا جائے کہ شائد اہل باطن کے نزدیک ان اقوال کی تاویل ہو، سوم یہ کہ ان کا صدور صوفیاء سے جذب وسکر اور محو کی حالت میں ہوا ہوگا اور جذب وسکر کی بے خبری مباح غیر ماخوذ ہے کیونکہ آدمی اس حالت وکیفیت میں غیر مکلّف ہے۔ پس ان مخارج ومحامل اور احتمالات کے بعد بھی صوفیاء کے ساتھ بدگمانی کرنا عدم توفیق سے ہوگا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے بے نصیبی، سوء قضا اور ہر قسم کی بلاؤں سے پناہ چاہتے ہیں۔

صاحبِ ''تاریخ الخلفاء'' شیخ جلال الدین سیوطیؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ عمر بن حفص کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجھ سے فرمایا، جب تم کسی مسلمان سے کوئی ایسا جملہ اور کلمہ سنو جس کا تم اچھا احتمال نہ پاؤ تو اس کو کسی بری چیز پر محمول نہ کرو۔

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مکتوبات جلد سوم ایک سوسترویں مکتوب میں رقمطراز ہیں:

اگر کسی سے کوئی ایسا لفظ صادر ہوا ہے جس کا ظاہری معنی علوم شرعیہ سے مطابقت نہیں رکھتا ہے تو قدرے غور وفکر کے ذریعہ اس کے ظاہری معنی کو دوسرے معنی کی طرف منتقل

کر دینا چاہئے اور کسی بھی مسلمان کو متہم نہیں کرنا چاہئے، جب شریعت مطہرہ میں فحش اور بے حیائی پھیلانا اور کسی فاسق کو رسوا اور ذلیل کرنا حرام اور نا جائز ہے تو محض اشتباہ اور شک کی وجہ سے کسی مسلمان کو رسوا اور ذلیل کرنا کیونکر جائز ہوگا۔ اور یہ کونسی دینداری ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر اس کی منادی کرتے پھریں۔ خیر خواہی اور دینداری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی ایسا جملہ یا کلمہ صادر ہوا ہے جس کا ظاہری معنیٰ علومِ شرعیہ کے خلاف نظر آئے تو دیکھنا چاہئے کہ اس کا قائل کون ہے۔ اگر کوئی ملحد اور زندیق آدمی ہے تو اس کا رد کرنا چاہئے اور اس کی بات کی اصلاح میں کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اور اگر اس کا کہنے والا کوئی مسلمان ہے اور اللہ ورسول پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی بات کی اصلاح میں کوشش کرنی چاہئے اور اسکے لئے ایک صحیح احتمال اور تاویل تلاش کرنا چاہئے۔

فقیہ علی مہایمی ''امحاض النصیحہ'' میں فرماتے ہیں۔ صوفیاء کے کلام کی تاویلات اور احتمالات بیان کرنا ایک عظیم ترین نیکی ہے جیسا کہ حلاج کے کلام میں امام غزالی اور امام رازی نے کیا۔ امام رازی نے بعض صوفیاء کے قول ''الشکر شرک'' (شکر گذاری شرک ہے) کی تاویل فرمائی اور شیخ شہاب الدین نے مظفر القریشی کے قول ''الفقیر لا یحتاج الی اللہ'' (فقیر اللہ کی طرف سے محتاج نہیں ہوتا) کی تاویل فرمائی تا کہ لوگ ان کے اخلاق سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے اعمال وافعال میں ان کی تقلید کریں۔ بسا اوقات ایسے کام کی برکت سے ان کے احوال کچھ اثر لوگوں میں سرایت کراتا ہے اور تقویٰ یہ ہیکہ جس چیز کا علم نہیں اس کے متعلق فتویٰ دینے سے احتراز کرنا چاہئے. امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء میں بعض بزرگوں سے یہ قول نقل کیا ہے۔ بے شک تم میں سے جو آدمی فتویٰ دینے میں سرعت اور تیزی دکھاتا ہے وہ سرعت سے دوزخ کی طرف پہونچ رہا ہے۔

# تیرھواں مقدمہ

صوفیائے کرام کے علوم و معارف کا انکار کرنے والا اور اولیائے عظام پر طعن و تشنیع کرنے والا اپنے آخری وقت میں سوء خاتمہ کے خوف کے سوا دوسری چیز نہیں رکھتا، اور ان بزرگ ترین حضرات کے ساتھ بغض و عداوت رکھنا، ذلت و خواری اور عذاب و عقاب میں مبتلا ہونے کی علامت اور نفاق و بدبختی کی نشانی ہوگی۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی ''کتاب الیواقیت والجواہر'' میں لکھتے ہیں کہ شیخ مجدالدین فیروز آبادی مصنف القاموس (لغت) نے فرمایا:

فہم و کشف میں صوفیاء کے بلند درجات و مراتب کے پیش نظر کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے ظاہری خیال سے ان پر کوئی عیب لگائے اور ان کا انکار کرے۔ اس طائفہ کے کسی بھی فرد سے کوئی ایسی بات ہم یک نہیں پہنچی کہ بے شک اس نے انہدام دین سے متعلق کسی چیز کا حکم دیا ہو۔ اور نہ ہی کسی نے وضو سے منع کیا اور نہ ہی نماز سے روکا اور نہ ان کے علاوہ اسلام کے فرائض و مستحبات میں سے کسی بھی فرض اور مستحب سے منع کیا۔

اور فرماتے تھے صوفیائے کرام، علوم کے درجات اور مقامات میں کبھی کبھی ایسے مقاماتِ مجہولہ تک پہنچ جاتے ہیں جن کی وضاحت کتاب اللہ سے ہوتی ہے اور نہ سنت رسول سے لیکن اکابر علمائے باعمل اپنے حسن استنباط اور صالحین کے ساتھ حسن ظن کے باعث ان کے اقوال اور ارشادات کو دقیق اور لطیف انداز سے قرآن و حدیث پر پیش کرتے ہیں لیکن ہر کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا کہ جب کوئی کلام سنے جس کو وہ سمجھ نہیں پا رہا ہے تو انتظار اور توقف و احتیاط سے کام لے بلکہ اس کے کہنے والے کے انکار کرنے اور عیب لگانے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے، اور انسان جلد باز اور عجلت پسند پیدا کیا گیا ہے۔

نیز اسی میں رقمطراز ہیں کہ شیخ الاسلام مجدد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اولیاء کرام کو کرامتوں سے سرفراز فرمایا جو کہ معجزات کی فرع ہیں۔ اسی طرح انہیں ایسی عبارتیں عطا کیا ہو جن کے سمجھنے سے ارباب فکر ونظر کی عقل عاجز ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔

شیخ الاسلام مخذومی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ کسی بھی عالم کو صوفیاء کا رد اور انکار کرنا جائز نہیں جب تک کہ وہ خود ان کے طریقہ پر نہ چلا ہو اور کے اقوال وافعال کو قرآن وحدیث کے خلاف نہ پایا ہو، اور ان کے اقوال وافعال کی اشاعت پر انکار کرنا اور ان کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔ اور اس موضوع پر تفصیل سے کلام کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ صوفیاء کرام کی تردید اور انکار کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ستر امور سے واقف رہے جس کے بعد ہی اس کو انکار کرنا سہل ہوگا۔

ان امور میں سے یہ بھی ہے کہ وہ رسولوں اور ان کے مختلف درجات کے مطابق معجزات میں بصیرت رکھتا ہو اور ولیوں اور ان کے مختلف مراتب کے مطابق کرامتوں کی معرفت میں کمال رکھتا ہو اور ان پر ایمان رکھتا ہو۔ اور یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ بے شک اولیاء کرام بجز اس چند معجزوں کے جن کا استثناء کیا گیا ہے تمام معجزات میں انبیائے کرام کے وارث ہیں۔

ان امور میں سے یہ بھی ہے کہ وہ سلف اور خلف کی تمام کتب تفاسیر کا مطالعہ کیا ہو، تاکہ اسے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اسرار سے معرفت حاصل رہے، اور ائمہ مجتہدین نے جن چیزوں سے استنباطات کیا ہے انکی اساس اور بنیاد سے واقف ہو اور تفسیر و تاویل کو ان کے تمام شرائط اور ضوابط کے ساتھ جانتا ہو اور عرب کی بولیوں اور لغات کے غیر حقیقی معانی ومجازات اور استعارات کی معرفت میں تبحر وکمال رکھتا ہو تا اس کی رسائی مقصد تک ہو سکے۔

ان امور میں یہ بھی ہے کہ وہ صفاتِ خداوندی سے متعلق آیاتِ کریمیہ اور احادیث

نبویہ کی معانی میں سلف اور خلف کی جو کتابیں رہی ہیں وہ اس کے مطالعہ میں رہی ہوں اور اس چیز سے بخوبی واقف رہے کہ کس نے ظاہری معنی کو لیا ہے اور کس نے تاویل کی ہے اور ان میں ایک دوسرے سے کس کی دلیل راجح اور کس کی دلیل مرجوح ہے۔

ان امور میں یہ بھی ہے کہ وہ اصول دین اور اصول فقہ کے علم اور ائمہ کلام کے استنباطات کی بنیادوں سے پوری طرح واقف ہو۔

ان امور میں یہ چیز بھی انتہائی ضروری اور اہم ہے کہ وہ صوفیائے کرام کی اصطلاحات سے پوری طرح واقف اور باخبر ہو، جن سے یہ حضرات کلام کرتے ہیں تجلی ذاتی وصوری، ذات کیا ہے، ذات الذوات، اسماء وصفات کی معرفت کے درمیان فرق و امتیاز، احدیت اور واحدیت کے درمیان فرق وامتیاز ،ظہور وبطون اور ازل وابد کے راز کی معرفت، غیب وکون اور شہادت وشوؤں کے عالم کی معرفت، اور ماہئیت وحقیقت اور جذب محبت کے علم کی معرفت بکمال طریق احسن حاصل رہے اور یہ بصیرت بھی رہے کہ جذب وسکر میں کون صادق ہے، امتیاز کر سکے تا کہ اس کے ساتھ نرمی کی جا سکے اور کون کاذب ہے تا کہ اس کا مواخذہ کیا جا سکے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں پس جو عالم ،صوفیاء کی مراد ہی کو نہ جانتا ہو بھلا وہ کیونکر ان کے کلام کی شرح وبسط بیان کر سکتا ہے، یا ان مسائل کے اندر جن میں ان کی مراد کچھ اور ہے بھلا کیونکر وہ ان کی تردید کر سکتا ہے۔

نیز اسی میں رقمطراز ہیں شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام فرماتے تھے، وہ چیز جو تمہاری رہنمائی کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ بے شک اہل طریقت قواعد شرعیہ ہی پر قائم ہیں اور ان سے ہٹ کر نہیں ہیں۔ جو بھی کرامات اور خوارقِ عادات امور کا ظہور ان کے ہاتھ سے صادر نہیں ہوگی، اگرچہ کہ وہ علم کی انتہا پر پہنچ جائے۔ لیکن جب تک کہ ان کے طریقے پر نہ چلا ہو۔

شیخ مجد الدین فیروز آبادی فرماتے تھے، کہ ارباب فکر ونظر کے لئے جائز نہیں کہ وہ صوفیائے کرام پر اعتراض کرے۔ اس لئے کہ ان کے علوم و معارف، اربابِ فکر ونظر کے علوم وفنون پر فوقیت رکھتے ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کی ذاتِ گرامی ان صوفیائے کرام میں سے ہے جن پر جمال الٰہی سے حق منکشف ہوا۔ پس قیامت تک ان کے مواضع سجود انوار سے چمکتے رہیں گے اور جو شخص ان کے مثل بزرگ کو خطا کار کہنے یا کافر کہنے کے درپے ہوا تو یقیناً یہ چیز اس کی جہالت وحرمان نصیبی اور اس کی بے عقلی اور اس کے ضعف ایمان اور اس کی زبان کی بے ہودہ گوئی سے بے پروائی کا نتیجہ ہے۔

احیاء: کتاب العلم کے آٹھویں باب میں امام غزالی نے کسی عارف باللہ کا یہ قول نقل کیا، جو فرماتے تھے: جس کسی کو بھی اس طائفہ کے علم کا کچھ حصہ بھی نصیب نہیں ہوا تو اس کے سوءِ خاتمہ کا خوف ہے اور اس علم کا ادنیٰ حصہ یہ ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور اس کے اصحاب کو تسلیم کیا جائے۔ اور یہ حقیقت بالکل اسی طرح ہے کہ اگر کوئی شخص علم شریعت حاصل کرنے میں منہمک اور مشغول نہیں ہوا، تو اس کے گمراہ ہو جانے کا خوف ہے۔

اور مولانا اسمٰعیل دہلوی صراط مستقیم کے پہلے باب میں ثمراتِ طریق ولایت کے بیان میں لکھتے ہیں: طریق ولایت کے لوازمات میں سے یہ بات ہے کہ صاحبِ حال کے بدسگال دشمن پر بدبختی اور عذاب کا ظہور ہوتا ہے اور یہی معنی ہیں اس روایت کے ''من عادیٰ ولیًا فقد اذنته بالحرب'' (جس کسی نے میرے دوست سے دشمنی وعداوت کی۔ اس کے لئے میری طرف سے اعلان جنگ ہے)۔

اور اولیائے انبیاء کے بیان میں لکھتے ہیں:

اگر خوب غور کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہوگی کہ ان بزرگوں کے امثال کے ساتھ الفت رکھنا، محبت کرنے والے کے ایمان کی نشانی اور اسکے متقی ہونے کی علامت ہے۔

''ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب'' اوران بزرگوں اوران کے امثال کے ساتھ بغض وعناد، دشمنی کرنے والے کے نفاق کی علامت ہے اور اسکے بد بخت ہونے کی نشانی ہے اوراس حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ''لا یحبہ الا مومن تقی ولا یبغضہ الا منافق شقی متقی وپرہیزگار مومن ہی اللہ کے ولی سے محبت کرے گا اور بد بخت منافق ہی اس کے ساتھ بغض وعناد رکھے گا۔

# چودھواں مقدمہ

مومن کو چاہئے کہ اہل قبلہ کو کافر کہنے سے احتراز کرے اوراپنے دین وایمان کی تباہی وبربادی سے خوف کھائے شیخ الہند عبدالحق دہلوی علیہ الرحمہ ''تکمیل الایمان'' میں فرماتے ہیں: حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص کسی دوسرے آدمی کو کافر کہے، اگر وہ حقیقت میں کافر نہ ہو تو، کہنے والا شخص خود ہی اس وقت کافر ہو جاتا ہے۔

صاحب ''تنبیہ الضالین'' فرماتے ہیں، شریعت مطہرہ میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ دلیل قطعی کے بغیر کسی مسلمان کی طرف گناہِ کبیرہ کی نسبت کرنا حرام ہے۔ کسی مسلمان کو کافر کہنا یہ تو بہت ہی سخت اور نازک بات ہے، کسی ادنیٰ مسلمان کو کافر کہنا، کفر ہے تو چہ جائیکہ علمائے باعمل قاطعِ شرک وبدعت کو کافر کہا جائے۔ بالخصوص ساداتِ کرام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجزاء ہیں، ان کو کافر کہنا تو سخت ترین کفر ہے کیونکہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد آیت تطہیر انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا کی رو سے اہل بدر کی مانند مغفور ہے۔

نیز صاحب تنبیہ الضالین، اسی کتاب میں رقمطراز ہیں۔

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق میں یہ حدیث نقل کی ہے قال رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم من لم یعرف حق عترتی فلا حدی ثلث اما منافق واما ولد زنیة واما حملة امه فی غیر طهر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص میری آل کا حق نہ پہچانے وہ منافق یا ولد زنا ہوگا یا اس کی ماں کو حالتِ حیض میں حمل استقرار پایا ہوگا۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی، حکیم سنائی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، امام اعظم ابوحنیفہ النعمان اور مجدد الف ثانی وغیرہ رحمہم اللہ کی توہین وتکفیر کی گئی اور صوفی سرمد قتل کر دیے گئے تو اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اولیائے عظام اور علمائے کرام ہی پر طعن و تشنیع ہوتی ہے اور ان کی تکفیر کی جاتی ہے۔ ایسے ویسے عامی اشخاص پر اس طرح کی باتیں نہیں کی جاتیں۔ چنانچہ اسی مقام رفعت وعلو درجات کے تحت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ارشاد فرمایا۔

ہر کہ فاضل تر محسود تر۔ جو جس قدر صاحب فضل و کمال ہوگا اسی قدر اس پر رشک وحسد کیا جائے گا۔ حسد کے علاوہ اور بھی کچھ امور ایسے ہیں جو اولیاء وصلحاء پر طعن و تشنیع کا سبب ہے، چنانچہ صاحب نفحات، شیخ ابن عربی کے حالات میں لکھتے ہیں۔

شیخ ابن عربی پر طعن و تشنیع کی وجہ تقلید اور تعصب ہے، یا ان کی اصطلاحات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا، پھر حقائق و دقائق کی وہ باریکیاں ہیں، جن کو انہوں نے اپنی تصانیف میں بیان کیا۔

اور محمد دہدار ''حاشیہ نفحات'' میں فرماتے ہیں، ابن عربی پر طعن و تشنیع کی ایک اور وجہ ان کے کلام کو ایسے معانی ومطالب پر محمول کرنا ہے جو مشترک ہیں، اور جلد ذہن میں آنے والے ہیں۔

اور شیخ عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' اور ''تنبیہ الانبیاء'' میں اور شیخ فقہیہ علی مہایمی اپنی کتاب ''امحاض النصیحہ'' میں اور شیخ مکی اپنی کتاب ''جانب الغربی'' میں اور ان کے علاوہ دیگر بزرگوں نے علامہ ابن عربی پر نکتہ چینی و طعنہ زنی

کرنیوالوں کے طعن و تشنیع کے جواب میں رسوا کن تردید لکھی ہے۔

اور صاحب ''بارانِ رحمت''، ملا علی قاری کی تصنیف ''فر العون'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

اے نکتہ چیں! ابن عربی کی جانب جو کلمات منسوب ہیں ان کے متعلق تیرے نزدیک کیا مستند ثبوت ہے کہ بیشک یہ کلمہ شیخ ہی نے کہا ہے اور انہوں نے اسی معنی کا قصد کیا ہے جو مشہور اور معروف ہے۔

پہلی تو یہ ہے کہ ان کلمات کی نقل سے متعلق کوئی ثبوت اور سند نہ رہنے کی وجہ سے ان کلمات پر اعتماد کی گنجائش نہ رہی۔ اور نہ اب ان کے استفاضہ میں کوئی نصیحت وعبرت اور افادیت ہے کیونکہ ابن عربی کی اصل کتاب کا ثبوت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں ضروری ہے کہ ہر ایک کلمہ کا ثبوت فراہم کیا جائے کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ ان کی کتاب میں کسی دشمن یا ملحد شخص کی جانب سے الحاقات اور ترمیمات کئے گئے ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کلمہ سے ابن عربی نے یہی قصد کیا ہے اور اس سے آپ کی مراد یہی ہے۔ اس قسم کے دعویٰ کے لئے بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اور جو کوئی اس قسم کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے، کیونکہ آدمی کے قصد و ارادہ کا تعلق، امور قلب سے ہے جس پر بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی انسان مطلع نہیں ہوسکتا۔

اور فقہیہ علی مہایمی ''امحاض النصیحہ'' میں لکھتے ہیں:

شیخ امام حق اور دین کا احیاء کنندہ محمد ابن عربی طائی اندلسی، جن سے ارباب بصیرت نے نفع حاصل کیا اور جن کو اہل تقلید و وہم نے انکار کر دیا، ایسے کلمات کی وجہ سے جو آپ سے صادر ہوئے جیسا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اور متقدین میں صوفیاء سے متشابہات صادر ہوئے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے اولیاء کا انکار کر دیا جیسا کہ اگلے زمانے کے لوگوں نے انبیائے کرام کو مجنون قرار دیا۔

اگر ابن عربی سے اس طرح کے دقائق وغوامض سنو مثلاً اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔آپؐ نے نہیں پھینکا جب کہ پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔رحمان عرش پر مستوی ہے، حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا سیدھا ہاتھ ہے۔ بیشک میں رحمان کے نفس کو یمن کی طرف پاتا ہوں، میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت نہیں کی۔ میں بھوکا رہا تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

میں نے اپنے رب کو حسین صورت میں دیکھا۔رب نے مجھ سے پوچھا، اے محمدؐ! ملاء اعلیٰ کس معاملے میں نزاع کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا، اے میرے رب تو ہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔خدا نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک اور خنکی میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی، جس کے بعد میں وہ سب کچھ جان گیا جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

اس ذات کی قسم جسکے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ بے شک اگر تم رسّی کو زمین کی طرف ڈال دو، تو وہ اللہ ہی پر اترے گی۔

اس قسم کے غوامض و دقائق اللہ و رسول سے نہ سنے ہوں تو کہئے۔کہ ابن عربی نے کفر کیا، اللہ کے لئے ہاتھ اور پیر ثابت کیا گیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھینکنے کو، اللہ کا پھینکنا کہہ دیا گیا، اللہ کو مریض اور بھوکا بنا دیا، اور اس کے لئے صورت اور محل و مکان اور اس کے ہاتھ میں برودت و خنکی ثابت کیا، اور حجر اسود کو اس کا جز ٹھہرایا، اور یمن کو رحمٰن کی ناک بتلایا، اور اللہ کو اپنے پیر کے نیچے قرار دیا۔اس کی ذات بہت بلند ہے جو کچھ فرمایا۔

اور طاعن اشخاص نے حلاج کے قول انا الحق اور بایزید بسطامی کے قول سبحانی ما اعظم شانی، کو فرعون کے اس قول کے مانند سمجھ لیا انا ربکم الاعلیٰ، وما علمت

لکم من اللہ غیری اور جن بزرگوں مثلاً امام غزالی، فخر الدین رازی، شیخ شہاب الدین سہروری نے ان دونوں (حلاج و بایزید) کے کلام کی تعظیم وتوقیر کی تو ان کو اصل فرعون کی طرح سمجھ لیا، اور اپنی فکر ورائے پر اعتماد کیا، اور ابن عربی کے اصحاب نے حیض، طلاق اور لعان کے باب میں جن دقائق و باریکیوں کا احاطہ کیا تھا، ان کا انکار کر دیا۔ اور شیخ کے علوم و معارف کو جو ان کے اصحاب نے اظہار وانکشاف کیا تھا، ان کو جھٹلا دیا۔ اور شیخ کی اصطلاحات سے مطلع نہ ہو سکے اور ان حقائق کے تسلیم کرنے سے مکر گئے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا

بے شک بعضے علوم پوشیدہ خزانے کی طرح ہیں جن کو صرف علمائے ربانی ہی جان سکتے ہیں جب وہ ان حقائق کی گرہ کشائی کریں تو وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں مبتلائے فریب ہیں۔

نیز فقیہہ علی مہایمی اسی کتاب میں فرماتے ہے۔ اس شخص کی عقل وفہم مستند و معتبر نہیں جسکے اندر شیخ کے کلمات کو ربط دینے کی صلاحیت نہ ہو، اور ان کے دلائل و بینات کی مراد سمجھنے کی قدرت نہ ہو، اور ان کے مقدمات سے حاصل ہونے والے نتائج پہچاننے کی قابلیت نہ ہو، اگر چہ کہ وہ حیض، طلاق، اور لعان کے باب میں نادر فروعات و دقیق جزئیات سمجھنے میں بلند درجات و مراتب پر پہنچ چکا ہو۔ جس طرح اس شخص کا فتویٰ معتبر اور مستند نہیں ہے۔ جو اصول فقہ کا تو ماہر ہو، لیکن فقہی جزئیات سے ناآشنا ہو۔ اور ایسا شخص جو علم و معرفت کے بغیر طعن و تنقید میں سرعت و تیزی دکھلاتا ہے، اس کا ہوا و ہوس کے درپے ہو جانا تو ایک کھلی ہوئی بات ہے۔

مسئلہ تکفیر کے احکام کی تفصیل اٹھارویں فائدہ میں آئے گی اور وہ بات جو کہی جارہی ہے کہ علمائے متکلمین نے صوفیہ وجودیہ کی تکفیر و تضلیل کی ہے۔ یہ محض لوگوں کا خیال ہے،

جزم ویقین والی بات نہیں۔

سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے فتووں کا ماحصل یہ ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود پر کمال وقت اور باریکی کی وجہ سے بے شمار عقلی اور نقلی شبہات وارد ہوتے ہیں، ان شبہات کا حل میسّر نہ ہونے کی وجہ سے سطحی علمائے متکلمین نے ناچار اس مسئلہ کا انکار کر دیا۔ لیکن محقق علمائے متکلمین نے اس مسئلہ کی وقت و باریکی کے پیش نظر اس کے اظہار و بیان سے سکوت اختیار کیا ہے، تاہم اس کے باوجود محققین متکلمین کے گروہ نے اپنی تصانیف میں اجمالاً اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے جیسے امام غزالی اور امام رازی اور ان کے علاوہ اس فن کے دیگر ائمہ کرام۔

حاصل بحث یہ ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی اور مظنون الافادہ ہے اور مجتہد و مقلد، اہل سنت و جماعت کے اختلافی مسائل میں دونوں طرف میں سے کسی ایک طرف کی صحت کا یقین نہیں کر سکتے۔ اگر ایک جانب کی دلیل راجح ہو تو دوسرے جانب کو ضال و گمراہ نہیں خیال کرنا چاہئے جیسا کہ ہم نے یہ تفصیل پانچویں مقدمہ میں بھی پیش کی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

# پندرھواں مقدمہ

بزرگان دین کی خامیوں اور عیبوں کی تلاش و جستجو میں رہنا اور ان پر طعن و تشنیع کرنا، اور مسلمانوں کی کسی بھی جماعت میں تفرقہ و اختلاف پیدا کرنا اور فتنہ پیدا کرنا یہ نہایت مذموم خصلت اور انتہائی قبیح اور شنیع فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **ویل لکل ھمزۃ لمزۃ** یعنی بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت لوگوں کے عیب نکالنے والا ہو۔

ترجمہ مشکوۃ میں شیخ الہند عبد الحق محدث دہلوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک

حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

اس امت کے پچھلے افراد، اگلے اشخاص کو گالیاں دیں اور برا کہیں اور ملامت و پھٹکا کریں، اوران کا مرتبہ ومقام نیچا اور پست دکھلائیں تو ان واقعات کے ظہور کا انتظار کریں۔تند وتیز آندھیوں کا چلنا، زمین کا ہل جانا اور دھنس جانا، آدمیوں کے چہرے مسخ ہوجانا اور آسمان سے پتھروں کا برسنا، قیامت کی نشانیوں کا انتظار کریں جو پے در پے مسلسل ظہور میں آتی رہیں گے۔

صاحبِ فتوحات ۳۷۱ ویں باب میں فرماتے ہیں ساتویں آسمان اور ستاروں والے آسمان کے درمیان ایک تخت ہے جس پر یہی زمین کے مکلفین (جن وانس) کی سی شکلیں موجود ہیں۔اور پاک فرشتوں کے ہاتھ میں بلند وبالا ایسے پردے ہیں جنہیں یہ اپنے ہاتھ لئے محض ان مکلفین کی صورتوں اور شکلوں کو گھورے دیکھنے کے سوائے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ پھر جب فرشتہ کسی ایسی صورت پر نظر کرتا ہے جو اپنی اصلی شکل سے مسخ ہوگئی اور بدل گئی ہوتو ایک پردہ اس کے اور دوسری صورتوں کے مابین ڈال دیتا ہے، جس سے وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس پر کیا گذری؟ یہ واقعتاً کیا ہوا؟ (گویا فرشتے نے اس طرح اس کے عیوب دوسری صورتوں کے آگے ڈھانک دے اور ستر پوشی کردی اور یہ سب کچھ بھی محض اس بنا پر منحصر ہے کہ دنیا میں جب کسی نے کسی معاصی کا ارتکاب کیا تو اس کے نتیجے ہیں وہاں اس کی اصلی حالت پر اس کی شکل عود کر جاتی ہے) پھر یہ فرشتہ اسی مسخ شدہ صورت کی کھوج وتصور میں برابر لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس سے اسکی مسخ شدہ شکل ہٹ گئی اور اصل شکل آگئی تو یہ درمیانی پردہ جو پڑا ہوا تھا، ہٹادیتا ہے۔اب تو وہ صورت پوری خوبی اور آراستگی کے ساتھ نظر آنے لگتی ہے۔ وہاں ان صورتوں کی اور ارواح ملائکہ کی جو پردوں کے پکڑنے پر مامور ہیں۔ تسبیح یہ ہوتی ہے۔پاکی ہے اس کی خوبصورتی کو ظاہر کرے اور برائیوں کو چھپادے۔

اس مقام پر اہل کشف نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ کے اخلاق کو اپناؤ، اور اللہ کے

بندوں (جو صحیح معنی میں بندے ہیں) سے ادب سیکھو، کیونکہ وہ بندے لوگوں کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اوران کی برائیوں سے قطع نظر کرتے ہیں۔

اس اخلاق حسنہ کی تعلیم و تعلم کے لئے شریعتیں منجانب اللہ آئی ہیں۔تم اگر دیکھو کہ ایک شخص دعویٰ تو کرتا ہے اپنے اہل اللہ ہونے کا مگر لوگوں کے ساتھ اس کا طور طریقہ مذکورۂ بالا احکام کے خلاف ہو تو سمجھ لو کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے، اوران ہی اخلاقی مثالوں کی وجہ سے کہا گیا ہے غافر بخشنے والا ،غفور معاف کرنے والا ،غفار بخشش کرنے والا۔

امام ربانی جلد سوم کے ۳۲ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں، ہم پس ماندگان جو دین و شریعت کو علماء سے حاصل کئے ہیں اور دین وملت کو ان کے برکات سے اخذ کئے ہیں۔ایسی صورت میں ان بزرگوں کی شان میں طعن و تشنیع کی گنجائش رہی تو شریعت وملت سے اعتماد اٹھ جائے گا، اسی لئے سلف پر طعن و تشنیع کرنے والے شخص کو گمراہ اور مبتدع قرار دیا گیا اور اسکی طعن و تشنیع کو گمراہی کے اسباب میں شمار کیا گیا اور اسکو دین میں شک وشبہ پیدا کرنے والا قرار دے کر اسکی تردید اور بطلان کا حکم دیا گیا ہے۔

اور جلد اول کے ۴۱ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے من عمل صالحاً فلنفسه (الآیۃ) جو کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے تو وہ اس کے نفع اور فائدہ کے لئے ہے اور جو کوئی برا عمل کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا۔خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں۔الٰہی تو جس کو چاہتا ہے صالح بنا دیتا ہے ہم کو بھی ان کے ساتھ شامل فرما۔

ترسم ایں قوم کہ بر درو کشاں می خندند

برسر کارِ خرابات کنند ایماں را

مجھے خوف ہے کہ یہ لوگ جو تلچھٹ نوش افراد پر خندہ زن ہیں کہیں وہ خود ہی مے خانہ اور خمار خانہ کے اہتمام اور اس کے کاروبار میں الجھ کر اپنا دین و ایمان برباد نہ کرلیں، حق

سبحانہ وتعالیٰ بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کو صوفیائے کرام کا انکار کرنے سے اور اہل اللہ پر طعن و تشنیع سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے باب دوم کی دوسری فصل میں فرماتے ہیں۔

ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو چیزوں سے پرہیز کرے، پہلی چیز تکبر یعنی جو آدمی خود کو دوسروں سے بہتر اور بلند جانے اور ہمیشہ تعلّی اور اپنی بزرگی و بڑائی تلاش کرے، تکبر سے بچنے کی سخت تاکید اس لئے ہے کہ یہ بری خصلت آدمی کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تکبر دیگر اعمال اور خصلتوں میں سب سے زیادہ قبیح خصلت اور شنیع فعل ہے۔

حدیث شریف میں ہے لا یدخل النار احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من الایمان ولا یدخل الجنۃ احد فی قلبہ احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من کبر۔

جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہے وہ دوزخ میں نہیں جائے گا اور جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اور دوسری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کے درمیان فتنہ وفساد اور خرابی پیدا کرنے سے پرہیز کرے اور اس کے مراتب بہت ہیں۔

نیز فساد کے مراتب کے بیان میں مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی فرماتے ہیں۔ ایک عالم با کمال جو دقائق وغوامص کا حل کرنے والا، مرجع خاص وعام، وقت کا امام اعظم، زمانہ کا بخاری اور عہد کا غزالی بن چکا ہو، ایسے عالم کا قتل کر دینا، ایک ایسی برائی ہے جس کی کوئی حد او، انتہا ہی نہیں لیکن کسی شخص کی اہانت اور اس کے نقائص وعیوب کی تلاش وتجسس میں لگے رہنا بھی ارتکاب قتل کے جرم سے کچھ کم نہیں۔ فساد جس قدر سخت ہوگا اسی قدر ایمان بھی الٹ پلٹ ہو جائے گا۔

مولانا باقر آگاہ مدراسی ''ایقاظ الغافلین'' میں لکھتے ہیں، سبحان اللہ عارف بے نظیر

علاؤالدین علی مہایمی اور نامور محقق مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی قدس اللہ سرہما اور ان کے مانند محققین حضرات، معارف طریقت اور عوارفِ حقیقت کے بیان میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ کبیر صدرالدین قونوی کے ساتھ ہمسری اور برابرنہیں کرتے ہیں اور کشف و عیان کا دعویٰ بھی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے کلمات طیبات کی ترجمانی کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان طعنہ زن جواں مردوں کو دیکھئے کہ شہوات حیوانہ میں انحطاط کے باوجود کیا کیا بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان بزرگوں کی نظروں میں زیادہ تقدس نشان شمار کرتے ہیں۔

مثنوی ؎ کار پاکاں راقیاس ازخود دیگر  گرچہ ماند درنوشتن شیر وشیر

بزرگوں کے کام کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو، اگرچہ کہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) یکساں ہوتا ہے۔

گفت اینک مابشر ایشاں بشر  ماو ایشاں بستۂ خواہم وخور

یہ کہا کہ ہم بھی انسان ہیں اور وہ بھی انسان ہیں۔ ہم اور وہ سونے اور کھانے کے پابند ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد  کم کسے ز ابدالِ حق آگاہ شد

اس وجہ سے پورا عالم گمراہ ہو گیا۔ بہت کم کوئی خدا کے ابدال سے واقف ہوا۔

ہمسری با انبیاء برداشتند  اولیا را ہمچو خود پنداشتند

انہوں نے انبیاء کے ساتھ برابری کا دعویٰ کھڑا کر دیا۔ اور اولیاء کو اپنا جیسا سمجھ لیا۔

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ  ہست فرماتے درمیاں بے منتہی

اندھے پن سے وہ یہ نہ سمجھے کہ ان دونوں میں بے انتہا فرق ہے۔

خلق در بازار یکساں میروند  آں یکے در ذوق و دیگر دردمند

مخلوق بازار میں یکساں چلتے پھرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی خوش وخرم رہتا ہے تو

کوئی غمگین و دردمند۔

برگہا ہم رنگ باشد در نظر　　میوۂ ہر یک بود نوعے دگر

درختوں کے پتے دیکھنے میں تو ایک ہی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔لیکن ہر درخت کا میوہ جداگانہ ہوتا ہے۔

بیضۂ بازار چہ باشد در شبہ　　بیضۂ کنجشک را دور است راہ

باز کا انڈا اور چڑی کا انڈا باہم بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔لیکن ان دونوں کے درمیان معنویت کے لحاظ سے بہت فرق اور دوری ہے۔

دانۂ آبی بدانہ سیب نیز　　گرچہ مانند فرقہاداں اے عزیز

پانی کا بلبلہ اور سیب دیکھنے میں تو دونوں یکساں دکھائی دیتے ہیں،لیکن ان میں فرق بہت ہے۔

ہر دو گوں زبنوں خورد از یک محل　　لیک زیں شد نیش دزاں دیگر عمل

دونوں قسم کے بھڑوں نے ایک ہی جگہ سے کھایا لیکن اس سے ڈنک اور اس سے شہد بنا۔

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب　　زیں یکے سرگیں شد وزاں مشکناب

دونوں قسم کے ہرنوں نے گھاس اور پانی کھایا پیا،اس ایک کا گوبر بنا اور دوسرے کا خالص مشک۔

ہر دو نے خوردند از یک آبخور　　آں یکے خالی وآں پُر از شکر

دونوں نرسلوں نے ایک گھاٹ سے پانی پیا،لیکن ایک کھوکھلی اور دوسری شکر سے بھری ہوئی ہے۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں　　فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

اس طرح کی لاکھوں مثالیں تیرے سامنے ہیں لیکن ان میں ستر سالہ راہ کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

ایں خورد گردد پلیدی زو جُدا　　واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

یہ کھاتا ہے تو نجاست اس سے نکلتی ہے اور وہ کھاتا ہے،تو سب خدا کا نور بن جاتا ہے۔

ایں خورد زاید ہمہ بُخل وحسد　　واں خورد زاید ہمہ نور خدا

یہ کھاتا ہےتو سراسر بخل اور حسد پیدا ہوتا ہے۔اور وہ کھاتا ہےتو سب خدا کا نور بن جاتا ہے۔

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست آبِ شور و آبِ شیریں راصفاست

دونوں صورتیں اگر ایک جیسی ہیں۔ٹھیک ہے نمکین اور شیریں پانی میں صفائی موجود ہے۔

جز کہ صاحب ذوق نشناسد بیاب اُوشناسد آبِ خوش از شورہ آب

سوائے صاحب ذوق کے کوئی نہیں پہچان سکتا ہے، سمجھ لے کہ وہی میٹھے اور کھارے پانی کو پہچانتا ہے۔

ہست ترکیب محمد لحم و پوست گرچہ ترکیب ہر یک جنس اوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار ترکیب کے لحم و پوست کے ہیں گرچہ کہ ترکیب کے لحاظ سے ہر ایک، ان جیسا ہے۔

گوشت دارد پوست دارد استخواں ہیچ ایں ترکیب را ماند ہماں

گوشت، پوست اور ہڈی کی ترکیب پر کوئی ویسا ہی رکھتا ہے۔

اندریں ترکیب ماند معجزات کہ ہمہ ترکیبہا گشتند مات

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترکیب کے اندر معجزات ہیں جو تمام تراکیب کو ماند کر دیتی ہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بودے احمدؐ ابوجہل خود یکساں بودے

اگر کوئی بصورت آدمی انسان ہوتا، احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل یکساں ہوتے۔

احمدؐ و بوجہل در بت خانہ رفت زیں شدن تا آں شدن فرقے است زفت

احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل کے دونوں بتخانہ گئے لیکن آپؐ کے جانے میں اور ابوجہل کے جانے میں بڑا فرق ہے۔

وہ یہ کہ: اس در اید سر نہد او ررا بتاں وآں در آید سر نہد چوں امتاں

جب آپ گئے تو بت، پیروں پر گر پڑے، لیکن ابو جہل گیا تو وہ خود بتوں کے پیروں پر گر پڑا۔

چشم ابلیسانہ را یک دم بہ بند　　چند بینی صورت آخر چند، چند

سرکشی کی نگاہ یک دم بند کر لے تو تجھے صورتیں اوران کی معنوی حقیقتیں الگ الگ دکھائی دیں گی۔

دیدۂ معنی زمانے بر کشا　　تا بہ بینی فرقہا در فرقہا

کچھ دیر کے لئے چشم باطن کو کھول دے تا کہ تو ان اشیاء کے حقائق متضادہ کے فرق کو دیکھ سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆

# سولھواں مقدمہ

مقلد کو مجتہد کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں، البتہ اسے اس بات کا حق واختیار ہے کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرے۔ لیکن طعن وانکار کی صورت میں تعزیر وملامت اور سرزنش کے لائق ہے۔ سند العلماء مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی مولوی نوراللہ کے نام لکھے ہوئے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

وحدت الوجود کے قائل افراد میں سے جو فرد بھی جادۂ اعتدال سے قدم باہر نکالے تو نوبت، الحاد اور زندقہ تک پہنچ جائیگی اور وہ ضرور گمراہ اور گمراہ کن ہو جائیگا۔ اسی طرح وحدت الشہود کے قائل اشخاص میں سے جو بھی شخص جادۂ اعتدال سے قدم باہر رکھے اور علماء وصوفیا کے گروہِ کثیر کو کافر وگمراہ کہے تو وہ ضرور طعن اور ملامت کے قابل ہے۔

مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں :۔

ایک شخص جو ابھی صوفیائے صافیہ کے مقام کو نہیں پہنچا ہے اور نہ ہی عالم متکلم ہے، وہ

مکلّف ہے کہ صوفیاء نے جو فرمایا ہے اس کو اجمالاً جان کر رکھے اور یہ اعتقاد رکھے کہ صوفیہ نے جو فرمایا ہے، وہ حق ہے، البتہ میرا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، متشابہات قرآن پر ایمان کی طرح۔

اور ملا علی قاری اپنی کتاب ''رسم القوارض'' میں لکھتے ہیں کہ:-

اگر کوئی حنفی شخص، شافعی مذہب کی جانب منتقل ہو جائے تو اس کی تعزیز کی جائے اور اگر کوئی شافعی، مذہب حنفی کی طرف منتقل ہو جائے تو اس کو معزول کیا جائے۔ یہ بات احناف کے درمیان مشہور ہے وہ قول مبتدع اور مخترع ہے۔ ہاں اگر مسلک کی تبدیلی، مذہب اول سے سرکشی اور طعیانی کی وجہ سے ہو تو ضرور سزا دی جائے، خواہ وہ شخص حنفی ہو یا شافعی۔

اور شیخ جلال الدین سیوطی ''مجموع الحاوی للفتاوی'' میں ایک استفسار کے جواب میں فرماتے ہیں:

سوال: اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو فقہ جاننے کا مدعی ہو اور وہ یہ کہے کہ ابوحامد الغزالی فقیہہ نہ تھے، وہ صرف عابد و زاہد تھے۔

جواب: بے شک اس جاہل کا یہ قول کہ امام غزالی فقیہہ نہیں تھے۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو بری طرح سے کوڑے لگائے جائیں اور اس کو ایک طویل مدت تک قید میں رکھا جائے تا کہ کسی بھی جاہل شخص کو یہ جرأت اور حوصلہ نہ ہو کہ ائمۂ اسلام میں سے کسی بھی امام سے متعلق ایسی بات اپنی زبان سے نہ نکالے، جس میں توہین اور تنقیص کا شائبہ ہو۔

یہ کلمہ جو اس شخص سے صادر ہوا ہے، وہ انتہائی جہالت و بے علمی اور دینی فہم و بصیرت میں قلت و کمی کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اجہل الجاہلین اور افسق الفاسقین ہے۔ بے شک امام غزالی اپنے زمانے میں اسلام کی نشانی اور علم و حجت تھے اور وہ فقہائے کرام کے امام تھے اور فقہ کے اندر ان کی گراں قدر تصانیف ہیں اور شافعی مذہب کی بنیاد ان ہی کی کتابوں پر ہے۔ یہ امام غزالی ہی تھے جنہوں نے شافعی مذہب کی تنقیح و تلخیص اور تزین کی اور اس کو اپنی کتابوں ''بسیط'' ''وسیط'' ''وجیز'' اور خلاصہ'' میں تحریر کیا۔ اور امام رافعی اور امام نووی کی فقہی

تصانیف کا انحصار بھی امام غزالی ہی کی تصانیف پر ہے۔

حاصل کلام بے شک یہ شخص جسکی زبان سے اس قسم کی بات صادر ہوئی ہے اس پر جہل، حماقت اور فسق نے غلبہ پالیا ہے۔ دین میں توقف واحتیاط کو پسند کرنے والے شخص پر ضروری ہے کہ وہ اس آدمی سے الحب اللہ کے تحت قطع تعلق کر لئے اور البغض للّٰہ کے تحت اس سے دوستی نہ رکھے یہاں تک کہ وہ شخص پیوند خاک ہو جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

# سترھواں مقدمہ

کتابِ ھٰذا میں بعض مقامات پر ضعیف اقوال اور مرجوح روایات مثلاً سجدہ تحیت وطوافِ غیر کعبہ وغیرہ کونقل کیا گیا ہے جس سے فقیر کا منشا اور مقصد غالی اشخاص کی زبان بند کرنا ہے۔ تا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مسئلہ مختلف ہے اور کسی اختلافی مسئلہ میں ایک ہی جانب کے حق ہونے کا جزم ویقین کر لینا اور اسی کو ترجیح دینا اور اس میں تعصب سے کام لینا ناروا اور غیر مناسب بات ہے، اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے پر نکتہ چینی اور طعن و تشنیع سے پرہیز کرنا چاہئے اور باہم ایک دوسرے کو کافر نہیں کہنا چاہئے کیونکہ وہ بھی کسی دلیل ہی کے تحت مسئلہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں اگر چہ کہ وہ دلیل ضعیف ہی کیوں نہ ہو فربکم اعلم بمن هو اهدیٰ سبیلا تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ ہدایت کی راہ پر ہے۔

علاوہ ازیں کتاب میں ضعیف اقوال کو دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ فقیر قول ضعیف پر عمل کی ترغیب دے رہا ہے اور مرجوح روایات پر اس کے مسلک کی بنیاد ہے، حاشا وکلا۔

شیخ الہند عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج'' کے دسویں باب کی چھٹی فصل میں فرماتے ہیں:۔

واضح رہے کہ صاحب ''امتاع'' نے مسئلہ سماع سے متعلق تین قول بیان کیا ہے۔
حرمت، کراہت اور اباحت اور تینوں قول کے اثبات میں دلائل کو پیش کرتے ہوئے اباحت کے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ مصنف کا مدعا یہی ہے، اور حرمت و کراہت کے استدلالات کا جواب دیتے ہوئے اباحت کے موقف کی تائید میں طویل بحث کی ہے اور اس کو کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے ثابت کیا ہے۔

نیز اس کتاب میں رقمطراز ہیں:

اباحت کے اقوال پیش کرنے سے راقم الحروف کا مقصد اس حقیقت کی گرہ کشائی ہے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور کسی اختلافی مسئلہ میں ایک ہی جانب حق ہونے کا یقین کر لینا اور اسی کو اہمیت و ترجیح دینا اور اسکے اندر تعصب سے کام لینا یہ علمی اختلاف کا غیر مناسب طریقہ ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو نیکی اور صلاح وقت سمجھیں تو توقف اور احتیاط سے کام لیں اور اختلاف و نزاع کے بھنور میں نہ پھنس جائیں اور اسی روش میں اپنی سلامتی تصور کریں، اور بزرگانِ دین واہل اللہ کو زشت کرنے سے، اور انہیں گمراہ کہنے سے، اور ان پر لعنت و ملامت کرنے سے، اور ان کے عیب نکالنے سے اپنی زبان کو بند رکھنا چاہیئے۔ دلیلوں کے تعارض اور طریقوں کے تباین و تفاوت اور علماء و فقہاء اور صوفیاء کے وجود بابرکت کے باوجود، دوسری جانب میں راجح و مرجوح سے قطع نظر کرتے ہوئے بزرگوں کے پیچھے پڑ جانے سے بچنا چاہیئے اور کبھی راستی وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

صحبت عافیت گرچہ خوش افتادا ے دل جانب عشق عزیز است فرومگذارش

اور اباحت کے قائل اشخاص کے لئے بھی زیبا نہیں کہ وہ تعصب سے کام لیتے ہوئے علماء جو دیانت و نصیحت کے راستہ کے سالک ہیں اور دونوں فریق کے لئے ضروری ہے کہ وہ تفصیل اور تمیز کے طریقہ کی رعایت و طرفداری کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، توقف و احتیاط

سارے کاموں کے اندر محمود و پسندیدہ ہے اور افراط وتفریط تمام جگہوں میں مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔وباللّٰہ التوفیق ومنہ العصمۃ۔

نیز حضرت عبدالحق محدث دہلوی اسی کتاب میں غنا وموسیقی سے متعلق واقع شدہ اختلاف بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس ناچیز کو بیان کرنے سے منشاء اور مدعا یہ ہے کہ یہ امر مختلف فیہ ہے اور اختلافی مسائل کے اندر ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہئے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حال وروش پر چھوڑ دینا چاہئے۔ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا واللّٰہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمئاب۔

☆☆☆☆☆☆☆

# اٹھارواں مقدمہ

اس کتاب کو وہی شخص مطالعہ کرے جو غالی افراد کے غلو اور اہل سنت و جماعت کے مذہب سے واقفیت رکھتا ہو اور جو شخص ان دونوں (غلو مردم و مذہب اہل سنت) میں سے ایک کو جانتا ہو اور دوسرے کو کماحقہ نہ جانتا ہو تو یہ کتاب اس کے لئے قابل مطالعہ نہیں اور اگر لوگوں کے غلو سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو اور اس قدر اہل سنت و جماعت کے مذہب سے واقف نہ ہو تو یہ کتاب اس کو نفع پہنچائے گی اور اگر اس کے برعکس لوگوں کے غلو سے مطلق واقف ہی نہیں اور مذہب اہل سنت سے پوری طرح واقف ہو تو یہ کتاب اس کو نفع نہیں پہنچائے گی، کیونکہ اس کتاب کے اندر اصل بحث لوگوں کے غلو اور ناقص اشخاص کے افراط سے متعلق ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

# انیسواں مقدمہ

یہ کتاب اہل سنت و جماعت کی مستند اور معتبر کتابوں کی اسانید وشواہد سے مرتب و مہذب ہے۔ لہٰذا افتراء اور بہتان کی مطلق گنجائش نہیں، لیکن چاہئے کہ بے دماغی ظاہر نہ کریں، اور نقل کو اصل کے ساتھ موافقت و برابری کر کے دیکھیں اور اس بات سے خوف نہ کھائیں، کہ نقل کی صحت ظاہر ہوگئی تو اسکو تسلیم کر لینا ضروری ہو جائیگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

# بیسواں مقدمہ

تطبیق کے وقت یہ نہ کہا جائے کہ یہ تمام دلائل اور شواہد مستند و معتبر کتابوں میں تو موجود ہیں لیکن ان کی کوئی تاویل ہوگی جس کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہو رہا ہے۔ مناظرہ کے دوران اس طرح احتمال کے پہلو کو پیش کرنا عجز و بے چارگی کی نشانی اور جہل و نادانی کی دلیل ہے اور اس احتمال کے باوجود بحث و مباحثہ کا سدِّ باب ہو ہی جاتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ یہی وہ بیس مقدمات ہیں جن کو کتابِ ھٰذا کے مطالعہ کے دوران ذہن میں مستحضر اور ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اس دورِ سراپا طغیان میں کچھ لوگ اربابِ کشف وشہود کے اوپر بعض بے اصل و خام خیالات اور خرافاتِ اوہام کے علاوہ حلول و اتحاد اور کفر و الحاد کی تہمت بھی باندر ہے ہیں۔ حالاں کہ یہ حضرات کرام سنّت کی حمایت کرنے والے، بدعت کا قلع قمع کرنے والے، شریعت مطہرہ کے ظاہر اور باطن کے درمیان مطابقت پیدا کرنے والے ہیں، ایسے بزرگوں کی تذلیل و توہین کرنے میں پیش پیش ہیں، اور وحدۃ الوجود کو غیر معقول و منقول کہہ رہے ہیں

اور بطور اعتراض یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ بُت پرست ہنود تو ہزاروں خدا رکھتے ہیں لیکن وحد ت الوجود کے قائلین کے یہاں خداؤں کی کوئی حد ہی نہیں ہے اس لئے کہ ان اندھوں کے بدن کا ایک ایک بال بھی ان کی ایک جان کے ساتھ جاندار ہے۔

اگر یہ تمام موجودہ صورتیں حق کے ایک وجود میں موجود ہوں تو کثرتِ الٰہی کی قباحت کیسے لازم آسکتی ہے؟ دراز دستی این کوتہ آستیان بین

اور بطور افتراء یہ کہتے ہیں کہ طائفہ وجودیہ کے یہاں نماز، روزہ اور دیگر شرعی تکالیف سے آزادی اور عدم پابندی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور ان کے نزدیک ماں، بیوی اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں۔ اور حال یہ ہے کہ وجودیہ ، فرائض کا انکار کرنے والے اور محارم کو حلال قرار دینے والے شخص کو کافر سمجھتے ہیں۔

نیک لوگوں کی شان میں بدگوئی و الزام تراشی خود اپنے لئے ہی نقصان دہ ہے۔
آسمان کی جانب تھوکنا گویا اپنے ہی چہرہ پر تھوک لینا ہے۔

اور بعض بے ہودہ گو اشخاص کی بے ہودگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وجودیہ کو یہود اور نصاریٰ سے زیادہ بری جماعت قرار دے رہے ہیں اور بعض جاہل نے تو سرکشی اور طغیانی کی انتہا کردی ہے کہ شیخ الشیوخ شیخ محی الدین ابن عربی کو شیخ اکفر او شیخ ابتر کہتے ہیں۔ اور امام حجۃ الاسلام محمد غزالی اور شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ کبیر صدرالدین قونوی اور خواجۂ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز اور شیخ عبدالکریم جیلی اور خواجہ مجید اللہ احرار اور مولانا عبدالرحمٰن جامی اور مولانا عبد الغفور لاری اور خواجہ عبدالباقی اور دوسرے اولیاء وجودیہ کو کافر سمجھتے ہیں۔
حالانکہ بیشتر بزرگان وجودیہ خود ان ہی نادانوں کے سلسلہ اور طریقہ کے مشائخ و بزرگ ہیں۔ **قاتلهم الله انا یوفکون۔**

چاند روشنی بکھیرتا ہے اور کتا عوعو کرتا۔ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی فطرت

اور طینت پر قائم ہے۔ لب، حلق اور دھان بریدہ شخص تو چاند کی جانب تھوک رہا ہے۔ بیشک تیرا تھوک تیرے ہی چہرے پر آ گرے گا۔ تھوک آسمان کی جانب کوئی راستہ تو نہیں نکال پائے گا۔ اگر کوئی نادان شمع الٰہی کو گل کرنے کے درپے ہو جائے تو کیا اس کی پھونک سے شمع گل ہو سکتی ہے۔

**یریدون ان یطیفؤ انوراللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ المجرمون۔**

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مکتوبات جلد سوم کے ۷۹ ویں مکتوب میں شیخ ابن عربی کی تعریف اور توصیف میں لکھتے ہیں۔

شیخ ہی نے سخن معرفت کی بنیاد رکھی اور عرفان کی تشریح و تفصیل کی اور توحید و اتحاد سے متعلق مفصلاً بحث کی۔ اور ''تعدد و تکرّر'' کے منشاء کو کھول کر بیان کیا اور وجود کو بالکلیہ حق کے ساتھ ضم کر دیا اور عالم کو موہوم و متخیل قرار دیا۔ اور وجود کو تنزلات ثابت کیا۔ اور ہر مرتبے کے احکام جُدا جُدا کیا، اور عالم کو حق جل شانہ کا عین سمجھا۔ اور ہمہ اوست کے نظریے کی تخلیق کی۔ اور مرتبۂ تنزیہ کے باوجود حقِ تعالیٰ کو عالم کی مخلوقات کے پردہ میں پالیا اور اس کی ذات کو پوری طرح سے دیکھنے اور سمجھنے سے منزہ اور مبرا جانا اور وہ مشائخ جن کو متقدمین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے بھی اس باب میں شرح و تفصیل سے گریز کیا۔ اگر انہوں نے کوئی وضاحت بھی کی تو اشارات و کنایات کی زبان میں۔ اور صوفیا میں سے وہ مشائخ جو شیخ کے بعد آئے، اُن کی اکثریت شیخ ہی کی مقلد ہے۔ اور انہوں نے بھی شیخ ہی کی اصطلاح کے موافق کلام کیا ہے۔ اور ہم متاخرین بھی اسی بزرگ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہیں اور ان ہی کے علوم اور معارف سے بہرہ ور ہیں۔ **جزل اللہ عنا خیر الجزاء۔**

اور مکتوبات جلد اول کے ۱۶۹ ویں مکتوب میں طائفہ وجودیہ کو وصل و کمال کے درجات و مراتب کے فرق و امتیاز پر واصل و کامل جماعت فرماتے ہیں نیز جلد سوم کے ۲۲۶

ویں مکتوب میں شیخ ابن عربی کو مانے گئے اولیائے اکرام میں شامل کیا ہے۔اور جلد سوم کے ۷۷ویں مکتوب میں شیخ کو عظیم ترین اولیائے کرام میں شمار کیا ہے۔

اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب ''ہمعات'' کے اندر ابن عربی کے طریقہ کو قدم انصدق (نشان نیک) کے وصف سے متصف کیا ہے۔اور اپنی دوسری کتاب ''الانتباہ فی سلاسل الاولیاء'' میں ابن عربیؒ کو اپنے سلسلہ کے مشائخ میں شمار کیا ہے۔اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''تنویرالعینین'' میں اپنے مدعا کے اثبات کے لئے ابن عربیؒ کے قول کو بطور سند حجت نقل کیا ہے۔

صاحب فیض عام ۵۳ ویں صفحہ میں لکھتے ہیں قطب المقربین شیخ محی الدین عربی نے ۲۸ویں باب میں لکھا ہے۔

**انه لیس للعبد فے العبودیة نهایة حتیٰ یصل الیها ثم یرجع رباً کما انّه لیس للرب حد ینتهی الیه ثم یعود عبداً فالربّ رب غیر نهایة۔ والعبد عبد غیر نهایة:**

بندے کے لئے عبودیت میں کوئی حد اور انتہا نہیں ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ کر رب ہوجائے جیسا کہ رب کے لئے کوئی حد نہیں ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ کر بندہ ہوجائے۔ رب،رب ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول کرے اور عبد،عبد ہی ہے خواہ وہ کتنی ہی ترقی کرے۔

لہٰذا کسی بھی بندے کے بارے میں اس کے رب ہونے کا اعتقاد رکھنا خواہ وہ کسی منزل اور مرتبہ میں ہو،کفر ہے اور اگر کسی بزرگ کے کلام سے ایسا مفہوم پیدا ہو رہا ہے تو یہ تیری عقل وفہم کا قصور ہے اور اس بزرگ کی مراد ہرگز وہ نہیں ہے جو تو نے سمجھ لیا۔صوفی نما ملحد بعض اہل اللہ کے کلام سے یہی مراد سمجھ کر خود بھی کافر ہوگئے اور اپنے مریدین کو بھی کفر کے بھنور میں جھونک دیا۔**العیاذباللہ**

مسئلہ وحدت الوجود کے قائل صرف شیخ ابن عربی ہی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی ہزاروں متقدمین و متاخرین اولیائے کرام و علمائے عظام ہیں اور خود منکرین کے امام و مقتدا بھی اس مسئلہ کے قائل ہیں اگر منکرین اس حقیقت سے واقف ہوتے تو ہرگز مسئلہ وحدۃ الوجود کا انکار نہیں کرتے۔

صاحب ''اجلۃ التائید فی شرح اولۃ التوحید'' فرماتے ہیں کہ قائلین وحدۃ الوجود کے دلائل پیش کرنے کے بعد ہم یہ بیان کریں گے کہ اس مسئلہ کے اکثر منکرین حضرات، قوت نظریہ اور قوت عملیہ کے اندر ان ہی قائلین کے احوال و اقوال پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس حقیقت سے باخبر ہوتے تو ہرگز اپنے انکار پر قائم نہیں رہتے اور اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔
مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق اور تفصیل کتاب ھذا کے ۳۸، ۳۹، ۴۰ ویں فائدہ میں ملاحظہ کیجئے۔

نیز یہ جاننا چاہئے کہ حدیث صحیح میں یہ وارد ہے: **''اذکروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویھم''** یعنی مرے ہوئے لوگوں کے محاسن بیان کرو ان کے معائب و نقائص کا اظہار نہ کرو۔

لیکن اہل زمانہ کا حال یہ ہے کہ رحلت شدہ لوگوں کے معائب بیان کرو اور ان کے محاسن کا اظہار نہ کرو بلکہ اب نوبت یہ آچکی ہے کہ بزرگوں کے محاسن کو بھی معائب کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔

چشم بداندیش کہ برکندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

چشم بداندیش سے بچ کر رہو کیوں کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے۔
اور سنّی ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اہل سنت و جماعت کے آئمہ کرام پر تعلّی اور تفوق کی راہ سے طعن و تشنیع کر رہے ہیں۔

ہر کہ بے ہودہ گردن افرازد      خویشتن را بگردن اندازد

بے ہودگی کے ساتھ جو شخص بھی اپنی گردن بلند کرتا ہے وہ خود ہی اپنی بد عملی کے باعث گردن جھکا لیتا ہے۔

اور دونوں جانب کے نادان ایک دوسرے کے اکابرین و بزرگانِ دین کے عیوب کی تلاش و جستجو اور ان کی خطاؤں کی گرفت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے ہیں۔

نہ در ہر سخن بحث کردن رواست      خطا بر بزرگان گرفتن خطا است

ہر بات میں بحث و مباحثہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ بزرگوں کی خطائیں اور لغزشیں پکڑنے کے درپے ہو جانا بہت بڑی غلطی ہے۔

اور دونوں فریق شریعت مطہرہ کی بنیاد ہلا دینے اور اساطین ملت کو توڑنے میں اپنی اپنی فکر و صلاحیت کو صرف کر رہے ہیں۔

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن      نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

میں نے تجھے کلہاڑی لکڑیوں کا ہیزم توڑنے کے لئے دی تھی نہ کہ مسجد کی دیوار توڑنے اور کھودنے کے لئے۔

علم و قلم کو تعمیری کاموں میں استعمال کرنے کے بجائے تخریبی کاموں میں استعمال کر رہے ہیں۔

اور بزرگانِ دین کی توہین و تذلیل اور خانۂ دین متین کے انہدام کو کمالِ بزرگی تصور کر رہے ہیں۔

بزرگش نخوانند اہل خرد      کہ نامِ بزرگان بزشتی برد

اہل خرد اس شخص کو اچھا نہیں سمجھتے جو بزرگان دین کا نام بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ لیتا ہے۔

بزرگان دین کے ساتھ بے ادبی و گستاخی کا یہ عالم ہے کہ سراج الملۃ امام الآئمہ امام

اعظم ابوحنیفہ النعمان کو صاحب الرّائے کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ آپ نے حدیث کے خلاف رفع یدین، ترک کرنے کا حکم دیا ہے اور تثویب (اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر لوگوں کو نماز کے لئے دوبارہ بلانا مترجم) کو بدعت ضلالت کہہ رہے ہیں جو کہ امام اعظم، حضرات صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) اور سارے کوفی فقہا کے قیاس سے ثابت ہے اور ایک امر مستحسن ہے۔

اور امام حجۃ الاسلام محمد الغزالی کو کافر اور ملعون کہہ رہے ہیں کیوں کہ آپ ''احیاء العلوم'' اور ''کیمائے سعادت'' میں وحدت الوجود اور ''ہمہ اوست'' کے قائل اور معترف ہیں۔

اور سلطان العارفین بایزید بطامی اور حسین بن منصورؒ کو ملحد اور کافر کہہ رہے ہیں اور سارے صوفیائے کرام اور علم تصوف کا انکار کررہے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں حضرت بایزید بطامی اور حضرت حسین بن منصور کے یہ کلمات۔ **لاالٰہ الا انا فاعبدون** اور سبحانی مااعظم شانی اور لیس فی جبتی سوی اللہ'' اور انا الحق وغیرہ۔ کفر وشرک پرمبنی ہیں۔

اور شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کو بے ہودہ گو خیال کررہے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنی کتاب ''گلستان اور بوستان'' میں عشق کا باب باندھا ہے۔

اور مولانا جلال الدین رومی کو فعل حرام کی حکایت بیان کرنے والا کہہ رہے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب ''مثنوی'' میں ایک بزرگ کی حکایت بیان کی ہے جنہوں نے حضرت بایزید کو اپنے گرد سات مرتبہ طواف کرنے کا حکم دیا تھا، اور طواف غیر کعبہ حرام ہے۔

نیز مولانا روم کو خود اپنے کفر کا اقرار کرنے والا، کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ مثنوی میں فرماتے ہیں۔ ؎ از سبب سوزیش من سودائیم وز خیالاتش چو سوفسطائیم

پس خود ہی اپنے سوفسطائی ہونے کا اقرار کررہے ہیں اور سوفسطائی کافر ہے۔

اور محقق نامور مولانا عبدالرحمٰن جامی کو بے ادب کہا جارہا ہے کیوں کہ انہوں نے

باب ''یوسفؑ زلیخا'' میں حضرت یوسفؑ کی بیوی حضرت زلیخا کے حسن و جمال کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز حضرت جامی کو فعل حرام کا مرتکب کہہ رہے ہیں اس لئے کہ رقعات جامیؒ میں ہے کہ آپ عبید اللہ احرار کے لئے زمین بوسی فرماتے تھے۔ اور زمین بوسی حرام ہے۔

اور شیخ الہند شاہ عبد الحق دہلوی کو ملحد و مشرک کہہ رہے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''مدارج'' میں۔ **ھو الاول ولآخر و الظاھر و الباطن وھوبکل شئی علیم** کی آیت کو اللہ تعالیٰ کی حمد میں سپرد قلم کیا اور اسی آیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیہ وسلم کی مدح میں بھی نقل کیا ہے۔

اور مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی کو کافر اور مشرک کہہ رہے ہیں کیوں کہ انہوں نے دوگانۂ قادریہ پڑھنے کا حکم دیا اور یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ کہنے کو جائز قرار دیا۔ حالاں کہ بعض علماء نے شیأ للہ کے لفظ کو کلمات کفر میں شامل کیا ہے اور غیب کا علم جاننا، اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور غائب کو ندا دینا شرک ہے۔

نیز مولانائے موصوف کو دروغ گو بھی کہا جا رہا ہے اس لئے کہ وہ اپنی کتاب تحفۂ احسن میں اپنے شیخ مربی قدوۃ السالکین حضرت رکن الدین محمد سید شاہ ابو الحسن قربی قادری ویلوریؒ کو قبلہ وکعبہ لکھتے ہیں اور کعبہ عرب میں ہے اور حضرت قربی انسان ہیں اور یہ عجم میں ہیں۔

اور بحر العلوم ملک العلماء مولانا عبد العلی انصاری لکھنوی کو بدعتی کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں کیوں کہ آپ حقہ کش تھے۔ اور دسواں، بیسواں، چالیسواں، برسی، سہ منی، بائیس رجب کا کھانا تناول فرماتے تھے۔ اور محفل میلاد سرورِ انام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام میں شرکت کرتے تھے۔ اور صلوٰۃ وسلام میں شرکت کرتے تھے۔ اور صلوٰۃ وسلام کے وقت قیام کرتے تھے اور شعبان کے آخری عشرہ اور ماہِ رمضان المبارک، چہل روزہ اعتکاف میں تسبیح ہاتھ میں رکھتے تھے اور بارہ ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ کا ورد فرماتے تھے۔ حالاں کہ حدیث

شریف میں وارد ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

نیز بحرالعلوم کو وعظ وتقریر نہ کرنے کی وجہ سے امر معروف اور نہی عن المنکر کا ترک کرنے والا اور فریضہ حج کا تارک کہہ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار شریف کی زیارت کرنے سے آپ کو مو پرست کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔علاوہ ازیں اور کئی باتیں آپ کی جانب منسوب کی جارہی ہیں جن کا یہاں احاطہ ممکن نہیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

اس مدعی کی حالت کا جائزہ تو لو کہ اس کے اندر منجانب اللہ نہ کوئی خوبی ہے اور نہ ہی کوئی کمال ہے لیکن اس کا دعوٰی تو حضرت آدم اور حضرت شیث علیہم السلام سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس مدعی کی ظاہری آرائش وزیبائش تو دیکھو اور اس کا باطن ہے کہ ظلمت وکدورت سے بھرا ہوا ہے۔اور اس کی زبان کس قدر تیز اور چرب ہے۔

اس کی شکل وصورت کی قباحت کا یہ عالم ہے کہ دیو بھی اس کو اپنا ہم شکل کہنا پسند نہیں کرتا، لیکن وہ خود کو کہتا ہے کہ میں ابدال اور اقطاب سے ہوں۔

اس کمینہ شخص کی زبان پر درویشوں کی سی باتیں ہیں جس کی وجہ سے وہ سلیمان علیہ السلام جیسے آدمی پر بھی سحر اور افسوں کر بیٹھا ہے۔

وہ درویشوں کی میٹھی میٹھی رس بھر باتین چرالیتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ گمان ہو جاتا ہے کہ کوئی بڑی کامل ہستی ہے۔

اسکی نکتہ چینی کا یہ عالم ہے کہ وہ حضرت بایزید جیسے کامل ومکمل بزرگ پر بھی جرح و قدح اور لعن طعن کر بیٹھتا ہے اور اسکی اندرونی کثافت وظلمت کا یہ عالم ہے کہ یزید جیسا فاسق وفاجر شخص بھی شرما جائے۔

جب خدا کسی کا عیب پوشیدہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو نیک لوگوں کے عیوب

اور نقائص نکالنے کے درپے نہیں کرتا۔اور جب خدا کسی کو رسوا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو نیک لوگوں کے معاملات میں انگشت نمائی و نکتہ چینی کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ہم اللہ سے ادب کی توفیق و ہدایت کے طالب ہیں کیوں کہ بے ادب شخص اللہ کے فضل و کرم سے محروم رہتا ہے۔اور بے ادب و گستاخ آدمی تنہا برباد اور ہلاک نہیں ہوتا بلکہ اپنے فتنہ کی آگ سارے عالم میں لگا دیتا ہے۔

تخریب کا یہ پہلو بھی بڑا عجیب و غریب ہے کہ طعن و تشنیع کرنے والوں کا قدم جہاں جہاں پہنچتا ہے وہاں وہاں مسلمانوں میں تفریق و انتشار اور اختلاف پھیل جاتا ہے اور یہ کوتاہ اندیشی بھی بڑی تعجب خیز ہے جو ان تنگ نظر لوگوں کی شامت کہیئے کہ بندگان نفس ان طاغتوں اور مفسدوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور کشاں کشاں خود ان ہی طاغتوں کے رہنماؤں پر طعن و تشنیع ہونے لگی ہے۔

حکیم سنائی نے سچ کہا  آنچہ یک طاعنے کند بزبان  نکند صد ہزار تیغ وزبان

ایک طاعن کی زبان سے جو تباہی و بربادی اور تخریب کاری ہوتی ہے وہ ہزاروں شمشیر و قلم سے بھی نہیں ہوتی، اگر اس جانب سے طعن و تشنیع کی ابتداء نہ کی جاتی تو اس جانب سے بھی کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تنگ نظر اشخاص خود ہی اپنے اپنے رہنماؤں کے حق میں لعن و طعن کر رہے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کیمیائے سعادت کے اصل سوم، رکن سوم میں فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص پر لعنت ہے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ بھلا ایسا کون ہوگا جو اپنے ہی والدین کو گالیاں دے۔اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ شخص ہوگا جو دوسرے کے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے تو دوسرے لوگ بھی اس کے والدین کو گالیاں دیتے ہیں۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ : چیزے کہ بخود نمی پسندی　　　باکس مکن اے برادر من

گر مادر خویش دوست داری　　　دشنام مدہ بمادر من

اے بھائی! جو بات تمہیں ناگوار اور گراں معلوم ہوسکتی ہے تو ایسی بات تم دوسروں کے لئے بھی نہ کہو۔ اگر تم اپنی ماں کو محبوب رکھتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ کوئی تمہاری ماں کو کوئی شخص گالی نہ دے تو تمہیں چاہئے کہ تم بھی کسی کی ماں کو گالی نہ دو۔

شیخ کامل زین الدین ابی بکر الخوافی "الرسالہ القدسیہ" میں فرماتے ہیں:

جو شخص لوگوں کی خطاؤں اور لغزشوں کی کھوج اور ان کی غلطیوں کی گرفت کے در پے رہتا ہے تو لوگ بھی اس کی خامیوں اور غلطیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ تو مشہور ہی ہے کہ بدی کا بدلہ بدی ہی سے دیا جاتا ہے۔

غرض بندگان نفوس، طاعن اشخاص کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور اپنے رہنماؤں پر لعن وطعن کی پاداش میں پوری نفسانیت کے ساتھ طاعن اشخاص کے رہنماؤں پر طعنہ دے رہے ہیں کہ　　شیخ یوسف بن یعقوب ابن ایوب الہمدانی جو حضرت بہاء الدین نقشبندی کے شیوخ واساتذہ کے شیخ ہیں۔ وہ تارک جمعہ تھے اور فرض نماز ین جماعت کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے جیسا کہ نفحات میں ہے۔

اور مقرب الٰہی قضیب البان موصلی جن کی تعریف وتوصیف، طاعنوں کے مشائخ کرام نے کی ہے اور جن کے ساتھ　کمال اعتقاد رکھتے تھے، انکے متعلق یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ وہ تارک صلوٰۃ تھے جیسا کہ حل الرموز میں ہے:

اور قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، فرید الحق والدین شیخ فرید الدین شکر گنج محبوب خدا شیخ نظام الدین اولیاءؒ کہ یہ سب حضرات کرام، طاعنوں کے مشائخ کے مرشد ہیں۔ سجدہ تحیت کو پسند کرتے تھے، جیسا کہ فوائد الفواد میں ہے۔

اور خواجہ عبید اللہ احرار، خواجہ عبد الباقی، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، مولانا سید ماجد سید احمد مجاہد، مولانا سید واعظ، سید محمد علی مصطفیٰ آبادی رامپوری، یہ سبھی حضرات طاعنوں کے مشائخ کرام ہیں۔ ان تمام کو کافر اور ملحد کہا جارہا ہے کیوں کہ تمام بزرگ وحدۃ الوجود اور نظریۂ ہمہ اوست کے قائل ہیں۔

اور امام ربّانی مجدّد الف ثانی، فعل حرام کو جائز قرار دینے والے ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے بعض، مکتوبات میں لکھا ہے کہ نذر شمار سید تمہاری نذر پہنچی۔ حالاں کہ غیر اللہ کے لئے نذر حرام ہے نیز امام ربانی اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بھی بدتر قرار دیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنے بعض مکتوبات میں اس کی تصریح کی ہے لہٰذا وہ خود ہی اپنے کفر کا اقرار کررہے ہیں۔ نیز امام ربانی جلد اول کے مکتوبات میں خود کو اپنے مرشد خواجہ عبد الباقی کا بندہ کہتے ہیں حالاں کہ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور خود کو غیر اللہ کا بندہ کہنا کفر ہے۔

ملا علی قاری ''مسیح الازہر'' میں فرماتے ہیں کہ عبد الغنی نام رکھنا جیسا کہ بہت مشہور ہے اس کا ظاہر کفر ہے مگر وہ اللہ کے بندے کا غلام ہونے کا ارادہ کرلے تو ٹھیک ہے۔

نیز امام ربانی مکتوبات کی جلد دوم کے ۵۸ ویں مکتوب میں بعض اولیائے کرام کا ایک ہی وقت میں متعدد جگہوں میں حاضر ہونا اور ان سے مختلف افعال کا صادر ہونا، ثابت کرتے ہیں حالاں کہ بعض علماء نے اس چیز کو کلمات کفر میں شامل کیا ہے۔

نیز امام ربانی مذکورہ مکتوب میں اہل حاجات کا آفتوں، ہلاکتوں اور حاجتوں میں زندہ ومردہ اعزاز واقارب سے استمداد طلب کرنا اور ان جگہوں میں ان اعزہ کا حاضر ہونا، اور ان حاجتمندوں کی مدد کرنا، ثابت کرتے ہیں حالاں کہ غیر اللہ سے استعانت کفر ہے اور غائب کو ندا دینا شرک ہے۔

اور امام ربانی، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا سید احمد مجاہد، وعظ نہیں

کرتے تھے۔لہٰذا وہ امر معروف اور نہی منکر کا فریضہ ترک کرنے والے تھے۔

اور امام ربانی اور سند العلماء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تارک حج تھے۔

اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قبر کے گول حلقے پر سات مرتبہ طواف کرنے کو اپنی طرف سے جائز قرار دیا ہے جیسا کہ ''الانتباہ فی سلاسل الاولیاء'' میں ہے حالاں کہ غیر کعبہ کا طواف کرنا حرام ہے۔

نیز مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے پایان قبر رخسار رکھنے کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ ''الانتباہ'' میں ہے حالاں کہ پایان قبر رخسار رکھنا گناہ کبیرہ ہے۔

نیز شاہ ولی اللہ دہلوی نے ختم قادریہ میں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للّٰہ کا پڑھنا جائز قرار دیا ہے حالاں کہ بعض علماء نے لفظ شیئاً للّٰہ کو کلمات کفر میں شمار کیا ہے۔ اور غیب کا جاننا اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور غائب کو ندا دینا شرک ہے، بس مولانا دہلوی کافر اور مشرک تھے۔ نیز مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے ختم قادریہ میں شیئاً للّٰہ الی آخرہ کو ایک سو گیارہ مرتبہ پڑھنے کی ہدایت دی ہے حالاں کہ اعداد کی تعیین بدعت ضلالت ہے۔ نیز مولانا شاہ ولی اللہ نے چلہ نشینی کے شرائط میں مراقبہ شیخ کا حکم دیا ہے جیسا کہ ''قول الجمیل'' میں ہے۔ حالاں کہ مراقبہ شیخ بدعت ضلالت ہے۔

نیز مولانا شاہ ولی اللہ تسبیح کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں اور تسبیح کی سند خیر التابعین حضرت حسن بصری تک پہنچاتے ہیں جیسا کہ ''الانتباہ'' میں ہے حالاں کہ تسبیح کا استعمال بدعت ضلالت ہے۔

نیز مولانا شاہ ولی اللہ نے اپنی دو کتابیں ''الانتباہ'' اور قول الجمیل'' میں اور مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں ذکر لطائف ستہ، اور شغل یک ضربی، اور دو ضربی، اور سہ ضربی، اور چہار ضربی، اور سلاسل چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے دیگر اشغال

وغیرہ کو سُپرد قلم کیا ہے حالاں کہ یہ سب کام گمراہ کن بدعت ہے۔

اور سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سرور انام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کے دن خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، امام حسین علیہ السلام اور اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سالانہ مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور ماحضر پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور بادشاہ دہلی (غالباً بہادر شاہ ظفر) کی دعوت میں فاتحہ رجب کا کھانا کھاتے ہیں اور جن و پری کے مرثیے سنتے ہیں حالاں کہ یہ سارے امور بدعت اور ضلالت ہیں۔

اور مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی اپنی کتاب **''صراط مستقیم''** میں فرماتے ہیں کہ اموات کے لئے نذر و نیاز کے صحیح اور جائز ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، حالاں کہ غیر اللہ کی نذر کے حرام اور قبیح ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی نے ''صراط مستقیم'' کے چوتھے باب میں خود کو سید احمد مجاہد کے آستانے کو بوسہ دینے والوں میں شمار کیا ہے۔ حالاں کہ آستانہ اور دہلیز کو چومنا اور بوسہ دینا حرام ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے مقدمہ میں حُب نفسانی کو جو کہ عشق سے ملقب ہے، مبدأ ولایت کہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ چیز دماغی امراض اور نفسانی عوارض سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ طب کی کتابوں میں ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی تنبا کو کھاتے ہیں اور کثرت سے ناس استعمال کرتے ہیں حالاں کہ ناس کا استعمال بدعت ضلالت ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل نے ''صراط مستقیم'' کے پہلے باب میں **ھوالاول والآخر والظاھر والباطن** اور **وھوبکل شئی محیط** کی آیت کو اور **لوولیم بحبل الی الارض السابعة السفلی لھبط اللہ** والی حدیث کو وحدۃ الوجود کے اثبات میں بطور

دلیل سپرد قلم کیا ہے۔

نیز یہ تحریر کیا ہے کہ طالب کے نفس کامل سے انا الحق اور **لیس فی جبتی سوی الله** کے فقرات اور جملوں کا صدور صحیح و درست ہے لہٰذا مولانا ملحد ور کافر ہیں۔

نیز شاہ اسمٰعیل مذکورہ باب ہی میں اپنے جد اور اپنے مشائخ کے شیخ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کو کعبہ لکھتے ہیں شاہ صاحب انسان ہیں اور کعبہ جماد ہے اور آپ ہندوستان میں ہیں اور کعبہ عرب میں ہے اور مولانا سید احمد مجاہد بے علم تھے۔ کیونکہ ان کے صحیح علم کی انتہا کافیہ تک ہی ہے اور دینی علوم جو کہ تفسیر اور حدیث اور فقہ ہے ان کی تحصیل انہوں نے نہیں کی، ہاں! علم لدنی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن علم لدنی شریعت سے خارج ہے کیونکہ چاروں شرعی دلائل ( کتاب اللہ، سنت رسولؐ، اجماع، قیاس ) میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

نیز مولانا سید محمد علی مصطفیٰ آبادی رامپوری مو پرست تھے کیونکہ وہ آثار شریعت کی زیارت کیا کرتے تھے نیز مولانا مصطفیٰ آبادی بڑی رغبت اور خواہش کے ساتھ جھینگہ تناول فرماتے ہیں حالاں کہ علماء کی اکثریت اس کے کھانے کو حرام کہتی ہے۔

نیز مولانا مصطفیٰ آبادی تارک حج تھے اور بدعتی تھے کیوں کہ وہ ناس استعمال کرتے تھے دوسرے اور تیسرے روز بیسواں اور چہلم وغیرہ کے دن قبر کی زیارت کے لئے جاتے تھے۔ اور بیسواں، چہلم، برسی اور رجب کا کھانا کھاتے تھے اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل بدعت میں شریک ہوتے اور صلوٰۃ وسلام کے وقت قیام کرتے تھے۔

سید محمد برزنجی شافعی جنکا شمار مدینہ منورہ کے مشاہیر علمائے کرام میں ہوتا ہے اپنی کتاب ''الضارم الہاشم'' میں فرماتے ہیں۔

کسی شخص کے مجدد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ایک صدی گذر جائے اور پھر یہ تجدید بھی ہزار سال میں ہو اور اس کا مقام، علم وفضل کے ذریعہ نمایاں ہو اور اس کے کلام

سے سنت کی حمایت ہواور اس کو فن حدیث میں ثقاہت کا درجہ حاصل ہواور اگر وہ اہل بیت سے ہوتو سونے پر سہاگہ ہے۔

اور شیخ سرہندی علم میں مشہور ومعروف نہیں اور علم سے ہماری مراد علم شریعت ہے جو تفسیر، حدیث اور فقہ پر مبنی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر علم کا کوئی اثر نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی تصنیف و تالیف ہے صرف مکتوبات ہیں۔ اور ان کا اکثر و بیشتر حصہ شطحیات اور واہیات سے بھرا ہوا ہے۔

اور ہم نے دیکھا کہ ان کے فرزند محمد سعید نے سنت کی اہانت اور تحقیر کی۔ اور اپنے باپ شیخ سرہندی کے قول کی تائید میں اشارہ سبابہ کی حدیث کو رد کیا، کاش وہ اپنے باپ کے موقف کی حمایت نہ کرتے اور حدیث کو رد نہ کرتے اور پوری طرح سے اپنے باپ کی تقلید نہ کرتے تو ان کے والد پر کوئی بات آتی اور نہ خود ان پر کوئی الزام عائد ہوتا۔ اور شیخ سرہندی کو اہل بیت نبویؐ سے نسبت کا شرف بھی حاصل نہیں۔ پھر بھلا کیوں کر وہ اپنے مجدد ہونے کے مدعی ہیں اور اس نام سے موسوم ہونے کے لئے دلیل کیا ہے؟ **ان ھی الا اسماء سمیتو ھا انتم وابا کم۔**

نیز سید محمد برزنجی شافعی کتاب مذکور میں فرماتے ہیں۔ ہم نے شیخ سرہندی کے مکتوب کا مطالعہ کیا جو منکرات سے لبریز ہیں مثلاً کعبہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہے حالاں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوقات میں افضل ہیں اور حقیقت محمدیہؐ ایک ہزار سال بعد احمدیہ کی جانب منتقل ہو جاتی ہے اور اس سے متحد اور منسلک ہو جاتی ہے اور حقیقت محمدیہ، حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے زمانے تک خالی پوست کی حیثیت سے باقی رہ جائیگی۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مکمل طور پر خلیل تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محبوب تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول **کما صلیت علیٰ ابراھیم** کے ذریعہ خلیل ہونے کی دعا مانگی۔

اور بے شک مجدد کے مقام کا حصول آپ ﷺ کی امت کے ایک شخص کی وساطت پر موقف ہے اور یہ چیز ایک ہزار سال کے بعد اسے حاصل ہوگئی۔

اس طرح شیخ سرہندی نے اپنی ذات کی جانب اشارہ کیا، اس طرح اور بھی خرافات ہیں۔ شاید وہ اپنی ذات سے متعلق فرماتے ہوں کہ انہیں دین کی تجدید کے لئے مبعوث کیا گیا ہے، اس قسم کے عقیدہ کی صراحت میں تلوار کا خوف لاحق ہوگیا، جس کی وجہ سے انہوں نے رمز واشارہ کی زبان میں یہ کہہ دیا کہ اپنے متبعین ذہانت وفطانت کی راہ سے سمجھ لیں۔ ہم گواہ ہیں کہ تم اس قسم کے دعوؤں میں جھوٹے ہو۔

نیز سید محمد برزنجی شافعی نے ایک اور کتاب "**قدح الزند فی رد جھالات شیخ السرھند**" بھی تصنیف کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سی کتابیں امام ربانی کی تردید میں سپرد قلم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی ان کے تردیدی اور تنقیدی رسائل ومکتوبات ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔

حاصل کلام دونوں جماعتوں کے یہ طاعن اشخاص غالی شیعوں کی طرح تبرّا کے بغیر دوستی ومحبت کو پسند نہیں کرتے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کے بزرگان کرام پر تبرا کرنے میں اور نفرت ظاہر کرنے میں پوری طرح سعی وکوشش کر رہا ہے۔ غیب جوئی اور طعنہ زنی کی یہی وہ بری خصلت جس کی وجہ سے نواصب (دشمنانِ علی رضی اللہ عنہ کا ایک گروپ) اور خوارج کا گروہ، "اہل بیت" کرام کی طعن وتشنیع کے درپے ہوا اور شیعہ وروافض کے گروہ نے صحابہ کرام کی طعن وتشنیع میں اپنے سیاہ قلوب کی طرح ہزاروں صفحات سیاہ کر ڈالا اور ان خصومات کا فیصلہ حاکم حقیقی کے روبرو قیامت کے دن ہوگا۔

دو مدعیوں کے دعویٰ کے بغیر قضاعلی الغائب بلکہ **قضا علی المیت** کا کردار ادا کرر ہے ہیں اور باوجود اس کے کہ حکم کے وقت حق بقدر رسید کی گنجائش وصلاحیت نہیں رکھتے ہیں اور گذرے ہوئے لوگوں کے جھگڑے اور خصومات کے فیصلہ میں اپنی عزیز اور قیمتی عمر ضائع کرر ہے ہیں۔عبدالحمید مغربی ناصبی نے ہم چومن دیگرے نیست، کے زعم کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ وحسینؓ اور دیگر اہل بیت کرام کے بزرگوں پر طعن وملامت میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے اور ابن مطہر حلّی شیعی ہمہ دانی کے فخر و پنداء کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ ذی النورین اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام پر طعن ولعن میں ضخیم کتاب تحریر کی ہے۔

حاصل کلام! طاعن جو بھی ہو وہ ظالم ہے اور طعن و تشنیع اور لعن کی ابتداء کرنے والا بہت بڑا ظالم ہے۔دونوں جماعتوں کے طاعن اشخاص کی عقل وفہم کا قصور ہے کہ اس طرح کے امور کو قابل لعن وطعن سمجھ رہے ہیں۔تلاش وتفحص کے وقت یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ جانبین سے طعن کرنے والے اصلی نہیں ہیں۔کیوں کہ ان کے مطعون اکابرین کرام کا بدعت کو ختم کرنا، سنت کو زندہ کرنا، سخت آزمائش کے حالات میں عزیمت کو اختیار کرنا ایک معروف اور عام بات ہے اور ان کا علم وعمل ورع وتقویٰ اور دیانت وثقاہت یہ ساری چیزیں مشہور اور معروف ہیں اور ان بزرگان دین کے قلوب ونفوس، نفسانیت کی آلائشوں اور نفس کی کدورتوں سے منزہ ومبرا ہیں لہٰذا یہ تمام حضرات کرام اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے گا، اگر اس کے باوجود بھی عیب شمار کئے جائیں تو دونوں جماعتوں کے طاعن اشخاص کا دائرہ تنگ ہو جائے گا جیسا کہ طرفین کے طاعن افراد سے ظاہر ہوا۔

عوام کو چاہیئے کہ اولاً اہل سنت وجماعت کے کتب کلامیہ کے مطابق اپنے عقائد کو صحیح و درست کرلیں اور اس کے بعد فرض، واجب، سنت، مندوب، حلال، حرام، مکروہ اور مشتبہ کو اہل سنت و جماعت کے فقہاء کرام کے منہاج وطریق پر جان لیں تا کہ مطعون

حضرات کی مراد کو سمجھ سکیں۔

؎ ہست سنت رہ جماعت چون رفیق　　　بے رہ بے یار افتی در مضیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، دین کی شاہراہ ہے اور جماعت صحابہ اس راہ کے رفیق ہیں۔ لہٰذا جو شخص بھی بغیر راہ (سنت) اور بغیر رفیق (جماعت) کے رواں دواں ہوجائے تو وہ تنگی و مصیبت میں پھنس جائیگا اور گمراہ ہوجائے گا۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ طاعن اشخاص سنت و جماعت کے صراط مستقیم سے علیٰحدہ بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اور استنباط کے دعویٰ کے ساتھ ائمہ اربعہ کی رائے کے خلاف کتاب و سنت سے احکام اخذ کرتے ہیں اور اہل سنت جماعت کے رہنماؤں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور بندگانِ نفوس کو اپنے بزرگ رہنماؤں پر لعن طعن کے لئے آمادہ کررہے ہیں۔

؎ دوستی بے خرد خود دشمنی است　　　ناسمجھ اور بے عقل آدمی کے ساتھ دوستی رکھنا خود اپنی ذات کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

اگر اللہ نے چاہا تو طاعن کے جواب اور بعض دوسرے طاعن افراد کا جواب بھی آئندہ آنے والے فوائد میں بعض پیچیدہ مباحث کے ضمن میں اشارتاً یا صراحتاً دے دیا جائے گا اور مندرجہ رسائل کے مطاعن کا جواب تردیدی کتابوں میں تلاش کیا جائے اور بقیہ جوابات کو بھی ان ہی پر قیاس کرلیا جائے لیکن کوئی شخص بھی طاعن شخص کے جور و ستم سے بچ نہیں سکتا۔ حضرت جامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ زبان کے ظلم سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا، اگرچہ کہ وہ حق نما اور حق پرست بزرگ آدمی ہی کیوں نہ ہو۔

اے عزیز اگر تو فرشتہ کی طرح آسمان پر بھی جائے تو بدگمان شخص تجھ کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتا ہے یعنی کسی حال میں بھی بداندیش کی بدگمانی اور فتنہ پرور کی فتنہ انگیزی ختم نہیں ہوتی اپنی کوشش سے دریائے دجلہ کا منہ بھی بند کرسکتا ہے لیکن ایک بداندیش کے منہ کو بند نہیں کرسکتا۔

لٰہذا تو کسی حالت میں بھی حق بات کہنے سے روگردانی نہ کر، تیرے بارے میں جو بھی کہا جائے اس کی جانب دھیان اور توجہ نہ دے، اگر لوگ تجھ سے ناراض رہیں اور تجھے برا بھلا کہیں تو اس کی پرواہی نہ کر، اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی رہے یہی بہت بڑی نعمت ہے۔

طرفہ طرازی تو یہ ہے کہ طاعن اشخاص اس افراط وتفریط اور تضلیل وتکفیر کے ساتھ اپنے سنی ہونے کا دعویٰ بھی ترک نہیں کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت کے لباس میں اس طعنہ زنی اور بیخ کنی کے ذریعہ ایک عالم کے لئے راہ ہموار کررہے ہیں۔ یہ فقرہ تو ان کے حسب حال ہے **ھم ذیاب علیھم الثیاب** (انسان کی شکل میں درندہ ہیں۔)

اہل سنت وجماعت کے مذہب میں اختلافی مسائل کے اندر ایک دوسرے کی تکفیرو تضلیل کی گنجائش نہیں ہے اور کسی مختلف فیہ مسئلہ میں ایک دوسرے کی عیب جوئی ونکتہ چینی نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہرایک کو اپنے اپنے حال اور اپنے اپنے موقف پر چھوڑ دینا چاہئے۔ **فربکم اعلم من ھو اھوٰی سبیلا** ۔

شب گربہ سموری نماید　　　　زنگی بچہ حوری نماید

شب میں بلی سمور نامی جانور دکھائی دیتی ہے اور زنگی بچہ بھی حور سا دکھائی دیتا ہے۔

دین میں طاعن کی رخنہ اندازی ملحد اور بدعتی شخص کے رخنہ سے کہیں زیادہ بدتر ہے اور ان دونوں کا فساد، کافر کے رخنہ سے کہیں زیادہ بدتر ہے کیوں کہ کافر باہر کا دشمن ہے اور ملحد وبدعتی اندر اور گھر میں بسنے والے دشمن ہیں اور طاعن جو اہل سنت وجماعت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، وہ درحقیقت ہم خوابہ (ساتھ سونے والا، مراد دشمن) کا حکم رکھتا ہے۔

حضرت جامی فرماتے ہیں:

بار بدفسوں اور افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ تیرا ہم نشین اور ہم خانہ ہے تو پھر بھلا کیوں کر تو اس کے مکروفریب سے محفوظ رہ سکتا ہے، یہ کافی ہے کہ کوئی شخص خون جگر پی لے

تا کہ آدمی کا جوہر آشکار ہو سکے۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ ''الانتباہ'' میں ایک بزرگ سے حکایت بیان کرتے ہیں۔

ہزاروں بھوکے بھڑیئے، بکریوں کے ریوڑ میں جو فتنہ وفساد، تباہی و بربادی اور ہلاکت پیدا کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فساد ایک انسان نما شیطان پھیلاتا ہے اور ہزاروں شیاطین سے جو فتنہ پھیل سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ فتنہ ایک برے ہم نشین کے ذریعہ پھیلتا ہے اور ہزاروں برے ہم نشین جو فساد پھیلا سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فتنہ وفساد آدمی زاد جسم میں نفس کرتا ہے، گویا نفس کا فتنہ سب سے زیادہ خطرناک اور بھیانک اور سارے فتنوں سے بڑھ کر ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک برا ہم نشین دوست جب نفس کے ساتھ دوست ہو جائے تو کیا بلائیں اور ہلاکتیں پیدا کر سکتا ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ ان دونوں گروہوں میں ہر ایک گروہ دوسرے گروہ کے بزرگوں پر لعن طعن کرنے میں افراط وتفریط، غلو وتشدد اور تعصب کی راہ پر گامزن ہے اور توسط واعتدال اس فقیر کے نصیب ہے جسکو یہ ہدایت وتوفیق ملی کہ وہ اگلے لوگوں کی برائیوں کا ذکر کرنے سے اور گذرے ہوئے لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے محفوظ ہے۔

حافظ سید نور الدین سمہوری نے ''جواہر العقدین'' میں ایک حدیث نقل کی ہے۔

**فی کل خلفٍ من اُمتی عدول من اهل بیتی یتقون عن هٰذا الدین تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاهلین۔**

میری اُمت کے ہر پچھلے دور میں میرے اہل بیت میں عادل، ثقہ اور نیک لوگ ہوں گے جو دین کو غلو پسند اشخاص کی تحریف وتبدیل سے اور باطل افراد کی حلیہ سازی و دین سازی سے اور جاہل لوگوں کی تاویل سے محفوظ رکھیں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا شمار بھی ان ہی نیک عادل

اور ثقہ لوگوں میں ہوگا اور میں بھی لوگوں کو افراط وتفریط، غلو وتعصب سے باز رکھوں گا۔ انشاء اللہ المتعان۔

واضح رہے کہ یہ مفید کتاب تالیف کرنے کا سبب عوام کی افراط وتفریط اور راہ اعتدال سے بھٹکے ہوئے بھائیوں کی اصلاح ہے اور اس کا نام فصل الخطاب رکھا گیا ہے، جو در حقیقت خطا اور صواب کے درمیان فرق کو واضح کرنے والی ہے اور اس کو چالیس فوائد (ابواب) میں منقسم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب ہر مبتدی کے لئے روشنی اور ہر منتہی کے لئے نصیحت ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو توفیق و ہدایت عطا فرمائے کہ وہ شریعت مطہرہ کے صراط مستقیم پر چل سکیں اور افراط وتفریط سے محفوظ رہ سکیں۔ **انہ قریب مجیب وھو علی کل شئی قدیر۔**

اب میں یہاں سے بنام خدا اپنے مقصود کی وضاحت شروع کر رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۱)

## (۱) شرعی دلائل چار ھیں

## کتاب اللہ، سنت رسول، ۔ اجماع، اور قیاس مجتھدین

دلائل شرعیہ سے متعلق ہے۔ شرعی دلیلیں چار ہیں کتاب اللہ، سنت رسولؐ، اجماع اور مجتہد کا قیاس جو مذکورہ تین شرعی دلائل سے مستنبط ہو، جیسا کہ اس کی تفصیل کتاب کے پہلے مقدمہ میں گذر چکی ہے۔ اصول کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ قرآن کریم، تمام احکام شرعیہ کا جامع ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اپنے

۵۵ ویں مکتوب جلد ثانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جمیع احکام شرعیہ بلکہ تمام گذری ہوی شریعتوں کا جامع اورلبِ لباب ہے، اس باب میں انتہا یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کے بعض احکام اس قسم کے ہیں جن کا معنی ومفہوم، عبارت نص، دلالت نص، اشارۃ نص، اور اقتضائے نص سے سمجھا جاتا ہے۔یعنی قرآن ظاہری عبارت یا اس کے اشارے، کنائے یا اس کے ایک دوسرے پر دلالت کرنے والے مفہوم یا اس کے تقاضوں سے پہچانا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اہل لغ تقاضوں سے پہچانا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اہل لغت کے عوام وخواص دونوں تقریباً برابر ہیں۔

اور احکام شرعیہ کی دوسری قسم بھی اپنی پہلی قسم کی قبیل سے ہے مگر اس کے معنی اور مفہوم کو اجتہاد اور استنباط کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔اور یہ فہم اور سمجھ بوجھ جو سردار ہے، ائمہٗ مجتہدین ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔اور آپؐ کے اصحاب کرام اور جمہور علماء وفقہاء کے قول کے مطابق آپؐ کی پوری امت کے مجتہدین بھی اس فہم اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے سردار ہیں اور ان کے سردار خود حامل شریعت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک، جو نزول وحی کا زمانہ تھا اس میں اجتہادی احکام خطا اور صواب کے شک وشبہ سے بالاتر ہیں بلکہ وحی قطعی کی وجہ سے محق (وہ شخص جسی جانب حق ہو) کے درست ہونے کو مخطی (وہ شخص جو ارادہ نیکی کا کرے اور اچانک و بے قصد اس سے خطا سرزد ہو جائے) کی خطا ولغزش سے صاف صاف تمیز کی جاسکتی تھی اور حق کے ساتھ باطل کی آمیزش کسی حال نہیں ہوتی تھی کیونکہ کسی خطا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی صحیح نہیں بلکہ ناممکن ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ اصلاح فرما دیتا ہے۔

اس کے برخلاف وہ احکام جو انقطاع وحی کے بعد مجتہدین کے اجتہاد اور استنباط کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں، یہ خطا اور صواب کے درمیان متشکّی ہیں، یعنی ان احکام میں خط اور صواب دونوں کا احتمال ہے، اسی لئے اجتہادی احکام جو زمانۂ وحی میں طے شدہ تھے، وہ

موجب یقین ہیں۔ جن پر عمل اور اعتقاد دونوں صحیح اور مفید ہیں، اور زمانۂ وحی کے بعد طے ہونے والے اجتہادی احکام، یہ موجب ظن ہوں گے موجب یقین نہیں جو عملاً تو مفید ہیں، اعتقاداً نہیں۔

قرآنی احکام کی تیسری قسم اس قبیل سے ہے کہ بشری طاقت اس کے فہم وادراک سے عاجز ہے، جب تک کہ خود احکام کے نازل فرمانے والے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا علم وآگہی نہ ہو تو ان احکام کی سمجھ بوجھ کا تصور بھی نہ ہو سکے گا۔ گو کہ یہ احکام قرآن کریم سے ماخوذ ہیں اور مستفاد ہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا فرد اس کا اہل نہیں ہے اور اسکو یہ علم وآگہی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا حصول صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، بہر حال جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان احکام کو ظاہر کرنے والی صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے تو لامحالہ ان کو سنت رسولؐ کے ساتھ منسوب کرنا پڑا کیونکہ ان کی مظہر سنت ہی ہے۔ اس رنگ میں جب اجتہادی احکام کو قیاس کے ساتھ نسبت کریں تو اس حیثیت سے قیاس خود احکام کو ظاہر کرنے والا بنا۔ (جس طرح آپؐ کی ذات گرامی احکام کو ظاہر کرنے والی بنی اسی طرح قیاس بھی احکام کو ظاہر کرنے والا بنا) اب نتیجہ یہ نکلا کہ سنت اور قیاس یہ دونوں بھی احکام کو ظاہر کرنے والے ہیں اگر چہ کہ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ایک تو ان میں کا قیاس ہے جو محض رائے پر بھروسہ کرنا ہے اور جس میں خطا ونسیان کا احتمال موجود ہے، اور دوسرا مظہر سنت ہے جو حق جل وعلا کا عطا کردہ اور بتلایا ہوا ہے جس میں خطا کی کسی طرح گنجائش نہیں ہے اور یہ دوسری قسم یعنی سنت رسولؐ اصل کتاب (کتاب اللہ) کے ساتھ کمال مشابہت ومماثلت رکھتی ہے اور گویا مثبت احکام ہے اگر چہ کہ فی الحقیقت جمیع احکام کی مثبت وہی کتاب اللہ ہے۔

واضح ہو کہ اجتہادی احکام میں ایک غیر نبی پیغمبرؐ خدا کے ساتھ اختلاف کرنے کی

گنجائش، اور طاقت رکھتا ہے، جب کہ وہ اجتہاد کے مرتبہ کو پہنچ چکا ہو۔ یعنی ایک مجتہد اپنے اجتہادی مسائل میں پیغمبر خدا کے ساتھ اختلاف رائے کا مجاز ہے اور وہ احکام، جو قرآن کریم کی ظاہری عبارت یا اس کے اشاروں، کنایوں اور یا اس کے دال مدلول سے ثابت ہوں۔ اور اس طرح وہ احکام جن کا ظہور سنت رسولؐ سے ثابت ہو۔ ان دونوں قسم کے احکام میں کسی ایک کی بھی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان احکام کی پیروی کرنا ساری امت کے لئے لازمی وضروری ہے۔ پس امت کے مجتہدین کو اپنے اجتہادی احکام ہی میں پیغمبرؐ خدا کی رائے کی متابعت و پیروی لازم نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی اجتہادی رائے کو قرار پکڑے اور اسی پر قائم رہے۔ مجتہد اور مقلد کے احکام اور اقسام کی تفصیلی بحث مقدمات میں گذر چکی ہے۔ وہیں دیکھ لیں۔؛

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان کے نزدیک رفع یدین، تکبیر تحریمہ کے سوا مکروہ ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مسنون ہے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں۔

واضح ہو کہ تکبیر تحریمہ کے سوا ہاتھوں کو اٹھانے کے بارے میں حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان اختلاف ہے اور دونوں کے پاس احادیث و آثار موجود ہیں، اور اس مسئلہ میں درست اور ٹھیک موقف یہ ہے کہ دونوں (یعنی رفع یدین اور عدم رفع یدین) پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل رہا ہے، کبھی اس پر اور کبھی اس پر اور صحابہ کرام میں سے ہر صحابی نے جو دیکھا اس کو روایت کر دیا، یا ممکن ہے کہ رفع یدین ابتداء میں رہا ہوگا اور آخر میں ترک کر دیا گیا ہو، اور بڑے بڑے صحابہ کرام رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو قرآن وحدیث اور اس کے احکام کے جید عالم تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے متفق و باخبر تھے اور سفر وحضر میں حضورؐ اکرم کے حاضر باش اور ساتھ ساتھ رہنے والے خادم خاص تھے انہوں نے سوائے تکبیر تحریمہ کے نماز میں کہیں رفع یدین

ہیں فرمایا اور یہ بظاہر احتمال ثانی پر موقوف ہے یعنی رفع یدین ابتداء میں موجود اور انتہاء میں منسوخ پر محتمل ہے۔

نیز امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ' نے عدم رفع الیدین کی روایت فرمائی ہے۔ ولو بالفرض دونوں صورتوں رفع یدین اور عدم رفع یدین کو تسلیم کرلیا جائے تو اس صورت میں عدم رفع یدین کی روایت ہی راجح اور غالب ہوگی، کیونکہ اس میں سکون زیادہ ہے اور سکون کو نماز کے خشوع وخضوع سے مناسبت زیادہ ہے۔ اس مقام میں کلام بہت وسیع ہے اور ہم نے اس کی تفصیل ''شرح سفر السعادۃ'' میں پیش کی ہے۔

اور اسی طرح شیخ الہند شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب ''فتح المنّان فی تائید مذہب النّعمان'' میں بہت ساری احادیث اور آثار کی روشنی میں امام اعظمؒ کے مذہب ومسلک کو مستند طریقے سے بیان فرمایا ہے۔ اور کتاب کافی، ''کفایہ'' ''شرح مختصر دقایہ'' ''عنایہ'' ''نہایہ'' ''تبیین الحقائق'' اور ''بحر الرائق'' وغیرہا کے مصنفین کرام نے صحیح احادیث اور قوی اسناد کے ذریعہ امامِ اعظمؒ کے مذہب کو ثابت کیا ہے۔ نیز ''نظام الاسلام'' کے مصنف علاّم نے بھی امام اعظم کے مذہب کو گیارہ سندوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ان اختلافی مسائل میں بعض لوگوں کی گستاخی و بے ادبی اور طغیانی وسرکشی بھی دیکھنے میں آئی جو ایک طرف تقلید اور اپنے حنفی ہونے کے مدعی بھی ہیں تو دوسری طرف امام شافعی علیہ الرحمہ کے مسلک کے قریب ونزدیک بھی انہوں نے محض مشکوٰۃ شریف کی چند ظاہری حدیثوں پر نظر کیا اور نفس مسئلہ کی تہہ تک پہنچے بغیر ہی شوافع کے مسلک کو راجح قرار دینے کی ٹھان لی۔ اور یہ نہیں غور کیا کہ ان کو اس کے اندر اپنے مسلک و مذہب کی حدیثیں جمع کرنا ہی اصل کام تھا۔ ہم نے اپنے چوتھے مقدمے میں یہ حقیقت بیان کردی ہے، کہ کسی مقلد کو ایک مسلک پر دوسرے مسلک کو ترجیح دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔

غرض اس مسئلہ میں عوام کی ٹولی نہ صرف مسلک کی ترجیح میں الجھی ہوئی ہے بلکہ ان دونوں امام عالی مقام (حضرت امام ابوحنیفہؒ وحضرت شافعیؒ) کے اجتہاد کے درمیان میں خود ہی حکم (جج) بنی ہوئی ہے۔ اور مزید طرفہ طرازی یہ ہے کہ امام اعظم کے قول کے باطل ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور آپ کے قول کو سنت کے خلاف بھی کہہ رہی ہے۔ جبکہ اصل حقیقت حال یہ ہے کہ ایک مجتہد کا قیاس دوسرے مجتہد کے قیاس کو خود باطل نہیں کرسکتا تو پھر بھلا کسی مقلد کے قیاس سے مجتہد کا قیاس کیونکر باطل ہوسکتا ہے، اس کی تفصیل ہم نے اپنے پانچویں مقدمہ میں بیان کی ہے۔ دیکھ لی جائے اور یہی نہیں بلکہ یہ ٹولی تو حنفیوں کو رفع یدین کا حکم بھی دے رہی ہے اور ساتھ ہی امام اعظم ابوحنفیہ کو صاحب الرائے بھی کہنے لگی ہے۔ حالاں کہ رفع یدین کا ترک کرنا ان کے اجتہاد سے ثابت ہے جیسا کہ اسکی وضاحت گذر چکی۔ کبرت کلمة تخرج من افواهھم ان یقولون الا کذبا۔ یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔ یہ لوگ تو جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔

امام ربانی اپنے ۵۵ ویں مکتوب جلد دوم میں امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان کے حالات کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں کہ:

ورع وتقویٰ کی برکت وتاثیر اور سنت نبویؐ کی متابعت و پیروی کی بدولت امام اعظمؒ نے اجتہاد و استنباط کے بلند ترین مقام کو پالیا کہ دوسرے مجتہدین آپ کی اس فہم وبصیرت سے عاجز ہیں۔ اسی لئے آپ کے اجتہادی واستنباطی مسائل واحکام کی دقتوں وباریکیوں تک جب ان کی فہم وادراک نہیں پہنچ سکی، تو معانی کی دقت وباریکی کی وجہ سے ان مسائل کو کتاب وسنت کے مخالف سمجھ لیا اور امام اعظم کو اور آپ کے اصحاب کو اصحاب الرائے خیال کیا۔ اور یہ سب کچھ آپ کے علم اور درایت کی حقیقت اور تہہ تک، نہ پہنچنے کا نتیجہ ہے، اور آپ کی فہم وفراست سے غافل ہونے کا سبب ہے۔ امام شافعیؒ جنہوں نے آپ کی فقاہت کی

باریکی و دقت کی بو باس محسوس کی اور امام ابوحنیفہ کے بارے میں جب ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ: الفقھا کلھم عیال ابی حنیفةؒ تمام فقہاء ابوحنیفہ کی اولاد ہیں یعنی سارے فقیہہ حضرت ابوحنیفہ کی فقاہت کے خوشہ چیں اور جرعہ کش ہیں۔ افسوس ہے، ان کوتاہ بینوں کی جرأت اور جسارت پر جنہوں نے جان بوجھ کر اپنے قصور اور نقص کو بڑی بے باکی کے ساتھ دوسروں کے سر تھوپ دیا۔

قاصرے گر کند ایں طائفہ را طعن قصور　　　حاش للہ برارم بزبان ایں گلہ را

ہمہ شیرانِ جہاں بستہ ایں سلسلہ اند　　　روبہ از حیلہ چساں بگدایں سلسلہ را

کوئی تنگ نظر اس حنفی جماعت کو قصور مند ٹھہرا رہا ہے تو معاذ اللہ مجھے اسکی یہ بات نقل کرنا بھی گوارا نہیں ہے۔ دنیا جہاں کے سارے شیر جب اس تقلیدی قلادہ میں بند ہوئے ہیں تو ایک مسکین لومڑی اپنی حیلہ سازی سے اس مضبوط رسی کو توڑ دے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ مطلب یہ ہے کہ مقلدین شیر صفت ہیں اور مذبذبین، رُوباہ مزاج لوگ ہیں جو استقلال و استقامت کے بجائے ادھر ادھر بھاگ نکلنے کے عادی ہیں۔

نیز اس مکتوب میں لکھتے ہیں کہ بغیر کسی تکلف وتعصب کے کہا گیا ہے کہ حنفی مذہب کی نورانیت کشف کے ذریعہ ایک عظیم دریا کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، اور دوسرے مذاہب اس کے مقابل میں حوضوں اور نہروں کے مانند نظر آتے ہیں۔ اور کشف والہام سے قطع نظر ظاہری طور پر بھی یہ حقیقت پوری طرح واضح روشن ہے کہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت قریباً پونا حصہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی متبع اور پیروکار ہے، اور یہ حنفی مذہب اپنے متبعین کی کثرت کے ساتھ ساتھ اصول اور فروع میں بھی سارے مذاہب سے ممتاز اور جداگانہ ہے۔ اور اجتہاد و استنباط میں اس کی شان ہی علحدہ ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ بات بھی مبنی برحقیقت ہے کہ امام اعظم کا سنت کی اتباع و پیروی میں عجیب انداز ہوتا ہے وہ سب

سے آگے آگے اور مقدم رہتے ہیں (ان کی نگاہ سے کوئی حدیث چھوٹنے نہیں پاتی) مرسل حدیثوں کو (عملی طور پر) مُسند حدیثوں کا درجہ دنیا اور مراسیل کو اپنی رائے پر مقدم رکھنا یہ ان ہی کا انداز اور طریقہ ہے۔ اور اسی طرح آپ ایک صحابیؓ رسول کے قول کو شرف صحبت نبویؐ کی وجہ سے اپنی رائے پر مقدم رکھتے ہیں۔ حالاں کہ دوسرے ائمہ آپ کی طرح یوں مقدم نہیں رکھتے۔ ایک طرف تو ان مخالفین نے امام اعظم کو صاحب الرائے قرار دیا اور ایسے الفاظ آپ کی جانب منسوب کئے جو سوء ادب پر مبنی ہیں اور دوسری طرف ان مخالفین نے آپ کے کمال علم ونور اور تقویٰ وطہارت کا اعتراف اور اقرار بھی کیا ہے۔ اللہ ہی ان کو ہدایت اور توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین اسلام کے عظیم ترین قائد وسردار کے درپے آزار نہ ہوں اور دنیائے اسلام کی بڑی جماعت (احناف) کے دلوں کو تکلیف نہ دیں۔ یریدون لیطفئو انور اللہ بافواھھم (منافقین یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نور (ھدایت) کو اپنے منہ کی پھونک سے بجھادیں۔ جس طرح یہ ناممکن ہے، اسی طرح ان کے یہ فاسد خیالات کو بھی ناممکن سمجھو)

جس گروہ نے حنفی اکابرین پر اصحاب رائے ہونے کا الزام عائد کیا ہے، وہ فی الواقع اگر یہی اعتقاد رکھتا ہے کہ حنفی ائمہ مجتہدین، کتاب وسنت کے بجائے خود اپنی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں تو اس زعم باطل اور خیال فاسد سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ دنیائے اسلام کا سوادِ اعظم گمراہ اور بدعتی ہے بلکہ اسلام کے زمرے ہی سے خارج ہے۔ اس قسم کا اعتقاد یا تو وہ جاہل رکھ سکتا ہے جو اپنی جہالت سے بے خبر ہو، یا وہ زندیق جسے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا مقصود ہو۔

بعض کوتاہ بین ناقص لوگ ایسے بھی ہیں، جنہوں نے چند حدیثوں کو یاد کیا ہے اور سارے احکام شرعیہ کو ان ہی کے اندر منحصر سمجھ لیا ہے اور اپنے محدود علم کے سوا دوسرے تمام معلومات کی نفی کردی ہے۔ احکام شرعیہ کو ان ہی کے اندر منحصر سمجھ لیا ہے اور اپنے محدود علم

کے سوا دوسری تمام معلومات کی نفی کر دی اور انہیں جس مسئلہ کا ثبوت نہ ملا، تو بڑی آسانی کے ساتھ اس کا انکار کر دیا ہے۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہان است زمین و آسمانِ اوہمان است

وہ کیڑا جو کسی پتھر کے نیچے رہتا ہے وہ اپنی محدود معلومات کی بنا پر یہی سمجھتا ہے کہ یہ زمین وآسماں سب کچھ اتنا ہی ہے جتنا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح اس کیڑے کی محدود معلومات تھیں، اسی طرح ان ناقص لوگوں کی معلومات ہیں۔

افسوس صد افسوس ان متعصبین پر اور انکی بری نگاہی پر۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفۃ النعمان تو فقہ کے بانی اور موجد ہیں اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فقہ کا ثلث حصہ تو ان کا اپنا ہے، بقیہ چوتھائی حصے میں البتہ تمام شریک وسہیم ہیں اور فقہ میں وہی اصل صاحبِ خانہ ہیں اور دوسرے تمام ان کے عیال واولاد ہیں۔ حنفی مسلک کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے کے باوجود مجھے امام شافعیؒ کے ساتھ گویا ذاتی محبت والفت ہے اور میں انہیں عظیم بزرگ مانتا ہوں اور اسی لئے بعض نفل اعمال میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں اور اس کے سوا کروں بھی کیا؟ جب کہ دوسرے بڑے بڑے صاحب علم وفضل اور کمال تقویٰ کے حاملین کو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے پہلو میں بچوں کی طرح کھڑے دیکھ رہا ہوں۔ والا مر الی اللہ سبحانہ و تعالی ۔انتہی

اور صاحب درالمختار فرماتے ہیں کہ:

بے شک فقہاء نے فرمایا کہ اس فقہ کی کھیتی کی۔ صحابیٔ رسولؐ حضرت عبد اللہ بن مسعود (و۳۲) رضی اللہ عنہ نے، زراعت اور اسکی سیرابی حضرت علقمہ (و۶۲) نے کی، اور حضرت ابرہیم نخعی (۹۷) نے اس کو کاٹا۔ اور حضرت حماد (و ۱۲۰) نے پاک وصاف کیا اور حضرت ابوحنیفہ (و۱۵۰) نے اس کو پیسا اور حضرت ابو یوسف (و۱۸۲) نے اس آٹے کو گوندھا

۔اور حضرت امام محمد (و ۱۸۹) نے اس کی روٹی پکائی اور اب سارے لوگ اس روٹی کو کھا رہے ہیں۔یعنی فقہ حنفیہ کو قابل اعتماد بزرگوں نے مزین کیا ہے اور یہ سہل اور قابل عمل مسلک ہے۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ امام محمد (شاگرد امام ابوحنیفہ) علیہ الرحمہ کی وسعت علم کا اندازہ ان کی ضخیم تصانیف سے کیا جا سکتا ہے۔جیسے ''جامع صغیر''،''جامع کبیر''،''مبسوط''،''زیادات''،''نوادر'' وغیرہ وغیرہ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ آپ نے علوم دینیات پر نوسو ننانوے کتابیں تصنیف کی ہیں اور امام شافعیؒ خود آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔اور ان کی والدہ محترمہ سے آپ نے شادی کر لی، اور اپنا مال اور کتابیں یہ سب امام شافعی کو سونپ دیں، جن کے مطالعہ کی بدولت امام شافعیؒ فقیہہ بن گئے۔اور اس حقیقت کو خود حضرت امام شافعیؒ نے بھی پورے انصاف کے ساتھ اعتراف کیا ہے خدا کی قسم! میں تو امام محمد بن حسن کی تصانیف کی بدولت فقیہہ بنا ہوں۔بے شک جسے فقہ کی ضرورت ہو وہ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان کے اصحاب کی شاگردی کو لازم جانے۔بلاشبہ ان ہی حضرات کرام پر معانی و مطالب، اور حقائق و معارف آسان ہو گئے ہیں۔

اور حضرت اسماعیل بن ابی رجاء نے فرمایا کہ میں نے امام محمد علیہ الرحمہ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جواب دیا، اللہ نے میری مغفرت کی اور پھر فرمایا اگر میں تم کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا تو علم تمہارے اندر ودیعت نہیں کرتا۔

پھر میں نے پوچھا امام ابو یوسف کس مقام پر ہیں۔جواب دیا، وہ ہم سے دو درجے اوپر ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کس مرتبہ پر ہیں؟ جواباً فرمایا افسوس یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے؟ وہ تو اعلیٰ علیین میں جلوہ افروز ہیں اور یہ نعمت انہیں کیوں نہ ملے جبکہ انہوں نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔اور پچپن ۵۵ بار حج بیت اللہ کی سعادت پائی اور ایک سو مرتبہ خواب میں اپنے رب تعالیٰ کا مشاہدہ فرمایا۔اور آپ کے آخری حج بیت

اللہ کا یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ آپ نے ایک رات دربان کعبہ سے کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی، چنانچہ اندر پہنچ کر دوستون کے درمیان میں اپنے سیدھے پیر پر کھڑے ہوگئے اور بایاں پیر سیدھے پیر کے اوپر رکھا اور رکعت باندھ لی۔ اور اسی حالت میں آدھا قرآن پڑھا پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا اور پھر دوسری رکعت کا قیام بائیں پیر پر کیا اور سیدھا پیر بایاں پیر کی پشت پر رکھا اور اس رکعت میں بقیہ آدھا قرآن بھی ختم کیا۔ پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو زار وقطار رویا اور اپنے رب کریم سے مناجات کی اور عرض کیا:

اے میرے اللہ! اس ضعیف وناتواں بندے نے تیری عبادت کا حق جس طرح کہ ادا کرنا چاہئے تھا ایسا ادا نہیں کرسکا لیکن تیرے حق معرفت کو البتہ جیسا کہ پہچاننا تھا ایسا پہچان لیا ہے، تو اس کے کمال معرفت کے سبب وطفیل اس کی یہ ناقص وناتمام خدمت وعبادت کو قبول فرمالے۔

اتنا کہنا تھا کہ خانہ کعبہ سے غیبی فرشتہ نے یہ ندا دی، اے ابوحنیفہ بے شک ہم کو جس قدر پہچاننا تھا اسی قدر تم نے پہچان لیا اور جس خوش اسلوبی کے ساتھ عبادت وخدمت کی ضرورت تھی اس کو تم نے پورا کردیا۔ اس کے صلہ میں ہم نے نہ صرف تمہیں بخش دیا بلکہ قیامت تک کے لئے ہر اس شخص کو بخش دیا جو آپ کے مذہب پر قائم رہے گا۔

نیز اس کتاب میں فرماتے ہیں:

بے شمار ان گنت اولیائے کرام جنہوں نے شدید مجاہدات وریاضات کی سختیاں جھیلیں اور مشاہدات کے میدان میں گھوڑے دوڑائے۔ یہ سب کے سب امام اعظم ابوحنیفہ النعمان کے مقلد ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت شقیق بلخی، حضرت معروف کرخی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت داؤد الطائی، حضرت ابوحامد لفاق، حضرت خلف بن ایوب، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت وکیع بن جراح، حضرت ابوبکر بن

ورّاق، وغیرہ وغیرہ کبار اولیاء کی ایک طویل فہرست ہے جس کا احاطہ مشکل ہے ،۔ان بزرگوں کو حنفی مذہب میں اگر رمق برابر بھی شبہ ہوتا تو یقیناً یہ حضرات امام اعظمؒ کی اتباع وتقلید ہرگز نہ کرتے اور نہ مسائل میں ان سے متفق ہوتے۔اور بے شک استاذ ابوالقاسم قشیری جو مسلک حنفی پر سختی کے ساتھ عمل کرنے والے اور اس میں پیش پیش رہنے والے ہیں، وہ اپنی کتاب میں یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

میں نے اپنے استاذ حضرت علی دقاق سے سنا ، وہ فرماتے تھے کہ میں نے یہ مسلک حضرت ابوالقاسم نصر آبادی سے سیکھا اور حضرت ابوالقاسم نے فرمایا، میں نے یہ حضرت شبلی سے حاصل کیا، اور انہوں نے حضرت سری سقطی سے اور وہ حضرت معروف کرخی سے اور وہ حضرت داؤد الطائی سے اور انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ سے علم شریعت اور طریقت دونوں کو حاصل کیا۔اور ان تمام بزرگوں میں سے ہر ایک نے بھی امام فضل اعظمؒ کی تعریف وتوصیف، اور تقدیس کی، اور بلاشبہ ان کے علم وفضلہ اور کمال کا اعتراف واقرار کیا۔

اے میرے بھائی، تجھ پر بڑا تعجب ہے، ان سرداران اکابرین میں کیا تجھے کوئی اسوۂ حسنہ نہیں ملا۔اور کیا یہ تمام نفوس قدسیہ اس اقرار اور افتخار میں متہم یا جھوٹے ہیں۔حالاں کہ یہ سب کے سب اس راہ کے امام اور اربابِ شریعت وحقیقت کے سرگروہ ہیں اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں، وہ بھی اس حکم میں ان ہی بزرگوں کے تابع اور پیروکار ہیں اور جس کسی نے بھی ان کے عقائد سے اختلاف کیا تو سمجھ لو کہ وہ مردہ اور بدعتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۲)

# تشہد میں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے سے متعلق احادیث اور ائمۂ اربعہ کا مسلک و موقف

واضح رہے کہ تشہد میں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے کے متعلق صاحب مشکوٰۃ نے مسلم، ابوداؤد، دارمی، نسائی، ترمذی، بیہقی اور احمد کی روایت سے چھ حدیثیں نقل کی ہیں۔

اور محمد ہاشم بدخشی حنفیؒ کی کتاب کے خلاف سید محمد برزنجی مدنی شافعی نے اپنی کتاب ''الضارم الهاشم'' میں فرمایا ہے کہ سنت اور حدیث رسول ﷺ پر عمل کرنے والے کے لئے ایسی چھبیس ۲۶ حدیثیں (اشارہ بالسبابہ، انگلی سے اشارہ کرنا) موجود ہیں۔ جو چھبیس ۲۶ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ اس طریقہ سے ثابت ہیں کہ ان پر امت کی اکثریت کا عمل رہا ہے اور اس اکثر امت میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب بھی ہیں۔

نیز اسی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ مختلف شہروں کے فقہائے زمانہ مثلاً امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحٰقؒ، امام داؤدؒ اور ان کے علاوہ دیگر فقہائے امت نے تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کے مسئلہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ سے موافقت کی ہے۔

نیز اسی میں لکھتے ہیں:

امت کی ایک بڑی جماعت تشہد میں انگلی کے اشارہ کو مستحب سمجھتی ہے اور یہ کوئی مختصر جماعت نہیں ہے، بلکہ حرمین شریفین، یمن، حبشہ، شام، مصر، بیت المقدس، بصرہ، حلب کردستان کے باشندگان اور بلاد عجم اور داغستان کے مسلمان، نیز جزائر جاوا، ملیبار اور ہندوستان کے ساحلی علاقے اور کوکنان، نظام شاہی، عادل شاہی اور زیرباد کے رہنے والے مسلمان سب کے سب شافعی المذہب ہیں۔

اور مغرب کی پوری آبادی، سوڈان کا اکثر حصہ، صعید، احساء کے شہر، بصرہ اور احساء

کے درمیان کے جنگلات میں بسنے والے اور بہت سے قبائل مالکی المذہب ہیں۔

اور نجد اور بیت المقدس اور ملک شام کے بہت سے قریوں کی آبادی حنبلی المذہب ہیں اور ان کی اکثریت تشہد میں اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتی ہے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ:

اہل حساب بعض ایسی گرہیں رکھتے ہیں جنہیں انگلیوں میں ڈالکر حساب لگاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک گرہ انہوں نے ایک مقرر عدد کے واسطے وضع کیا ہے جس کی مدد سے ایکائی، دسیوں، سوؤں اور ہزاروں کی گنتی ہو جاتی ہے چنانچہ مثال کے طور پر یہ لکھتے ہیں کہ یہی ترپن (۵۳) نام کی گرہ جو اس حدیث میں مذکور ہے اس کی صورت یہ ہے کہ خنصر (کن انگلی) بنصر (خنصر کے بازو کی انگلی) اور وسطی (بیچ کی انگلی) ان تینوں انگلیوں کو سکیڑ لیں، اور شہادت کی انگلی سیدھی کر کے اس کی جڑ میں انگوٹھے کا سرا رکھ دیں۔ اور اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے ایک روایت سے اس کو اختیار فرمایا ہے۔

اور دوسری مثال نودنامی گرہ (حلقہ) کی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ کن انگلی اور اس کی بازو والی انگلی کو سکیڑ لیں اور شہادت کی انگلی کو کھول کر لابنی کر لیں اور بیچ کی انگلی کے سر سے انگوٹھے کا سر ملا کر یا اس کے سر پر اس کا سر رکھ کر حلقہ باندھ لیں۔ یہ حنفیوں کا طریقہ ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور امام شافعیؒ بھی اپنے قدیم قول کے مطابق اسی طریقہ کے قائل ہیں اور یہ طریقہ مسلم شریف کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے اور یہ حدیث آگے آرہی ہے اور یہی حدیث مسند احمد اور ابوداؤد میں بھی حضرت وائل بن حجر کی روایت سے موجود ہے۔

اور حضرت امام مالکؒ کا یہ طریقہ ہے کہ سیدھے ہاتھ کی چاروں انگلیاں بند کریں (سکیڑ لیں) صرف انگشت شہادت کو کھول دیں۔ (دراز کریں)

اور شافعیوں سے مختلف کیفیت میں ایک دوسرا طریقہ بھی مروی ہے اور وہ اس طرح کہ انگوٹھے کی دو گانٹھوں (گرہوں) کے درمیان میں بیچ کی انگلی کا سر رکھیں۔ اور شافعیوں کی تیسری روایت یہ بھی ہے کہ سجدے کی حالت میں جس طرح انگلیوں کو سیدھا قبلہ رُو رکھتے ہیں اسی طرح تشہد کے وقت بھی رکھیں۔

اور بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ انگلیوں کی گرہ باندھے بغیر ویسے ہی شہادت کی انگلی سے اشارہ کریں اور بعض حنفیوں کے نزدیک زیادہ مختار و پسندیدہ موقف یہ ہے کہ اکثر مقامات میں جو مختلف روایات آئی ہوئی ہیں ان کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا عمل بھی مختلف رہا ہے، کبھی اس طرح اور کبھی اس طرح بہر حال ماوراء النہر اور ہندوستان کے بعض حنفیوں کو گرہ باندھنے اور اشارہ کرنے کے اس عمل کو ترک کرتے ہوئے دیکھا ہے اور متقدمین احناف نے وہی پہلی صورت (گرہ باندھنے اور اشارہ کرنے) کو اختیار کیا ہے۔ البتہ متاخرین حنفی حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور حرمین شریفین اور ان کے علاوہ دیگر عرب شہروں کے علماء کے پاس اسی پہلی صورت پر عمل ہے اور اسی کو انہوں نے اختیار فرمایا ہے۔

محقق احناف شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

تشہد کی ابتداء سے لے کر شہادتین (اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمدً عبدہ ورسولہ) تک اپنی انگلیاں کھلی رکھیں اور تہلیل (لاالہ الا اللہ) کے وقت گرہ باندھیں اور اشارہ کریں، اور دونوں طریقوں پر عمل کرنے کے لئے یہ صورت جامع ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

اشارہ سے منع کرنے کا قول روایت اور درایت کے بھی خلاف ہے اور حضرت شیخ علی متقی نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس میں اشارہ بالسبابہ کے عمل کو ترجیح دی

ہے اور ہم نے اس کا کچھ حصہ ''شرح سفر السعادۃ'' میں بھی نقل کیا ہے۔

''محیط'' میں مرقوم ہے کہ: امام ابوحنیفۃ النعمان اور امام محمدؒ علیہ الرحمہ کے نزدیک تشہد میں سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی (سبابہ) کا اٹھانا مسنون ہے اور اسی طرح امام ابو یوسف سے بھی مروی ہے اور علامہ نجم الدٰین زاہدی، فرماتے ہیں کہ رفع سبابہ کے مسنون ہونے میں ہمارے اصحاب کی سب روایتیں متفق ہیں اور جب ائمہ، محدثین، فقہاء صحابہؓ اور تابعین کی بڑی تعداد اور کوفہ و مدینہ منورہ کے علماء کی اکثریت کا مذہب و مسلک اسی رفعِ سبابہ پر ہے اور اس باب میں بکثرت احادیث اور آثار موجود ہیں، تو اسی پر عمل کرنا بہت بہتر اور راجح ہے۔

''خزانۃ المفتیین'' میں لکھا ہے کہ جب تشہد میں، اشھد ان لاالٰہ الااللہ یعنی نفی سے اثبات تک پہنچ جائیں تو اب سبابہ کا اشارہ نہ کریں۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ جب اشھد ان لاالٰہ الااللہ تک پہنچ جائیں تب بھی انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے اور قول مختار یہ ہے کہ اشارہ نہ کیا جائے جیسا کہ ''خلاصہ'' میں مرقوم ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے چنانچہ یہی ''مضمرات'' میں کبریٰ سے نقل کیا گیا ہے اور فقہائے کرام کی اکثریت ایسے اشارہ (جو نفی سے اثبات تک تجاوز کر جائے) کو ناپسند کرتی ہے اور ''منیۃ المفتی'' میں مکروہ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ''تبیین'' میں موجود ہے۔

اور صاحب ''درالمختار'' بھی فرماتے ہیں کہ: تشہد میں اپنی سبابہ سے اشارہ نہ کیا جائے۔ اور اسی پر فتویٰ بھی ہے جیسا کہ فتاویٰ ''ولوالجیہ'' ''تجنیس عمدۃ المفتی'' اور ''عامۃ الفتویٰ'' میں مرقوم ہے لیکن قابل اعتماد قول تو وہی ہے جس کو شارع علیہ السلام نے صحیح قرار دیا۔ اور خاص کر متاخرین میں سے کمالؒ، حلبیؒ، بہلسیؒ، باقانیؒ اور شیخ الاسلام الجدؒ وغیرہ نے اشارہ بالمسابہ کو ضروری جانا کیونکہ یہ فعل رسول ﷺ ہے اور یہ متاخرین کی

جماعت اسکی قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو امام محمد علیہ الرحمہ اور امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرتی ہے، اور کتاب ''درد البحار'' کے متن اور اسکی شرح ''غرر الاذکار'' میں لکھا ہے کہ ہمارے پاس مفتی بہ قول یہ ہے کہ پوری انگلیوں کو کھلا رکھ کر ہی سبابہ سے اشارہ کردے۔

اور ''شرنبلالیہ'' میں ''برہان'' سے یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح مسئلہ یہ ہے کہ صرف ایک انگشت شہادت سے اشارہ کرے، وہ بھی اس طرح سے کہ نفی (لا الہ) میں اٹھائے اور اثبات (الا اللہ) میں چھوڑ دے، اور ہم نے جہاں لایشیر (اشارہ نہیں کرتے ہیں) کہا ہے۔ وہاں ''الصحیح'' کا لفظ نہیں بڑھایا ہے اور اس سے عمداً گریز کیا ہے کیونکہ یہ اشارہ نہ کرنے والی بات درایت کے بھی خلاف ہے، اور روایت کے بھی۔ (نفی و اثبات قولی کے ساتھ نفی و اثبات فعلی کو شامل کرنا ور انگلی سے اشارہ کرنا، یہ عملاً بھی اور فعلاً و عقلاً بھی ٹھیک نہیں ہے) ابھی جو ہم نے اشارہ کرنے کے لئے کہا تھا تو اس اشارہ کے وقت گرہ لگانا بھی ضروری ہے۔

اور عینی میں ''التحفہ'' سے منقول ہے کہ صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ یہ اشارہ کرنا مستحب ہے اور ''محیط'' میں منقول ہے کہ یہ اشارہ سنت ہے۔

اور شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی شرح ''سفر السعادۃ'' میں اور شیخ فتح محمد نے ''مفتاح الصلوٰۃ'' میں اشارہ سے متعلق اختلافات کی تفصیلی بحث شامل کی ہے۔

اور امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے ۳۱۲ مکتوب میں منقول ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں سے یہ صاف اور واضح ہوتا ہے کہ جوازِ اشارہ کی روایتیں، یہ اصولی روایتوں اور ظاہر مذہب سے علحدہ ہیں۔

نیز امام ربانی اسی مکتوب میں اختلاف کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان اکابردین کے فقہی ذخیرے کے متعلق ہمارا حسن ظن یہ ہے کہ جب تک کہ انہیں کسی بھی

مسئلہ میں حرمت یا کراہت کی دلیل نہ ملی ہو، اس وقت تک وہ حرمت یا کراہت کا حکم نہیں دیتے۔ جب کبھی بھی انہوں نے اشارہ کے مسئلہ میں اس کے مستحب اور مسنون ہونے کا ذکر کیا تو اس کے بعد یہ کہا ہے کہ یہ تحقیق تو ان محققین کی تھی جو انہوں نے بیان کیا، صحیح قول یہ ہے کہ اشارہ کرنا حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان بزرگوں کے نزدیک اشارہ کے مستحب و مسنون ہونے کی دلیلیں درجۂ صحت کو نہیں پہنچی ہیں بلکہ اس کے برخلاف حرمت و کراہت کی دلیلیں صحیح طور پر پہنچی ہیں اور اس باب میں آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اس دلیل کا علم نہیں ہے اور ایسا کہنے سے ان اکابرین پر اعتراض یا جرح وقدح بھی لازم نہیں آتا۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم ان کے خلاف دلائل کا علم رکھتے ہیں تو اس کو ہم یہ جواب دیں گے کہ حلال وحرام کے ثبوت میں مقلد کا علم معتبر نہیں ہے بلکہ اس باب میں مجتہد کا ظن معتبر ہے۔ اور ائمۂ مجتہدین کے دلائل کو اوھن البیوت لبیت العنکبوت (مکڑی کے جالے سے زیادہ بودے اور کھوکھلے دلائل) قرار دینا یہ بہت بڑی جرأت اور انتہائی بے باکی و گستاخی ہے، اور ایسا کہنا گویا اپنے علم کو ان اکابرین کے علم و دانش اور فہم و بصیرت پر ترجیح اور فوقیت دینا ہے۔ اور یہ فقہ حنفی کے ظاہری اصول کے بطلان کے مترادف بھی ہے اور معتبر و مفتی بہ روایات میں ہیر پھیر یا ان کو شاذ و نادر قرار دینے کے ہم معنی بھی ہے۔

اور یہ بزرگان دین، علم کی کثرت اور ورع وتقویٰ کے حصول وقبول میں ہم سے بہت دور پہنچ گئے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ سے قرب زمانہ کے باعث احادیث کو ہم سے کہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں اور احادیث کی تقسیم صحیح و غیر صحیح، منسوخ و غیر منسوخ اور سقیم و غیر سقیم وغیرہ کو ہم سے بڑھ کر جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ان احادیث کے تقاضوں پر عمل نہ کرنے میں ان حضرات کرام کے پاس البتہ کوئی مناسب اور پسندیدہ طریقہ موجود ہوگا جو

ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ہم کم فہم تو بس اتنا ہی سمجھ سکے ہیں کہ اشارۃ بالسبابہ اور حلقہ بندی کے سلسلے میں حدیث کے راویوں نے کافی اختلاف کیا ہے اور ان کے اس کثرت اختلاف نے اصل نفسِ مسئلہ یعنی اشارہ بالسبابہ میں اضطراب وتر دد پیدا کر دیا ہے۔

نیز اسی کتاب میں رقمطراز ہیں : یہاں اگر یہ اعتراض ہو کہ جب حنفی علمائے کرام نے اشارہ بالسبابہ کے جائز ہونے پر فتویٰ دے دیا ہے تو اس کے برعکس والا فتویٰ (عدم اشارہ) کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس پر بھی عمل کیا جائے تو جائز ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض اگر جواز وعدم جواز اور حلال وحرام میں واقع ہے تو ترجیح، عدم جواز کو دی جائے گی اور حرام کا فتویٰ عائد ہوگا اور اس طرف ہی میلان ورجحان ہوگا اور یہ مبنی بر احتیاط ہے۔

حضرت امام ربانی علم باطن میں تو امام اور مقتدا کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود علم ظاہر میں وہ بھی حنفی مقلد ہیں اور انہوں نے اہل سنت وجماعت کے اس اختلافی مسئلہ میں علماء حنفیہ کی تقلید سے آگے اپنا قدم نہیں رکھا اور اشارہ والی حدیثوں سے احکام و مسائل نہیں نکالے کیونکہ ایک مقلد کو قرآن وحدیث سے احکام ومسائل کے استخراج اور استنباط کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ اسکی مفصلاً بحث تیسرے مقدمہ میں گذر چکی ہے۔ اور وہ کسی ایک جانب (مسلک) کی صحت کا یقین کرتے ہوئے دوسرے جانب (مسلک) کے غلط و گمراہ ہونے کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ اجتہادی احکام ومسائل، یہ افادیات ظنیہ میں سے ہیں اور ظنیات کے اندر ایک ہی جانب کی صحت کا یقین خود مجتہد کو میسر نہیں ہے تو مقلد کو اس تک رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اس موضوع کی وضاحت پانچویں مقدمے میں گذر چکی ہے۔ اور بسا اوقات علمائے مجتہدین نے اجتہادات اور استنباطات میں کسی قسم کی دخل اندازی سے خود کو روک لیا ہے تو پھر ان علوم میں ایک مقلد کو دخل دینا کیسے روا ہے؟ بلکہ ممنوع ہے اور یہ بحث بھی پانچویں اور دسویں مقدمے میں آ گئی ہے۔ اور انگلی سے اشارہ نہ کرنے کے مسئلہ

میں حنفی علماء کے دلائل و براہن کا علم نہ ہونے کا اقرار، اور اس لاعلمی کے اعتراف کے باوجود بھی انہوں نے امام اعظم اور ان کے اصحاب کی تقلید ترک نہیں کی۔ کیونکہ مقلد کے لئے مجتہد کا قول ہی قابل سند اور لائق حجت ہے، نہ اس کا ظن، یہ بحث بھی مفصلاً تیسرے مقدمہ میں گذر چکی۔اور مجتہد کے خطا وصواب سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ اس کی غلطی پر بھی ایک درجہ ثواب مرتب ہوتا ہے۔اور خطاء کی صورت میں بھی اس کی تقلید کرنا نجات کا باعث ہے۔اسکی تفصیل ہم نے چھٹے مقدمے میں پیش کی ہے۔مگر اختلافی فتوؤں میں جو عدم جواز اور حرمت کے عامل ہیں، وہ (امام ربانی ؒ) اس کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ یہاں ان اہل فتویٰ بزرگ کی احتیاط بھی قابل غور ہے اور اس طرز عمل میں ایک ایک عامی مقلد کے لئے بڑی عبرت اور نصیحت کا مقام ہے۔

اور اشارہ کے اس مسئلہ میں بھی بعض مقلدین نے مجتہدین کے ان اختلافات میں دخل دیا ہے اور تقلید کی حد سے تجاوز کرتے ہوئے جواز کے قائل علماء کے مسلک کا صریح انکار کیا ہے حالانکہ وہ بلند مرتبت صاحبِ فضیلت ائمہ ؒ کرام اور امت کے سواد اعظم کے عمل سے ذرہ برابر بھی واقف نہیں اور علم نہیں رکھتے ہیں، ان اجتہادی احکام میں عوام کی مداخلت سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں یہ دسویں مقدمہ میں سپرد قلم ہو چکی ہیں۔ تاہم یہاں بھی اس کا کچھ حصہ علامہ سید محمد برزنجیؒ کی کتاب سے پیش کیا جارہا ہے تا کہ ان کی مداخلت کی قباحتیں خوب واضح اور نمایاں ہوسکیں۔''قال'' سے مراد حضرت بدخشیؒ ہیں اور 'اقول' سے مراد علامہ برزنجیؒ ہیں۔

قآل حضرت بدخشی فرماتے ہیں : بے شک کوئی کہنے والا کہے گا کہ یہ اشارہ بالسبابہ کا مسئلہ اگر حدیث سے ثابت ہے جیسا کہ دعویٰ کیا جارہا ہے تو امام بخاریؒ اسکو ضرور روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اس میں ایسی کوئی روایت ہی نہیں کی ہے۔تو

اس نسے یہ معلوم ہوتا ہے اور گمان غالب بھی یہی ہے کہ بلا شبہ یہ اشارہ بالسبابہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جس طرح یہ بات بعید ہے کہ حدیث میں آیا ہو اور اس کو امام بخاری نے روایت نہ کی ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی بعید ہے کہ اس کا ثبوت ملنے کے باوجود بھی اس کو امام بخاری نے ترک کیا ہو۔ ایسی صورت میں اب صرف عدم صحت کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے ورنہ امام بخاریؒ ضرور اس کو بیان کرتے۔

اقول علامہ برزنجی فرماتے ہیں : بے شک اس نادان نے یہاں ایک پرزے کو سوراخ ڈال کر پھاڑ دیا اور اپنے ہی مذہب کی بنیاد خراب کر ڈالی اور اس پر نقص وارد کر دیا۔ اس کے کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ بخاری میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ وہ سب صحیح ہے۔ اس لئے اس کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور جو بخاری شریف میں موجود نہیں ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے،۔ کیونکہ امام بخاریؒ کی شخصیت و ذات سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے نزدیک تو کوئی روایت درجہ صحت و ثبوت کو پہنچی ہو، اور وہ اسے نظر انداز کر دئے ہوں، گویا ان کے نزدیک درجہ صحت کو پہنچنے کے باوجود بھی کسی روایت کو نظر انداز کر دینا جائز نہیں ہے۔ اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا، تو اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ بخاری شریف میں درج ذیل مسائل بھی تو موجود ہیں؟

(۱) قبول ایمان میں زیادتی اور کمی کا بیان۔

(۲) نماز میں بسم اللہ کا بلند آواز سے پڑھنا۔

(۳) رکوع میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت رفع یدین کرنا۔

(۴) ارکان نماز میں سکون اور طمانیت ہونا۔

(۵) امام کے پیچھے مقتدی کی قرأت واجب ہونا۔

(۶) چاروں رکعات میں قرأت کرنا۔

(۷) نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنا۔

(۸) سفر اور بارش کے موقعہ پر دو فرض نمازوں کو بیک وقت ملا کر ادا کرنا۔

(۹) گیارہ رکعات وتر کی نماز پڑھنا۔

(۱۰) خسوف کی نماز دو رکوع اور دو قیام کے ساتھ پڑھنا۔

(۱۱) عصر کی نماز کا وقت کسی چیز کے ایک مثل سایہ ہونے پر ہو جانا۔

(۱۲) اندھیری میں یعنی صبح کاذب میں نمازِ فجر کا ادا کرنا۔

(۱۳) عیدین کی تکبیرات زوائد کا سات بار اور پانچ بار ہونا۔ (۱۴) خیارِ مجلس

(۱۵) مُدبر غلام کی فروخت۔ (۱۶) ولی کے بغیر نکاح کا صحیح نہ ہونا۔

ان کے علاوہ اور بھی ایسے امور و مسائل بخاری شریف کے اندر موجود ہیں جن کا حصر و شمار مشکل ہے۔ اور جس نے صحیح بخاری اور بالخصوص ایک حصہ کتاب ''ترک الحیل'' کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جان لے گا، کہ امام بخاری نے اس کے اندر حنفی مذہب کے ثلث حصہ کی تردید کی ہے۔ اور جہاں کہیں بھی انہوں نے یہ کہا کہ وبعض الناس قال ویقول کذا تو اس بعض لوگوں سے انکی مراد حضرت امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان کی ذات گرامی ہے۔ حالانکہ ان پورے مسائل پر عمل خود شوافع کا بھی نہیں ہے۔ ان کا مذہب بھی اس سے مختلف ہے۔ اور اس سے ان کا یہ مذکورہ بالا قاعدہ ہی ٹوٹ گیا۔ (جو بخاری شریف میں ہے اس پر عمل کرو اور جو اس میں موجود نہیں ہے اس پر عمل نہ کرو۔)

اور غور کیجئے صحیح بخاری میں درج ذیل فقہی مسائل و احکام سے متعلق احادیث ہی نہیں ہیں مثلاً: (۱) خون نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا۔ (۲) حالتِ نماز میں زور سے ہنسنے سے وضو کا ٹوٹ جانا۔ (۳) بسم اللہ۔ کا ہر سورت کے جزو ہونے کا انکار نہ کرنا، نہ تو اس کے اندر سورۂ فاتحہ کی تخصیص اور نہ اس کے ماسوا کا تذکرہ ہے۔ (۴) نبیذ کا حلال ہونا۔ (۵) آخری

دورکعتوں میں قرأت کے عوض تسبیح پڑھنے کا جواز۔(٦) نمازکسوف کوایک قیام اورایک رکوع سے ادا کرنا۔(٧) کسی ضروری کام کی وجہ سے نماز توڑ کر نکل جانا، جائز ہونا۔اوران کے علاوہ بھی کئی ایک ایسے مسائل واحکام ہیں جن کا بخاری شریف میں ذکر ہی نہیں ہے۔

تو معلوم ہوا کہ آپ (حضرت بدخشیؒ نے) جو قاعدہ باندھا تھا یہ اپنے آپ خود ختم ہوکر رہ گیا کہ ''جو بخاری میں موجود ہو، وہ قابل عمل اور جو غیر موجود ہو، وہ قابل متروک'' اب اس کی نقیض بھی یہی چاہتی ہے کہ مذکورہ بالا اتنے مسائل چونکہ بخاری شریف میں نہیں ہیں۔ اس لئے ان پر عمل بھی نہیں ہونا چاہئے۔ ہائے افسوس! اپنے فریق مقابل کی حق بات کے سننے اور قبول کرنے سے گھبرا کر جس پر خود اپنے مذہب (شوافع) کا عمل رہا ہے، تعجب ہے آپ نے اتنی بڑی بات اپنے منہ سے کیسے نکال دی؟ جب کہ اس سے اپنے مذہب کی بنیاد جڑ پیڑ سے اکھڑ جاتی ہے۔

مزید براں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خود امام بخاری نے یہ کہا ہے کہ ''میں نے اپنی اس کتاب ''جامع البخاری'' میں جن حدیثوں کو جمع کیا ہے، ان سے کہیں زیادہ صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے۔

کتاب ''الکبریٰ'' میں امام تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوعبداللہ الحافظؒ نے دوطریقوں سے امام بخاریؒ سے یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے چھ لاکھ احادیث، صحیح بخاری سے خارج کردی ہیں۔

حضرت ابراہیم بن معقل فرماتے ہیں کہ میں نے خود امام بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے اپنی صحیح بخاری میں صرف وہی احادیث شامل کی ہے، جو درجۂ صحت کو پہنچ چکی ہیں اور بہت سی صحیح احادیث ایسی بھی تھیں جنہیں خوف طوالت کی وجہ سے چھوڑ دی ہیں۔

اور محدث ابن عدی کا کہنا ہے کہ مجھ سے محمد بن احمد القوسی نے یہ حدیث بیان کی کہ میں نے محمد بن حمدویہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل بخاری سے سنا ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک لاکھ ایسی حدیثیں یاد کیں جو بالکل صحیح تھیں اور دو لاکھ ایسی حدیثیں بھی یاد کیں جن کی سند درجۂ صحت و ثبوت کو نہیں پہنچی تھی۔

اور یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ صحیح بخاری کی کُل حدیثوں کی مجموعی تعداد سات ہزار ہے جن میں سے تین ہزار تو مکررات میں سے ہیں (یعنی دو دو بار دہرائے ہوئے ہیں) اور بقیہ چار ہزار تو مکررات میں سے تو نہیں ہیں۔ مگر یہ سوچنے کا مقام ہے کہ ایک لاکھ احادیث، یا مسائل کے مقابلے میں یہ چار ہزار، یا سات ہزار احادیث کی نسبت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ (یہ بقیہ مسائل کہاں گئے؟ کیا ان پر عمل نہیں کیا جائے گا؟)

اور بذات خود یہ شخص (حضرت بدخشی) نے بھی لکھا ہے کہ امام بخاری نے فرمایا کہ میں نے اپنی کتاب ''جامع البخاری'' میں جتنی حدیثیں جمع کی ہیں ان سے کہیں زیادہ چھوڑ دی ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں کیونکر ان احادیث کی صحت کا انکار کیا جاسکتا ہے جو صحیح بخاری میں درج نہیں ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ امام بخاری تک یہ احادیث نہیں پہنچی ہیں۔ اگر ایسا کہو گے تو یہ ان کی ذات سے بعید ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ امام بخاری نے ان احادیث کے ثبوت اور صحت کے باوجود انہیں چھوڑ دیا ہے تو یہ ان کی ذات گرامی سے اور بھی بعید تر بات ہوگی اور یہ اسی شخص (حضرت بدخشی) کی عبارت کے الفاظ ہیں کہ امام بخاریؒ نے جتنی حدیثیں ''جامع البخاری'' میں جمع کی ہیں ان سے کہیں زیادہ چھوڑ دی ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ محدثین کرام کی اصطلاح میں صحیح حدیث بلکہ وہ حدیث حسن، بھی جو صحیح حدیث کے ماسوا ہے، یہ اپنے پورے مراتب کے اعتبار سے قابل حجت و دلیل اور لائق سند ہے، اور اس سے احکام و مسائل کا ثبوت ملتا ہے اور بلا شبہ اس سے علمائے سلف اور

خلف کی ایک جماعت نے دلیل پکڑی ہے اور ہمیشہ اس پر ان کا عمل رہا ہے، بلکہ فقہاء حنفیہ اور اکثر فقہائے کرام اور اصولیین نے عموم معنی کے تحت کبھی حدیث مرسل کو بھی جو اصطلاح حدیث میں شامل ہے۔اس کو بھی حجت و دلیل کے طور پر قبول کیا ہے اور یہ بات عام طور پر ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے اصول فقہ پڑھی ہے۔

اور بدخشی کے شیخ محمد سعید نے اپنی کتاب میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس غافل نے یہ کیسی لغو بات کہہ دی ہے کہ بخاریؒ کی روایت کردہ حدیثیں ہی صحیح حدیثیں ہیں تو پھر یہ باقی ماندہ صحیح حدیثیں جنکی کثرت کا حساب ہی مشکل ہے۔آخر یہ کہاں جائیں مثال کے طور پر مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابوعوانہ، اسماعیلی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، رزین، مختارہ، اور موطات وغیرہ، وغیرہ۔

اے کاش کے وہ اپنے لغو کلام سے شرم وحیا کرتا اور اپنی ذات کو لوگوں کے سامنے رسوا کرنے والا یہ وہ احمق ہے جس کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے چنانچہ یہ خود ہی اپنی زبان سے بدنام ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی تعریف اس ذات کے لئے ہے جس نے اس احمق کو خود اسکی زبان سے رسوا کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۳)

# خطبہ میں خلفائے راشدین کا ذکر کرنا اہل سنت و جماعت کا شعار ہے

واضح رہے کہ خطبہ میں حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر اہل سنت و جماعت کا دستور، اور شعار ہے کیونکہ خارجی لوگ حضرات ختنین (یعنی حضرت عثمان وعلی رضی

اللہ عنہما) سے محبت و الفت اور ان کے ساتھ حسنِ عقیدت نہیں رکھتے ہیں ۔ اور شیعی لوگ حضرات شیخین (یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی فضیلت و برتری کے قائل نہیں ہیں ۔ اموی دورِ حکومت میں چاہے وہ مروانی ہو یا غیر مروانی، ستر سال سے زائد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک جمعہ کے خطبہ میں ائمہ وخطباء حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت پر لعن طعن اور سب وشتم کیا کرتے تھے جیسا کہ ''تاریخ الخلفاء'' اور ''جامع التاریخ'' میں مرقوم ہے۔

اسی وجہ سے اہل سنت و جماعت نے خطبہ میں خلفائے راشدین کے ذکر کو اپنا دستور اور شعار قرار دیا تاکہ ان گمراہ فرقوں خوارج اور شیعیوں سے امتیاز حاصل ہوسکے اور رحمتِ الٰہی کے نزول کا سبب بن سکے کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة اللہ والوں کو یاد کرنے سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں تعجب ہے کہ بعضوں نے خطبہ میں خلفائے راشدین کے ذکر کو بدعتِ ضلالت کہا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ہر امر مستحدث (نئے کام کی ایجاد) بدعتِ ضلالت نہیں ہے، بلکہ بدعت حسنہ ہے جو سنت سے پیوستہ اور ملحق ہے، اور یہ سنت حکمیہ بھی شرعی امور محدثات میں سے ہونے کی وجہ سے بدعت ضلالت میں شمار نہیں ہوئی۔ جس کا تفصیلی تذکرہ ہم نے کتاب کے نویں مقدمہ میں کردیا ہے۔ اور حضرات صوفیہ کے ذکر و مشاغل، مقامات و حالات اور قلبی واردات یہ سبھی امور دینیہ کے اندر نئی ایجادات و تخلیقات میں سے ہیں، اور سب کی سب بدعتِ ضلالت میں سے نہیں بلکہ بدعت حسنہ کی قبیل سے ہیں اور اس کو بھی ہم نے دوسرے مقدمہ میں مفصلاً بیان کیا ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی اپنے کمال اتباع سنت اور بدعت سے بے انتہا دور و نفور ہونے کے باوجود مکتوبات کی جلد دوم ۵۵ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

سنا گیا ہے کہ مقام سامانہ (جنوبی سرہند) کے ایک خطیب نے عید الاضحیٰ کے خطبہ میں حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ناموں کو چھوڑ دیا اور ان کے اسمائے مبارکہ کو نہیں پڑھا۔ نیز یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہاں کے علماء وفضلاء اور عوام نے اس مسئلہ میں غفلت اور سستی سے کام لیا۔ اور اس بے انصاف خطیب کی نہ تو مخالفت کی اور نہ اس کے ساتھ سختی و شدت سے پیش آئے۔ اس پر ایک بار نہیں بلکہ سو بار افسوس کرنا چاہیئے۔

خلفائے راشدینؓ کا ذکر اگرچہ کہ خطبہ کے شرائط میں سے نہیں ہے لیکن اہل سنت و جماعت کا یہ دستور اور شعار ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ اور یہ چیز تو عمداً وہی ترک کرسکتا ہے جس کے دل میں کدورت ونفاق ہو اور جس کا باطن گندہ اور تاریک ہو، ولو بالفرض یہ بات مان لی جائے کہ اس خطیب نے خلفائے راشدین کا ذکر تعصب اور عناد کی وجہ سے نہیں کیا تو وہ پھر حدیث کا کیا جواب دے گا؟ جس میں یہ وعید آئی ہے کہ جو شخص کسی قوم (روافض اور خوارج) سے مشابہت اختیار کرے گا وہ ان ہی میں سے ہوگا من تشبہ بقوم فھو منھم اور اس کے علاوہ تہمت والزام سے بھی یہ کیونکر خلاصی ورہائی پاسکتا ہے؟ کیونکہ حدیث میں وارد ہے اتقوا من مواضع التھم، تہمت کی جگہوں سے خود کو بچائے رکھو۔ اگر اسکو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی فضیلت و برتری اور تقدم میں توقف وانکار ہے تو یہ اہل سنت کے دستور کے خلاف اور اس سے انحراف ہے، اور مشیعیت سے قربت واتصال کا ہم معنی ہے اور اگر اس کو حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ کے ساتھ محبت والفت رکھنے میں شک وتردد ہے، تو یہ خارجیوں سے قربت ونزدیکی کے مترادف ہے۔ یہ حقیقت سے بے خبر خطیب کشمیر کا باشندہ ہے اس نے اس خباثت وگندگی کو کشمیر کے بدعتیوں سے حاصل کیا ہے۔

نیز اس میں لکھتے ہیں : یہ ایک بدبودار پھول کی قسم سے ہے (جو اپنے اندر گندے عقائد وفاسد خیالات رکھتا ہے) آغاز اسلام سے لے کر اس وقت تک پتہ نہیں کہ یہ

ہندوستان میں کیسے گھل گیا؟ قریب ہے اسکی گندگی اور خباثت میں تمام شہر ملوث ہو جائیں بلکہ ڈر ہے کہ ہندوستان ہی سے اعتماد اٹھ جائے۔

نیز اس میں رقمطراز ہے: یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے مخدوم ومطاع اور علماء وفضلاء اس معاملہ میں خود کو مجبور ومعاف تصور کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں تغافل وتساہل سے کام لے رہے ہیں حالانکہ اہل کتاب کی مذمت میں ارشادِ خداوندی ہے۔

لو لا ینھھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانو یصنعون، کیوں ان کے مشائخ اور علماء، انہیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے ہیں۔ کیسی بری ان کی کارستانیاں ہیں۔

نیز خدا نے یہ بھی کہا ہے: کانوالایتنا ھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانو ایفعلون جو برائی انہوں نے اختیار کر رکھی تھی، اس سے باز نہ آئے تھے، کیسا بے جا تھا جو کچھ وہ کر رہے تھے۔

اس قسم کے واقعات میں سستی اور غفلت سے کام لینا گویا بدعتیوں کو دلیر بنانا ہے اور دین کے اندر رخنہ ڈالنا ہے اور یہ وہاں کے اہل علم اور خواص کے تساہل اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ گویا بدعتی وگمراہ لوگوں نے کھلے طور پر اہل حق کو گمراہی کی طرف بلایا۔ معاملہ ایسا ہی رہا اور مزید تساہل وتغافل سے کام لیا گیا کہ تو کیا بعید ہے کہ یہ گمراہ لوگ بھیڑیوں کی شکل میں بکریوں کے ریوڑ سے بھاگنے لگیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۴)

# شریعت مطہرہ میں تسبیح کا استعمال

نیز واضح ہو کہ شریعت مطہرہ میں تسبیح کا استعمال کرنا صحیح گنتی کا حساب لگانے کے لئے جائز ہے۔صاحب درالمختار فرماتے ہیں کہ ظاہر داری اور ریا کاری کے بغیر تسبیح کا استعمال کرنا کوئی بری بات نہیں ہے''بحرالرائق''میں اس پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

صاحب طحطاوی''درالمختار'' کے حاشیہ میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ تسبیح کے لینے اور اس کے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔کیونکہ حدیث میں ہے کہ ایک خاتون کے پاس جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس کے ہاتھ میں کھجور کی گھٹلیوں یا کنکریوں کو دیکھا جن پر وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔آپؐ نے فرمایا میں تمہیں اس سے بھی افضل اور سہل ترین چیز بتلاتا ہوں،اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے اس خاتون کو کنکریوں اور گھٹلیوں پر تسبیح پڑھنے سے منع نہیں فرمایا ہے بلکہ اس سے بھی افضل اور سہل چیز کے استعمال کی جانب رہنمائی کی ہے اور اگر یہ چیز مکروہ ہوتی،تو رسول اللہ ﷺ اس کو ضرور بیان فرماتے۔

تسبیح اگر زیادہ مقدار میں پڑھنا ہو تو الگ الگ کنکریوں پر پڑھنا مشکل ہے۔البتہ کسی دھاگے یا اور کوئی چیز سے منسلک کردیا جائے تو زیادہ مقدار میں پڑھی جاسکتی ہے۔تسبیح کے استعمال کی ممانعت میں صحابہ کرام سے کوئی اثر بھی منقول نہیں ہے۔ہاں اسکی وجہ سے نام و نمود اور اظہار تقدس مقصود ہو تو البتہ یہ صورت ممنوع ہے۔اور یہ بات''بحرالرائق'' سے ابوالسعود نے نقل کی ہے۔

تسبیح کے استعمال کے جواز پر علامہ جلال الدین سیوطی نے ایک کتاب مُنحه فی السُّجه کے نام سے تحریر کیا ہے۔اس میں لکھتے ہیں کہ قاضی ابوالعباس احمد بن خُلّکان نے کتاب''وفیات الاعیان نے احوال ابناء الزمان'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ ایک دن

حضرت ابوالقاسم جنید ابن محمد کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی گئی اور ان سے کہا گیا، کیا آپ بھی اس شرافت و بزرگی کے باوجود ہاتھ میں تسبیح لیتے ہیں؟ فرمانے لگے اسی تسبیح کی راہ سے میں نے اپنے پروردگار تک رسائی حاصل کی ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔

یہی قاضی ابوالعباس احمد بن خُلکان آگے فرماتے ہیں: میں نے تسبیح کے باب میں ایک حدیث مسلسل دیکھی ہے اور وہ یہ ہے :

ہمارے شیخ امام ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر بن عبداللہ نے مجھ کو ان الفاظ میں اور اس حال میں خبر دی کہ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھی۔ یہ انہوں نے کہا کہ امام ابوالعباس احمد بن ابوالمحاسن یوسف بن الانباسی نے ہم کو یہ خبر دی جبکہ میں ان کے آگے پڑھ رہا تھا، اور میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ انہوں نے کہا کہ ابوالمظفر یوسف بن محمد مسعود الترمذی نے جب ہم کو خبر دی تو ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی، انہوں نے کہا، میں نے اس حدیث مسلسل کو اپنے شیخ ابوالثناء کے سامنے پڑھا اور دیکھا تو ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح موجود ہے۔ انہوں نے کہا ابوعبدالصمد بن احمد بن عبدالقادر نے ہم کو یہ حدیث بیان کی اس حال میں کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ انہوں نے کہا کہ خبر دی ہم کو ابومحمد یوسف بن ابوالضرح عبدالرحمٰن بن علی نے اس حال میں کہ میں نے دیکھا، ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے والد عبدالرحمٰن بن علی نے ہمیں خبر دی اور میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حدیث پڑھی علی بن ابوالفضل بن ناصر کے سامنے اس حال میں کہ ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح موجود ہے۔

انہوں نے کہا کہ میں نے ابومحمد عبداللہ بن احمد السمر قندی کے آگے حدیث پڑھی، میں نے دیکھا تو ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح ہے۔ اور ابومحمد عبداللہ نے کہا کہ میں نے میرے استاد سے یہ پوچھا کیا آپ نے ورایت فی یدہ مسبحۃ (میں نے ان کے ہاتھ میں تسبیح کو

دیکھا) والی مسلسل حدیث کو حضرت ابوبکر محمد بن علی السلمی الحدّاد سے سنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں نے اسی طرح سنا اور اسی حالت میں سنا کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابونصر عبدالوہاب بن عبداللہ بن عمر المقری کو دیکھا اور ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح تھی۔ اور انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوالحسن علی بن حسن المالکی کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور حضرت عبدالوہاب بن عبداللہ نے کہا کہ میں نے جب اپنے شیخ ابوالحسن علی بن حسن کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی اور وہ وقد رأیت فی یدہ مسبحةً والی روایت بیان کر رہے تھے تو میں نے حیرت سے پوچھا، اے میرے استاذ! کیا آپ ابھی تک تسبیح کے ساتھ منسلک ہیں اور اسکو برابر اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے استاد حضرت جنیدؒ کو دیکھا کہ وہ اس حدیث کی روایت کے وقت اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھے ہوئے تھے اور حضرت جنید نے بھی اپنے استاد سے یہی سوال کیا تھا تو انہوں نے ان کو یہ جواب دیا کہ میں نے بھی اسی طرح اپنے استاذ حضرت سری سقطیؒ کو اس حالت میں دیکھا کہ انہوں نے بھی اس حدیث کی روایت کے وقت اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھی تھی، اور حضرت جنید نے پھر فرمایا کہ میں نے اپنے استاد سے یہ سوال بھی کیا تھا کہ اے میرے استاذ! اس تسبیح پر آپ کی یہ مداومت کیسی؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میرے استاذ حضرت معروف کرخی کو اسی حالت میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح موجود تھی اور جو بات تم نے مجھ سے پوچھی، یہی میں نے بھی ان سے پوچھی تو فرمایا میرے استاذ حضرت بشر حافی کے ہاتھ مین بھی تسبیح رہتی تھی اور میں نے انہیں اسی طرح دیکھا اور ایسا ہی سوال ان سے بھی کیا جیسا کہ تم نے کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ میرے استاذ حضرت عمر المالکی کو اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھ کر روایت حدیث کرتے ہوئے دیکھا۔ اور جو اشکال تمہیں واقع ہوا ہے، یہی اشکال میں نے اپنے شیخ کی خدمت میں بھی پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے بھی میرے استاد

سید الطائفہ حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ کو اسی حالت میں دیکھا ہے کہ ان کے دست مبارک میں بھی اس روایت حدیث کے وقت تسبیح موجود تھی۔

حضرت عمر مالکی کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے شیخ سے حیرت واستعجات کے ساتھ دریافت کیا کہ اے میرے استاذ محترم ! آپ اس جلالت شان ،عظمت مقام اور حسن عبادت وریاضت سے آراستہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھے ہوئے ہیں،اب اسکی کیا ضرورت ہے؟ اس پر آپ نے جواب دیا۔ یہ وہ چیز (تسبیح) ہے جس کا ہم نے ابتدائے سلوک میں التزام کیا تھا اب انتہائے سلوک میں اس کو نہیں چھوڑیں گے،اوراس پر ہمیشہ انتہائے مداومت رہیگی۔ اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد میرے دل، میرے ہاتھ اور میری زبان پر جاری ہو جائے۔ اگر تسبیح کے استعمال میں ایسی بات نہ ہوتی تو یہ ان بزرگوں کی عادات کے موافق بھی نہ ہوتی۔ اوران کے مسلک میں داخل ہوکران کی برکتوں کے حصول کا ذریعہ بھی نہ بنتی۔ جب یہ چیز بزرگوں کے فیوض وبرکات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے تو ایسی صورت میں اسکی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے لہٰذا کس طرح اسکو نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ اس کے ذریعہ اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور قلب ذکر الٰہی کی جانب مائل ہو جاتا ہے اور ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی مسلمان تسبیح کو دیکھے اوراس کے اندر ذکر اللہ کا شوق پیدا نہ ہو۔ یہ بھی اس کے استعمال کے عظیم ترین فائدوں میں سے ایک ہے اوراسی وجہ سے بعض سلف صالحین نے اس کو تسبیح (خدا کی پاکی بیان کرنے) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اوراس تسبیح کے فائدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسکی وجہ سے ذکر پر مداومت اور مواظبت حاصل ہوتی ہے،اور جب بھی اس پر نظر پڑتی ہے تو ذکر کے اسباب و آلات کی تحریک ہوتی ہے جس سے ذکر کی طرف مائل ہو جانا پڑتا ہے اور کیا ہی خوب ہے وہ ذریعہ جس کی وجہ سے ذکر اللہ پر مداومت حاصل ہوتی ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس

تسبیح کو حبل الوصل (اللہ تک پہنچنے کی رسی) کا نام دیا تو بعض نے اسکو رابطة القلوب (دلوں کو جوڑنے والی) سے تعبیر دی۔

نیز اسی رسالہ "منحه فی السبحة" میں علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں: اے میرے بھائی! اس روشن مبارک آلہ (تسبیح) کو دیکھ، جس میں دنیا و آخرت کی بھلائی جمع ہوگئی ہے۔ ذکر کی گنتی بڑھانے کے لئے تسبیح کے لینے کو اور اس کے استعمال کرنے کو ممنوع قرار دیا ہو۔ ایسا اگلے اور پچھلے بزرگان دین میں سے کسی نے بھی نقل نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اکثریت تو ذکر کے عدد کو تسبیح کے ذریعہ بڑھا کر پوری کرنی تھی اور کسی نے بھی اس تسبیح کے لینے کو مکروہ قرار نہیں دیا۔

ان بزرگوں میں سے بعض حضرات سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے جب ذکر اللہ کی تعداد تسبیح سے پوری کی تو ان سے کہا گیا کہ کیا اللہ پر گنتی کرتے ہو؟ اور اس سے دشمنی مول لیتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں: ایسی بات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے گنتی کررہے ہیں اور بے شک اکثر اذکار اور اوراد جو لاتعداد ہوں، اور گنتی کے ذریعہ شمار کئے جاتے ہوں اور جن کا ثبوت سنت نبوی میں موجود ہو تو اصل میں اس تسبیح کے واسطہ سے ان کی تکمیل مقصود ہے کیونکہ انگلیوں پر تعداد و گنتی کو مکمل کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے اگر بالفرض مان لیجئے کہ انگلیوں پر تعداد کی تکمیل ممکن ہے تو ایسی صورت میں ذہن انگلیوں اور ان کے اشاروں اور اعداد کی طرف منتقل ہو جائے گا، جس سے خشوع و خضوع جاتا رہے گا حالانکہ یہی اصل مغز اور مقصود ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی اپنی کتاب "الانتباہ فی سلاسل الاولیاء" میں اس حدیث مسلسل کو خیر التابعین حضرت حسن بصریؒ تک پہنچایا ہے۔ اور شیخ ابو العباس احمد بن ابوبکر الرداد سے یہ نقل کیا ہے کہ یہاں حضرت حسن بصری کے قول سے یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ حضرات صحابہؓ کے زمانے میں تسبیح بنائی ہوئی موجود تھی جیسا کہ انہوں نے فرمایا: یہ وہ چیز (تسبیح) ہے جسے ہم سلوک کے ابتدائی دور ہی سے پکڑے ہوئے ہیں اور بلاشبہ حضرت حسن بصریؒ کا ابتدائی دور یقیناً عہد صحابہ سے پیوست اور ملا ہوا ہے کیونکہ ان کی ولادت خلافت فاروقیؓ کے آٹھ سال اور چھ ماہ کے بعد ہوئی۔ اور انہوں نے حضرت عثمان، حضرت علی، اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا۔ اور وہ حضرت عثمانؓ کے ایام قید وحبس کے حاضر باش تھے اور اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی اور انہوں نے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عمران بن حصین، حضرت معقل بن یسار، حضرت ابوبکر، حضرت ابوموسیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ اور دیگر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے روایت کی ہے۔

حاصل کلام! بعض لوگوں نے تسبیح کے استعمال کو بدعت ضلالت کہا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی کو بدعتی کہا ہے، یہ محض ان کی نادانی اور بے علمی کی دلیل اور گستاخی و بے ادبی کی نشانی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۵)

# خطبہ میں عصا کا سہارا لینا

نیز جاننا چاہئے کہ خطبہ میں عصا یا اس کے سوا کسی لکڑی سے سہارا لینا مسنون ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ جیسا کہ کتاب بحرالرائق میں مذکور ہے۔ اور بعضوں نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے جیسا کہ کتاب ''خلاصہ'' میں مرقوم ہے۔ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی

''شرح سفر السعادۃ''میں فرماتے ہیں کہ:

تلوار(برہنہ) اور نیزہ کو ہاتھ میں نہ رکھے بلکہ کسی کمان یا عصا پر ٹیک لگائے اور سہارا لے،اور فقہاء حنفیہ کی بعض روایات میں ہے کہ کمان یا عصا پر ٹیک لگانا مکروہ ہے۔لیکن قول صحیح یہ ہے کہ سنت سے ثابت ہونے کی وجہ سے عصا کا ہاتھ میں لینا مکروہ نہیں ہے۔

اور حضرت شیخ فتح محمد محدث ''صاحب مفتاح الصلوٰۃ'' نے بھی اختلافات نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرمایا ہے کہ صحیح احادیث کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصا کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مسنون ہے۔اس مسئلہ میں بعض عوام کے غلو کی بھی حد ہوگئی کہ انہوں نے عصا کے استعمال کو ناجائز کہہ دیا اور عصا لینے والے کو گمراہ قرار دے دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(٦)

# تثویب یعنی نماز کے لئے اذان کے بعد پھر دوسری مرتبہ بلانا

نیز جاننا چاہئے کہ تثویب کا دوسرا نام تکریر دعوت نماز ہے یعنی ایک بار کے بعد دوسری بار بلانا۔یہ حضرات صحابہؓ کے دور میں سوائے فجر کی نماز کے اور کسی نماز کے لئے مقرر نہ تھا کیونکہ فجر کا وقت ہی غلبہ اور سستی کا وقت ہوتا ہے۔مگر متاخرین مثلاً حضراتِ تابعین اور تبع تابعین وغیرہم نے نماز مغرب کے سوا دیگر نمازوں کے لئے بھی تثویب (دوبارہ بلانا) کو مستحسن جانا۔

صاحب مختصر الوقایہ فرماتے ہیں: ہر نماز کے لئے تثویب ایک اچھا طریقہ ہے۔اور ''مختصر الوقایہ'' کی شرح جامع الرموز''میں زاہدی سے یہ نقل کیا ہے کہ علامہ سرخسیؒ اور صدر القضاۃ نے اسی قول کو اختیار کیا۔

اور فتاوائے عالمگیری میں ہے کہ علمائے متاخرین کے پاس مغرب کے سوا ہر نماز کے لئے تثویب مستحسن ہے۔ شیخ ابوالمکارم کی کتاب ''شرح النقایہ'' میں اسی طرح مذکور ہے۔

صاحب ترجمہ ھدایہ لکھتے ہیں کہ حضرت صحابہ کے دور کے بعد علماء کوفہ نے اپنے زمانے میں جب یہ دیکھا کہ لوگوں کے حالات بدل گئے ہیں اور ان سے نماز با جماعت کے لئے مسجد کی حاضری میں سستی و کاہلی ظاہر ہونے لگی ہے تو اب تثویب کو اختیار کیا۔ رہی صبح کی نماز کی تثویب یہ تو متقدمین سے چلی آرہی ہے اور ان کے قول کے ساتھ مخصوص ہے۔

نیز صاحب ترجمہ ھدایہ لکھتے ہیں امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ (اسلامی حکومت میں) موذن خلیفہ وقت کو ہر نماز کی تثویب میں خاص طور پر اسی کو اس طرح بلائے تو کوئی حرج نہیں السلام علیک ایھا الامیر ورحمة الله وبرکاته حی علی الصلوٰة حی علی الفلاح الصلوٰة یرحمک الله اور امام محمدؒ اس تثویب کو خلیفہ کے حق میں ایک ناروا و نازیبا حرکت تصور فرماتے ہیں۔ کیونکہ نماز با جماعت کے حکم میں خلیفہ اور دیگر مسلمان دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا تثویب میں خلیفہ کے ذکر کی تخصیص ٹھیک نہیں۔

اور امام ابو یوسف نے خلیفہ کے ذکر کی تخصیص کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ وہ امورِ سلطنت میں زیادہ مشغول اور منہمک رہتا ہے اس لئے اس کو خصوصیت کے ساتھ نماز با جماعت کی ادائیگی کے لئے بلانا چاہئے تاکہ وہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کر سکے اور اس سے جماعت چھوٹ نہ سکے۔

قاضی اور مفتی صاحبان کی تخصیص کے مسئلہ میں بھی یہی اختلاف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ تثویب ایک امر معروف ہے اور یہ امر معروف بھی فقہائے کرام کے مستحسنات میں سے ہے۔ اور استحسان، قیاس میں داخل ہے اور قیاس چار شرعی دلائل میں سے چوتھی دلیل ہے جس کی تفصیل مقدمہ اولیٰ میں گذر چکی ہے۔ بعضوں نے اس تثویب کو بدعت

ضلالت سے تعبیر کیا ہے۔اوراس طرح انہوں نے ایک امر معروف سے نہی بالمعروف کا کام انجام دیا ہے۔یہ افراط محض قلت استعداداور بے اصل اجتہاد کے دعویٰ کی کھلی دلیل ہے۔اللہ ان لوگوں کوتوفیق وہدایت عطا فرمائے کہ وہ سنت و جماعت کے صراط مستقیم پر چل سکیں ،اور افراط وغلو سے باز رہ سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲)

# مکلّف کے فعل سے متعلق ھے

واضح ہو کہ مکلّف کا فعل مشروع ( شریعت کے موافق ) ہے یا غیر مشروع (شریعت کے مخالف) فعل مشروع کی چار قسمیں ہیں:۔فرض، واجب،سنت اور مستحب۔

فعل مشروع کی دوقسم ہیں: حرام اور مکروہ

فعل مشروع جس کے ترک کرنے ،اور چھوڑ دینے کی ممانعت،اگر دلیل قطعی سے ثابت ہے تو اس کوفرض کہیں گے۔اوراس کے ترک کرنے کی ممانعت،اگر دلیل ظنی سے ثابت ہے تو اس کوواجب کہیں گے۔اور فعل مشروع جس کے ترک کرنے کی ممانعت نہیں ہے،اگر وہ طریق مسلوک فی الدین ہے تو اس کوسنت کہیں گے، ورنہ نفل اور مندوب کہیں گے۔

طریق مسلوک کا معنی اور مطلب یہ ہے کہ اس فعل مشروع کی ادائیگی پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت اور ہمیشگی فرمائی ہو،اور ایک یا دومرتبہ آپ سے یہ عمل ترک ہوگیا ہواور اگر آپ سے یہ عمل تین مرتبہ ترک ہوگیا ہوتو وہ سنت نہیں رہا بلکہ مستحب ہے۔ظاہر ہے

کہ اس سے عدم سے وجود کی زیادتی مراد ہے۔

اور جس عمل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت اگر عبادت کے طریق سے تھی تو اس کو سنّتِ ھدیٰ اور سنّتِ مؤکدہ کہیں گے۔ جیسے اذاں، اقامت، جماعت اور ختنہ وغیرہ۔ اگر یہ مواظبت عادت کے طور پر تھی۔ جیسے قیام، قعود اور لباس وغیرہ، میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عادتیں اور خصلتیں تھیں، ان کو سنّتِ زوائد کہیں گے۔

مستحبّ ایسا عمل ہے جس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت و مواظبت نہ کی ہو، اس عمل کو سلف یعنی صحابۂ کرام، تابعین، مذاہب اربعہ کے اصحاب اور صلحاء، پسندیدہ نظر سے دیکھے ہوں۔

فعل غیر مشروع جس کے کرنے کی ممانعت اگر دلیل قطعی سے ثابت ہو تو اس کو مکروہ تحریمی کہیں گے۔ اور فعل غیر مشروع جس کے کرنے کی ممانعت نہیں ہے تو اس کو مکروہ تنزیہی کہیں گے جیسا کہ امام محمدؒ نے وضاحت کی ہے۔

اور حضرات شیخین امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ غیر مشروع فعل جس کے کرنے کی ممانعت آئی ہوئی ہو تو اس کو حرام کہیں گے۔ اور ممانعت نہ ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ یہ فعل غیر مشروع حرام سے قریب تر ہے یا حلال سے قریب تر۔ اگر حرام سے قریب تر ہے تو کراہت تحریمی کے ساتھ مکروہ ہے اور اگر حلال سے قریب تر ہے تو کراہت تنزیہی کے ساتھ مکروہ ہے۔

کراہت تحریمی کا معنی یہ ہے کہ اس کا کرنے والا تنبیہ اور تاکید کا مستحق ہے اور اس کو شفاعت سے محروم رہنے والے کی طرح، دوزخ کا عذاب نہیں ہوگا۔ اور کراہت تنزیہی کا معنی یہ ہے کہ اس کا کرنے والا عقوبت و سزا کا مستحق نہیں ہے لیکن اس کے نہ کرنے پر ادنیٰ ثواب دیا جائے گا۔

فعل مشروع کی اقسام میں فرض کا حکم یہ ہے کہ اس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخص جو فرض متفق کو جان بوجھ کر ان کا انکار کر دے تو وہ کافر ہے۔

اور واجب کا حکم ہے کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس کا جاننا ضروری نہیں، حتیٰ کہ اس کا انکار کرنے والا کافر نہیں ہوگا۔ اور فرض کے ادا کرنے پر ثواب دیا جائے گا اور اس کو بغیر عذر کے ترک کرنے پر دوزخ کا عذاب دیا جائے گا۔ نیز واجب کے ادا کرنے پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ لیکن واجب کا ثواب، فرض کے ثواب سے کم تر ہوگا۔

اور واجب کو حقیر اور معمولی سمجھتے ہوئے ترک کرنا، اخبار احاد کی رو سے فسق کا موجب ہے، اور کسی تاویل کی بنیاد پر ترک کرنا، موجب فسق نہیں ہے۔

اور سنن ھدیٰ کا حکم یہ ہے کہ ان کی ادائیگی اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اور یہ ثواب درجہ میں واجب کے ثواب سے کم تر ہے۔ اور سنن ھدیٰ کا ترک کرنا، دنیا میں سرزنش و ملامت کا موجب ہے، اور آخرت میں حرمانِ شفاعت کا باعث ہے اور ان کے ترک کرنے پر دوزخ کا عذاب، واجب نہیں ہوتا، جیسا کہ امام محمدؒ کی رائے ہے۔ سنن زوائد اور مستحب کا حکم ایک ہی ہے۔ اُن کی ادائیگی باعثِ ثواب ہے اور ان کا ترک کرنا باعثِ عذاب نہیں ہے۔

غیر مشروع فعل کی اقسام میں حرام کا حکم یہ ہے کہ اللہ کے خاطر اس کا ترک کرنا ثواب کا موجب ہے، اور بغیر کسی عذر کے اور مجبوری کے، حرام کا ارتکاب کرنا عقوبت و سزا کا مستحق ہے اور حرام متفق کو حلال جاننا کفر ہے۔

مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اللہ کے خاطر اس کا ترک کرنا ثواب ہے اور اس کے کرنے پر عذاب کا خوف و اندیشہ ہے اور اس کو حلال سمجھنے پر کفر لازم نہیں آتا۔

مفسد تیسری قسم ہے جو فعل غیر مشروع کے تابع ہے اور یہ وہ عمل ہے جس سے عمل مشروع میں نقص اور خرابی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے اثنائے نماز میں لوگوں سے کلام کرنا اور مفسد کا

حکم یہ ہے کہ اس کو عمداً کرنے پر عذاب لازم آئے گا اور سہواً کرنے پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔

ان مقدمات کی تفصیل ''توضیح وتلویح'' اور تمام اصول کی کتابوں اور مفتاح الصلوٰۃ، اور ''شرح نامِ حق'' وغیرہ میں ملاحظہ کی جائے۔

مفتاح الصلوٰۃ کے مصنف نے سنت کے حکم سے متعلق جو تصریح کی ہے وہ بھی یہاں پڑھ لینی چاہئے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جس سنت کا ثبوت، خبر واحد سے ہو تو اس کا انکار کرنے والا گنہ گار اور بدعتی ہوگا اور جس سنت کا ثبوت خبر مشہور سے ہو تو اس کا انکار کرنے والا فاسق ہوگا۔ اور جس سنت کا ثبوت خبر متواتر سے ہو تو اس کا انکار کرنے والا کافر ہوگا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر کوئی شخص سنت کا انکار از راہ تحقیر واہانت کر رہا ہے تو وہ کافر ہے خواہ اس سنت کا ثبوت خبر واحد، یا خبر مشہور، یا خبر متواتر سے ہو۔

بعض محقق فقہاء مثلاً صاحب بحر الرائق وغیرہ نے سنت مؤکدہ (جس پر عمل کرنے کی شدید تاکید وارد ہے) کو واجب کے مثل قرار دیا ہے اس کے ترک کرنے پر وہی گناہ لازم آئے گا جو ترک واجب پر لازم آتا ہے اور اس سنت پر عمل کرنے میں سستی و کاہلی کی جائے اور بے باکی اور بے خوفی ظاہر کی جائے تو کفر کا خوف ہے اور اگر اس کے ادا کرنے سے خود کو قاصر سمجھے تو عفو کی امید ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی مالکی ''فتوحات مکیہ'' کے ۹۸ ویں باب میں مکلّف کے فعل سے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: پھر حکم امر اور نہی کی جانب منقسم ہوتا ہے پھر امر مخیّر فیہ (مباح) اور مرغب فیہ کی جانب منقسم ہوتا ہے، پھر مرغب فیہ کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جس کا ترک کرنا شرعاً مذموم اور ناپسندیہ ہے اور وہ واجب اور فرض ہے۔

اور دوسری قسم وہ ہے جس کا کرنا شرعاً محمود اور پسندیدہ ہے اور وہ ہے مندوب ہے،

اوراس کا ترک کرنا مذموم ہے۔

اور نہی کی دو قسم ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس کا کرنا مذموم ہے، وہ حرام ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کا نہ کرنا محمود ہے اور اس کے کرنے پر مذمت نہ ہوگی اور وہ ہے مکروہ۔

ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مشروع اور غیر مشروع فعل کی اقسام کو ضبط ذہن رکھے۔ اور جائز و ناجائز اور حرام و مکروہ کی حدود پہچانے، تاکہ اہلِ سنت و جماعت کے مسلک پر قائم رہنا سہل ہو سکے اور افراط و تفریط سے محفوظ رہ سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر(۳)

# تکالیف شرعیہ سے متعلق ھے

واضح ہو کہ جب تک بندہ عاقل و بالغ ہے وہ تکالیف شرعیہ کے دائرے سے خارج نہیں ہوسکتا لہذا فرقۂ ملاحدہ اور اباحیہ کا یہ کہنا کہ بندہ دائرۂ تکلیف سے خارج ہوسکتا ہے یہ عقیدہ لغو اور باطل ہے۔ علامہ تفتازانی ''شرح عقائد نسفی'' میں لکھتے ہیں:۔

تکالیف کے باب میں وارد شدہ عام خطابات اور مجتہدین کے اجماع کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ بندہ جب تک عاقل اور بالغ ہے اس کے ذمہ سے شرعی احکام ساقط نہیں ہوسکتے، اور فرقۂ اباحیہ کے بعض افراد اس بات کے قائل ہیں کہ جب بندہ نفاق کے بغیر کفر پر ایمان کو پسند کیا اور وہ محبت کی انتہا پر پہنچ گیا اور اس کا قلب صاف ہو گیا تو اس کے ذمہ سے شریعت کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہونے کے باوجود بھی دوزخ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ اور اباحیہ گروہ کے بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں کہ ظاہری

عبادات، مثلاً نماز روزہ وغیرہ اس سے ساقط ہوجاتے ہیں اور تفکر ہی اس کی عبادت ہوتی ہے۔

اس قسم کا اعتقاد، سراسر کفر اور انتہائی گمراہی و ضلالت ہے کیونکہ تمام انسانوں میں انبیائے کرام ہی ایمان ومحبت الٰہی میں کامل و مکمل ہیں اور ان میں سے بالخصوص خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایمان ومحبت الٰہی میں کامل ترین ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان حضرات کرام کے ذمہ سے احکام شرعیہ ساقط نہیں ہوئے اور یہ حضرات دائرۂ تکلیف سے خارج نہیں ہوئے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی (اذا احب اللّٰــہ عبداً لم یضرہ ذنب، جب خدا کسی بندے کو اپنا محبوب بنالے تو گناہ کا ضرر اس کو نہیں پہنچے گا) کا معنی ومطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو اپنا محبوب بنالے تو وہ گناہوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں تحریر فرماتے ہیں: انسان اور جن کا کوئی بھی فرد دائرۂ تکلیف سے خارج نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کے اندر عقل وشعور موجود ہے۔ بھلے سے وہ قرب اور اتصال کے آخری درجات ومراتب پر فائز ہوجائے۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اے میرے عزیز بھائی! یہ بات اچھی طرح خوب ذہن نشین کرلو کہ جب تک دنیا قائم رہے کسی بالغ شخص سے احکام شرعیہ ساقط ہوجائیں، یہ ناممکن اور محال ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا، تو وہ شخص جس کی ذات سے حجابات ختم ہوجائیں تو اس سے تکالیف شرعیہ بھی ختم ہوجائیں گے۔ کیونکہ بندہ اس مقام پر پہنچنے کے بعد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو فاعلِ حقیقی دیکھتا ہے، اور اہلِ سنت وجماعت میں کوئی بھی اس خیال اور عقیدہ کا حامی اور قائل نہیں۔

اور بعض صوفیائے کرام کا یہ قول کہ جب سالک اس مقام پر پہنچ جائے تو اس سے تکلیف ساقط ہوجاتی ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ سالک سے عبادت وطاعت کی

کلفت ومشقت اٹھادی جاتی ہے۔اور وہ عبادت سے تنگ دل اور زچ نہیں ہوتا۔جس طرح اس مرتبہ سے پہنچنے سے پہلے عبادت میں اس کو دشواری اور سختی معلوم ہوتی تھی، وہ زائل ہوجاتی ہے بلکہ اس کو عبادت میں لذت وسرور اور کیف ونشاط حاصل ہونے لگتا ہے۔

نیز اسی کتاب میں شیخ شعرانی لکھتے ہیں:

برادر من! اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو بظاہر پنجگانہ پڑھتے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن ان میں سے مختلف اشخاص مختلف مقامات مثلاً مسجد الحرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ، جبل ق، قبلہ آرین، کوہ طور اور سد سکندریہ میں نماز ادا کرتے ہیں۔

ایسے بزرگوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرلینا اور یہ کہنا کہ یہ نماز کو ترک کرنے والے ہیں بڑی غلطی ہے۔اور ان اللہ والوں کی کچھ ایسی نشانیاں اور علامات ہیں جن سے وہ تارکینِ صلوٰۃ (جو سستی اور کاہلی سے نماز نہیں پڑھتے) سے ممتاز نظر آئیں گے۔اور خود سیدنا عبدالقادر دسطوطی نے مجھ سے کہا کہ باشندگانِ مصر نے کئی مرتبہ یہ بات کہہ دی کہ عبدالقادر نماز نہیں پڑھتے ہیں، خدا کی قسم ہم کبھی نماز نہیں چھوڑتے لیکن ہماری کچھ جگہیں اور مقامات ہیں جن میں ہم نماز ادا کرلیتے ہیں۔

یہ بات میں نے سیدنا محمد بن عنان رضی اللہ عنہ سے سنائی تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ عبدالقادر نے سچ کہا، ان بزرگوں کے لئے کچھ مخصوص مقامات ہیں جن میں وہ نماز ادا کرلیتے ہیں۔

اور شیخ محمد عنان نے یہ بھی فرمایا، کہ سید ابراہیم المتبولی کو کبھی کسی نے نماز ظہر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔چنانچہ ان کے بارے میں لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ابراہیم پر اللہ نے ظہر فرض نہیں کی ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ رملۃ لذ، کی جامع ابیض میں نماز ظہر ادا کرتے تھے۔ اور یہی عمل سید علی الخواص کا بھی تھا۔وہ بھی ہمیشہ جامع مذکور ہی میں نماز ظہر ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شیخ بدر الدین انشاوی نے سید ابراہیم المبتوی سے پوچھا، اے شیخ کیا آپ پر نماز ظہر فرض نہیں ہے؟ شیخ تو خاموش رہ گئے۔ لیکن شیخ یوسف کردی نے مجھے بتلایا کہ انہوں نے متعدد بار جامع ابیض میں سید ابراہیم کے ساتھ نماز ظہر پڑھی ہے۔ اس روز میں نے زعفرانی رنگ کے نحیف البدن نوجوان کو امامت کرتے ہوئے دیکھا۔ اور میں نماز ظہر کے وقت سید عبدالقادر سطوطی کے پاس جا پہنچا۔ اذاں ہوئی تو وہ پہلو کے بل لیٹ گئے اور فرمایا کہ مجھے چادر اڑا دی جائے۔ ہم نے ان کے اوپر چادر اڑا دی۔ اس کے بعد ہم نے ان کو چادر کے نیچے نہیں پایا۔ پھر وہ پندرہ منٹ کے بعد آپہنچے۔

اور سید علی الخواص بھی اذان ظہر کے بعد تھوڑی دیر اپنی دکان بند کر لیتے تھے، پھر دروازہ کھول دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ لوگوں نے دکان کا دروازہ کھولا تو اس کے اندر ان کو موجود نہیں پایا۔

بعض فقہائے کرام، اولیاء کرام کے حق میں طئی زمان اور مکان کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حضرات انبیاء کرام کی خصوصیت ہے، لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک اولیاء اللہ کو بھی طئی مکان وزمان کی نعمت حاصل ہے۔ چنانچہ صاحب ''حصن الاسلام'' (کلمات کفر میں ایک کتاب ہے۔ مترجم) ''کتاب الاشباہ والنظائر'' سے نقل کرتے ہیں کہ فقہاء نے اختلاف کیا ہے، اس شخص کی تکفیر میں جو اس بات کا قائل ہے کہ ولی تھوڑے سے وقت میں مسافت بعیدہ کو طئے کر سکتا ہے۔

بزازیہ میں مرقوم ہے کہ علامہ زعفرانی سے پوچھا گیا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو یہ زعم کرتا ہے کہ اس نے ابن ادہم کو ترویہ (آٹھ ذی الحجہ) کے روز کوفہ میں دیکھا اور اسی روز مکۃ المکرّمہ میں بھی دیکھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا۔ حضرت ابن مقاتل ایسے شخص کو کافر کہا کرتے تھے اور فرماتے تھے، کہ طئے زمان ومکان کا

تعلق، معجزات سے ہے، کرامات سے نہیں۔ لیکن میں ایسے شخص کو جاہل اور نادان سمجھتا ہوں اور اس کو کافر کہنے سے اجتناب کرتا ہوں۔

اور اسی طرح یہ جو حکایت بیان کی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ خوارزم میں فجر کی سنت پڑھتے ہیں اور فرض مکۃ المکرّمۃ میں پڑھتے ہیں، یہ بات بھی جہالت پر مبنی ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ جن چیزوں کا تعلق معجزات کبار سے ہے، مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، طعامِ قلیل سے گروہ کبیر کا شکم سیر ہو کر کھانا، انگلیوں سے پانی جاری ہونا۔ کسی ولی کی کرامت سے ظاہر ہونے والی چیز نہیں بلکہ معجزات کی قبیل سے ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین میرے لئے سمیٹ دی گئی ہے (چنانچہ ملک شام سے مکہ مکرمہ واپس آتے وقت تین دن کی مسافت کو ایک دن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طے کیا تھا) لہذا طئے مکان کو غیر نبی کے حق کی طرح ہے، اور یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت ہے۔ لیکن کتاب الدعویٰ میں قاضی امام ابوزید کے کلام سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طئے مکان کا قائل کافر ہے۔

صاحب الفصولین فرماتے ہیں:

طئے زمان و مکان کے قائل کی تکفیر نہیں کرنی چاہیئے اور نہ اسکو جاہل اور بے علم کہنا چاہئے کیونکہ یہ چیز اولیاء اللہ کی کرامات سے تعلق رکھتی ہے۔ انبیائے کرام کے معجزات سے نہیں۔ اس لئے کہ معجزات میں مقابلہ اور چیلنج ضروری ہے، اور اس میں مقابلہ کی کوئی صورت نہیں ہوئی۔ لہذا یہ معجزہ نہیں بلکہ کرامت ہے اور کرامت کا صدور اہل سنت و جماعت کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ زعفرانی فرماتے ہیں:

میری رائے یہ ہے کہ صاحب الفصولین نے طئے زمان و مکان کے قائل کی عدم

تکفیر کا جو موقف اختیار کیا ہے اس کی صحت میں کسی ذی علم کو شک نہیں ہونا چاہئے اور اس میں شک و تردد کی بات بھی کیا ہے جب کہ علامہ تفتازانی جیسے مستند اور معتمد عالم نے ''عقائد نسفی'' میں طئے زمان و مکان کے جائز، اور صحیح ہونے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ قلیل مدت میں مسافت بعیدہ کا طے کرنا، ضرورت و حاجت کے وقت، لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کا حاضر ہونا۔ پانی اور ہوا پر چلنا، جمادات اور گونگوں کا کلام کرنا وغیرہ جیسے امور، اولیاء اللہ سے خرق عادت کے طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ میرا ظن غالب ہے طئے زمان و مکان کے قائل کو کافر کہنے والا کسی حد تک معتزلی ذہنیت کا آدمی ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی نے بھی مکتوبات کی جلد دوم کے ۵۸ ویں مکتوب میں تھوڑے وقت میں مسافتِ بعیدہ طئے کر لینے کو اولیاء اللہ کی کرامات میں شمار کیا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ عقل، تکلیف کی شرط ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اسی فائدہ میں گذر چکی۔ لہذا ایسا شخص جس کی عقل زائل ہو چکی ہے وہ مکلّف نہیں ہے۔ اور ولی جب فنافی اللہ کے مرتبہ اور مقام ولایت پر پہنچ جاتا ہے تو وہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔

ایک حالت یہ ہے کہ وہ کلی طور پر عقل سے عاری اور خالی ہو جاتا ہے اور ہمیشہ سکر و بے خودی کے عالم میں رہتا ہے۔ ایسے شخص کو مجذوب مطلق کہتے ہیں، اس قسم کے مجذوب افراد قابل عفو ہیں اور منجانب اللہ مواخذہ سے بری ہیں۔ اور ان پر تکالیف شرعیہ عائد نہیں ہوتیں کیونکہ تکلیف، عقل کی فرع ہے اور یہ مجذوب لوگ مجنونان حق ہیں۔ لہذا ان کے متعلق صحیح موقف یہی ہے کہ نہ ان کی تقلید کی جائے اور نہ ان پر ملامت کی جائے۔ مثنوی

گشتہ اند ایں قوم ثرخانِ خدا　　　کئے بود انکارِ ایشاں خود روا

روبصدق دل بجوزیشاں نظر　　منکر وتابع مشوائے بے خبر

اس طائفہ کوخود اللہ نے تکالیف شرعیہ سے آزاد کر دیا ہے لہذا کیونکر ان پر لعن وطعن اور نکیر درست ہوسکتی ہے۔صدق دل کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری دے اوران کی نظر سے تلاش کر۔اے بے خبر ان کی اتباع نہ کر،اوران پر ملامت بھی نہ کر۔

دوسری حالت یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو فنا کے بعد لقائے حق کے ساتھ باقی رکھا جاتا ہے اور ناقص اشخاص کی تکمیل کے واسطے،توحید کے استغراق وسکر سے صحو بعد المحو اور بقا بعد الفنا کے ساحل پر لے آیا جاتا ہے۔ایسے ولی کوولی کامل ومکمل کہتے ہیں۔

حاصل کلام ولی جب تک سکر اور استغراق کے عالم میں رہے اس کی عقل زائل رہے گی۔اور صوفیہ کا اتفاق ہے کہ ایسے عالم میں اس کے ذمہ سے احکام شریعت ساقط ہوجاتے ہیں۔

؎ شرع بہر زندگاں　واغنیاء است　　شرع بر اصحاب گورستاں کجا است

شریعت زندوں کے لئے ہےاور زندہ نما مردوں کے لئے نہیں ہے۔

اسی مقام کی مناسبت سے قدوۃ الانام سلطان العلماء عزالدین عبدالسلام کتاب ’’حل الرموز‘‘ میں فرماتے ہیں:

اثر میں جومثال آئی ہوئی ہے،یا تو وہ فتحاً ہوگی یا سطحاً یعنی حالت سکر میں مجذوب جو بات کہتے ہیں،وہ فتح ربانی ہوگی یا سطحی ہوگی یعنی ظاہراً شریعت کے خلاف ہوگی۔جیسے کسی قائل کا قول انا من اھوی،من اھوی،انا اللہ،مافی جبتی الا اللہ سبحانی ،مااعظم شانی۔یہ تمام اقوال دوکی نفی اور ذات وحدہ لاشریک کے اثبات کی طرف ہیں۔ایک قوم نے مقابلہ قلب سلیم سے کر کے انہیں تسلیم کرلیا اوران اقوال کوحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادگرامی پرمحمول کیاان من العلم کھیئۃ المکنون لایعلمہ الا اھل العلم باللہ

یعنی بعض علوم کی مثال پوشیدہ خزانوں کی سی ہے، جنہیں عارف باللہ ہی جانتے ہیں، قضیب البان سے متعلق مجھے خبر ملی ہے کہ موصل میں بڑی شان کے آدمی تھے۔ لوگوں میں مجذوب اور تارک الصلوٰۃ مشہور تھے۔ گھوڑوں پر نظر آتے، نجاستوں اور گندگیوں سے محفوظ نہ تھے۔ لوگ ان کے معاملہ میں حیران بھی تھے اور مختلف الرائے بھی۔ بعض انہیں زندیق کہتے تھے تو بعض صدیق۔ ایک دن شہر کے قاضی صاحب کا گذر قضیب البان پر ہوا۔ قاضی صاحب نے انہیں ایک گھوڑے پر دیکھا جو اپنی پنڈلیوں پر پیشاب کر لئے تھے۔ قاضی صاحب نے دل میں کہا، بلاکت ہو اس شخص کی جس نے تمہیں صدیق بتایا ہے، قاضی صاحب کی یہ بات دل میں پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ قضیب البان نے کہا جناب قاضی صاحب! کیا تم نے علم الٰہی کا احاطہ کیا ہے۔ قاضی صاحب نے جواب دیا، خدا کی قسم نہیں! قضیب البان موصلی نے کہا، میں اس علم کی قسم میں سے ہوں جسے تم نہیں جانتے، میرے صدیق ہونے، یا زندیق ہونے سے تمہیں کیا لینا دینا ہے۔

اسی مقام اور منزل کی مناسبت سے مولانا جلال الدین رومی مثنوی میں فرماتے ہیں:۔

حضرت بایزید بسطامی اپنے مریدوں کے سامنے آئے اور کیف و استغراق اور مستی کے عالم میں صراحۃً کہا لاالٰہ الا انا فاعبدون ۔ معبود میں ہی ہوں، لہذا میری عبادت کرو۔ جب یہ حالت گذر گئی تو مریدین نے عرض کیا کہ آپ نے ایسی ناروا بات کہی جو ایک بندہ کے لئے کسی طرح جائز نہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ اچھا اب کی بار اگر میں ایسا کہوں تو تلواروں سے مجھے ختم کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ جسم سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے بعد پھر وہ استغراق سے مست ہو گئے اور مریدین سے کہی بات دل سے نکل گئی اور ہر مرید نے تلوار سونت لی، عشق نے ان پر غلبہ پالیا، تو محفلِ فرار ہو گئی۔

جب بادشاہ (عشق) آجائے تو بے چارہ کوتوال (عقل) کونے میں گھس گیا۔

عقل اللہ کا سایہ ہے اور اللہ تعالیٰ سورج ہے۔ سایہ کی سورج کے سامنے کیا مجال؟ جب جن کسی آدمی پر سوار ہو جائے تو اس کی صفت آدمیت گم ہو جاتی ہے۔ اور وہ آدمی جو کچھ کہتا ہے وہ جن کی گفتگو ہوتی ہے۔ جب ایک جن کو یہ طاقت حاصل ہے تو اس جن کا خدا خود کیسا ہوگا؟ جن سوار ہوا تو آدمی کی ماہیت چلی گئی اور ایک عربی نہیں جاننے والا بغیر الہام کے عربی بولنے والا بن گیا۔ جب ہوش میں آیا تو یکلخت نہیں جانتا ہے۔ کیونکہ یہ جن کی ذات اور صفت تھی تو جن وانس کا خدا، آخر وہ جن سے کب کم ہوگا۔!

نیم مست شیر سے کب کوئی ڈرتا ہے؟ بھلا اندھے سے کوئی راستہ پوچھتا ہے۔ اگر وہ پرانے راز کی بات کہے تو کہے گا کہ یہ بات شراب نے کہی ہے۔ اگر شراب میں یہ سب شر وشور ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کے نور میں کوئی لیاقت وطاقت نہیں؟ کہ وہ تجھے تجھ سے بالکل خالی کر دے! اور تو مغلوب ہو جائے اور وہ بلند بات کرے۔ قرآن پیغمبر کی زبان سے ظاہر ہوا جو کہ خدا کا کہنا ہے، لیکن جو یہ کہے کہ اللہ نے نہیں کہا تو وہ کافر ہے۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ درخت سے انی انا ربک کی آواز آئی۔

اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''الطاف القدس'' سے بھی ظاہر ہے کہ انا نیت کبریٰ، انسان کامل کی انا نیت خاص کو اپنا عضو اور حصہ قرار دیتی ہے جیسا کہ زید کی زبان، جو زید کا ایک حصہ ہے وہ انا زید (میں زید ہوں) کہتی ہے۔ حالانکہ زید کی زبان، زید نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کامل جو حق تعالیٰ کا حصہ ہے، غلبۂ حال میں انا الحق کہتا ہے، حالانکہ انسان کامل، حق تعالیٰ نہیں ہے۔

روا باشد انا الحق از درختے      چرا نبود روا از نیک بختے

ایک درخت انا الحق کہے تو یہ روا ہے، اور ایک انسان کامل انا الحق کہے تو کیونکر روا نہیں۔

نیز جاننا چاہئے کہ کسی اہم ترین کام میں مشغول رہتے ہوئے سنن رواتب وغیرہ کو چھوڑ دینا جائز

ہے، جیسے فرض کے وقت کو فرض کے ذریعہ پُر کردینے میں سنت چھوڑ دیں تو جائز ہے مثلاً ایک شخص نے نماز ظہر کا پورا وقت از ابتدا تا انتہا صرف اس کی چار رکعت فرض میں گذار دیا تو نہ صرف جائز بلکہ ماجور ہوگا۔ اور اس کا اولوالعزم میں شمار ہوگا جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص صرف فرائض کی ادائیگی پر اکتفا کرتے ہوئے امور جہاد اور احکام فقہ کی ترویج میں اپنے اوقات کو صرف کررہا ہے تو اس کے لئے ترک سنت جائز ہے۔

صاحب الفتح القدیر فرماتے ہیں کہ فقہاء۔ نے فرمایا کہ وہ عالم دین جو فتویٰ کے لئے مرجع بن گیا ہو اس کے لئے سنتوں کا ترک کرنا جائز ہے۔

صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ نماز فجر کی سنت ترک کرنا اس عالم کے لئے جائز نہیں جو فتویٰ میں مرجع بن گیا ہو، برخلاف دیگر سنتوں کے۔ سنن رواتب چھوڑنے کی سہولت بھی اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کی دینی ضروریات میں اپنے آپ کو پوری طرح مشغول رکھتا ہے۔

''مصفیٰ'' میں مرقوم ہے کہ سنن رواتب کا ترک کرنا اگر سستی و کاہلی کی وجہ سے ہے تو ایک قول کے مطابق ترک کرنے والا گنہ گار ہوگا اور ایک قول کے مطابق عتاب کا سزاوار ہوگا۔ عقوبت و سزا کا مستحق نہیں ہوگا۔ لیکن سنن رواتب کی مشروعیت کا انکار کرنے سے کافر ہوجائے گا۔

بحر الرائق، تجنیس، نوازل اور محیط میں مرقوم ہے کہ کسی شخص نے نماز پنجگانہ کی سنتوں کو ترک کیا۔ اگر اس کا یہ ترک کرنا سنتوں کی مشروعیت کے انکار کی بنیاد پر ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ اس نے سنتوں کو حقیر اور ہلکا جانا۔ اور اگر وہ سنتوں کی مشروعیت کا قائل ہے تو فقہاء میں سے بعض کا قول ہے کہ وہ گناہ گار نہ ہوگا اور صحیح و درست بات یہ ہے کہ وہ گناہ گار ہوگا اس لئے کہ سنتوں کے چھوڑنے پر بڑی وعیدیں آئی ہوئی ہیں۔

فرقۂ ملامتیہ میں ایک گروہ ہے، اکثر اس کی کوششیں، رسوم و عادات کی تخریب اور مخالطت کے آداب کے قیود سے آزادی میں صرف ہوتی ہیں اور ان سے طاعات و نوافل کی کثرت

دیکھنے میں نہیں آتی۔اور یہ صرف فرائض کی ادائیگی پر مواظبت کرتے ہیں۔ان کو قلندر یہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ قاشانی کی کتاب ''ترجمۃ العوارف'' اور علامہ جامی کی ''نفحات'' میں مذکور ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' میں آثار طریق ولایت کی بحث میں رقم طراز ہیں: من جملہ طریق ولایت کے آثار و علامات میں سے ایک تفرد بھی ہے۔یعنی محبوب کے علاوہ سارے تعلقات منقطع کر لینا اور پریشان کن مشاغل کے ظہور، اور گوناگوں کثیر تعلقات سے بیزارگی ظاہر کرنا، اور امور متفرقہ مثلاً سیاست منزلی (خانگی) اور سیاست مدنی (شہری) اور امامت جماعت، اقامت عیدین و جمعہ، اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی اور اسی طرح کے دیگر امور کے نظم و ترتیب سے تنگ دلی ظاہر کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کو شادی بیاہ سے جو سارے تعلقات کی اصل ہے حد درجہ نفرت اور وحشت ہوتی ہے۔

حاصل تحریر! بعض عوام قطب ربانی یوسف ہمدانی پر باجماعت نماز نہ پڑھنے اور جمعہ چھوڑنے پر جو نکتہ چینی و حرف گیری کرتے ہیں اور مقرب الٰہی قصیب البان موصلی پر ترک صلوٰۃ کا جو طعنہ دیتے ہیں اور اولیاء اللہ کی شان میں جو بے ہودہ باتیں کہتے ہیں، یہ سب بے علمی اور حد درجہ گستاخی و بے ادبی کا نتیجہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۴)

# احکامِ حج سے متعلق ہے

حج ایک فرض عبادت ہے اور حج کا انکار کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا اور یہ عبادت ہر ایسے مسلمان پر جو آزاد، مکلّف، تندرست اور صاحبِ بصارت ہو، حج ایک مرتبہ فرض ہے بشرطیکہ وہ سفر کے اخراجات اور مصارف برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور یہ

سواری کے اخراجات، زادِ راہ، رہائشی مکان، نوکر چاکر کے خرچ، گھریلو ساز وسامان اور کپڑوں کے علاوہ ہے۔ نیز یہ اخراجات اس کے گھر واپس لوٹ آنے تک، اس کے اہل و عیال کے نان نفقہ کے ماسوا ہیں اور حج کی فرضیت کے لئے ایک شرط راستے کا پُر امن ہونا بھی ہے۔ بعض فقہائے کرام نے سمندری سفر کو پُر خطر اور غیر مامون کہا ہے جیسا کہ شرح وقایہ میں مرقوم ہے۔

ابوالمکارم، شیخ الاسلام، امام ربانی، بحرالعلوم، شاہ عبدالعزیز دہلوی وغیرہ کی بزرگی و عظمت مشہور ومعروف ہے۔ اور یہ سارے بزرگانِ دین اس قابل ہیں کہ ان کی ذات کے ساتھ حسنِ ظن ہی قائم کیا جاسکتا ہے اور یہ حضرات شرائط حج کے فقدان اور ممانعت حج کے اسباب کی موجودگی کے باعث حج ادا نہ کرسکے۔ لہذا ان بزرگوں کو حج نہ کرنے کا طعنہ دینا سوءظن کا مرتکب ہونا ہے اور سوءظن سے متعلق اللہ نے کہہ دیا ہے کہ وہ گناہ ہے۔ **ان بعض الظن اثم**

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۵)

# طواف غیر کعبہ کا حکم

غیر کعبہ کا طواف کرنا حرام ہے۔ خواہ تین مرتبہ کریں یا اس سے کم یا اس سے زیادہ، جیسا کہ ملا علی قاری کی کتاب ''مناسک'' میں مرقوم ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ ''النہر الفائق'' میں مذکور ہے اور بعض کے نزدیک جائز ہے جیسا کہ بعض فتاویٰ میں مسطور ہے۔ ان اختلافات کی پوری تفصیل ''مائۃ المسائل'' کے ۳۴رویں سوال

کے جواب میں دیکھی جاسکتی ہے، اسی جواب میں مرقوم ہے کہ:

جب ان معتبر کتابوں کی روایات سے یہ بات واضح ہے کہ غیر کعبہ خواہ قبر ہو یا غیر قبر، اس کا طواف کرنا حرام ہے تو اسی سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ روایات غیر معتبر ہیں جو تین مرتبہ طواف غیر کعبہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور فقہاء کا یہ قاعدہ اور ضابطہ بھی ہے کہ متون کی روایات، شروح کی روایات سے معتبر ہیں، اور شروح کی روایات، فتاوٰی کی روایات سے معتبر ہیں۔ لہذا شروح کی روایات، جو طوافِ غیر کعبہ کے حرام ہونے میں بکثرت منقول ہیں۔ وہ متون کی منزل میں ہیں اور جائز قرار دینے والی روایات، چند فتاوٰی کے اندر آئی ہوئی ہیں اور جب کبھی فتاوٰی اور شروح کی روایات میں تعارض و تصادم پیدا ہو جائے تو شروح کی روایات کو ترجیح دی جائے گی۔

خانۂ کعبہ کے طواف سے شارع علیہ السلام کا مقصود ایک مخصوص تعظیم ہے جو کعبہ کے سوا کسی دوسری چیز کے ساتھ اس قسم کی تعظیم نہ ہو۔ اور جب طواف کو غیر کعبہ یا قبر یا انسان کے لئے بھی جائز قرار دیا جائے تو تعظیم و تقدس میں کعبہ اور غیر کعبہ دونوں برابر ہو جائیں گے اور یہ چیز شارع علیہ السلام کے مقصود اور مطلوب کے خلاف ہے اور ہر وہ روایت جو شارع کے مقصود کے خلاف نظر آئے اس کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے۔

زاد الآخرت کے مصنف ۱۲ ویں باب کی چوتھی فصل میں تحریر کرتے ہیں)

قبروں کا طواف کرنا حرام ہے۔ اس لئے کہ طواف، کعبہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ چیز (طواف) حج اور عمرہ کے مناسک اور عبادت کی جنس سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہذا بعض مشائخ کرام کی کتابوں میں اولیاء اللہ کی قبروں کے طواف کو جو جائز لکھا گیا ہے وہ ذہول اور غفلت پر مبنی ہے اور خلاف تحقیق ہرگز ایسی روایتوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

اس مقام پر مثنوی مولانا روم میں بیان کردہ ایک واقعہ کی حقیقت کو بھی سمجھ لینا

چاہئے جس میں کسی بزرگ نے حضرت بایزید بسطامی کو اپنا طواف کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے سات مرتبہ ان بزرگ کا طواف کیا۔ شرح مثنوی میں بحرالعلوم اس واقعہ کی توجیہہ اور وضاحت اس طرح فرماتے ہیں۔

اس واقعہ کے اندر یہ اشارہ موجود ہے کہ جس طرح ذات باری تعالیٰ کا ظہور اسماء و صفات کے ساتھ صورت انسانیہ میں ہے اسی طرح صورت کعبہ میں بھی ہے اگر چہ کہ ظہور ان دونوں (انسان۔ کعبہ) میں مختلف ہے۔ چنانچہ صورت انسانیہ میں ذاتِ الٰہی کا ظہور با اسماء و صفات ہے مع صفات کونیہ۔

اسی لئے انسان ذات الٰہی کا مظہر اتم قرار پایا بر خلاف کعبہ کے جس میں جمیع صفات منفعلہ کونیہ کا ظہور نہیں ہے اور اس میں ذات صرف اسماء و صفات الٰہیہ کے ساتھ ظاہر ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی وجہ سے کعبہ اللہ کی تجلی گاہ ہے اور اسی لئے کعبہ عبادت کا قبلہ ٹھہرا، اور انسان عبادت کے لئے قبلہ نہیں!

اس مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہو حضرت بایزید بسطامی کے طواف کرنے کے وقت میں اس بزرگ میں اللہ مشہود تھا نہ کہ صفات کونیہ۔

نیز بحرالعلوم، تا بہ بینی نورحق اندر بشر، کے مصرع کی شرح میں فرماتے ہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ طواف کے وقت میں بشر میں اللہ مشہود تھا اور حضرت بایزید کا طواف اسی "الٰہ مشہود" کے لئے تھا جیسا کہ اولیاء اللہ کے لئے کعبہ میں الٰہ مشہود رہتا ہے اور کعبہ کا طواف دراصل الٰہ کا طواف ہے اور اولیاء اللہ کا طواف کعبہ کے وقت میں جو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے وہی بایزید بسطامی کو اس بشر میں حاصل ہو (جس کی وجہ سے انہوں نے اس بزرگ کا طواف کیا جو فی الحقیقت الٰہ مشہود ہی کے لئے تھا اس انسان کے لئے نہیں)

نیز اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مولانا روم نے مثنوی کے اندر طواف ، بشر کی جو

حکایت نقل کی ہے وہ پچھلا قول ہو جیسا کہ بعض فتاوی کے اندر ہی مرقوم ہے۔

اور االانتباہ فی سلاسل الاولیاء میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے طواف قبر سے متعلق جولکھا ہے وہ بھی اسی طرح قول اخیر ہی پر مبنی ہے۔

مطبوعہ مدارج النبوۃ کی دوسری جلد کے ۳۳۷ ویں صفحہ میں مرقوم ہے کہ ایک روایت میں آیا ہوا ہے کہ حضرت جعفرؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک پاؤں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد چکر لگایا تو آپؐ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کی تعظیم ایسا ہی کرتے ہیں اور نجاشی جب کسی آدمی سے اپنی خوشنودی ظاہر کرتا تو وہ شخص کھڑا ہو جاتا اور نجاشی کے گرد ایک پاؤں پر چکر لگاتا۔

یہ روایت بھی اسی طرح قول اخیر ہی پر مبنی ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کے اس اختلافی مسئلہ میں اباحت کا قول نقل کرنے سے فقیر کا مقصد اور منشأ صرف غالی حضرات کی زبان بند کرنا ہے تا کہ ان کے سامنے یہ پہلو نمایاں ہو سکے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے پر عیب اور طعن و تشنیع نہیں کرنا چاہئے۔ اور اہل سنت و جماعت میں سے ہر مکتبہ فکر (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ جب مجتہد ہی کو ایک جانب کا جزم و یقین میسر نہیں ہے تو ایک عامی مقلد یہ مقام کیسے پا سکتا ہے۔ **فربکم اعلم بمن ھو اھدی سبیلا**۔ تمہارا رب ہی بہتر اور صحیح جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ ہدایت کے راستہ پر ہے۔ پانچویں مقدمہ میں اس کی بحث گذر چکی ہے۔ مزید تفصیل سترھویں مقدمہ میں ملاحظہ کی جائے۔

مذکورہ تفصیلات اور توضیحات سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ فقیر قول ضعیف پر عمل کرنے کی دعوت اور ترغیب دے رہا ہے اور اس کے مسلک کی بنیاد مرجوح روایات پر ہے حاشا و کلا۔ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

پس اس مقام پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ طواف غیر کعبہ کے مسئلہ میں مولانا رومی۔ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دیگر اکابر حضرات پر طعن کرنے سے اس مسئلہ میں لوگوں کی لاعلمی و بے خبری کا اندازہ ہوتا ہے اور طاعن حضرات کے گستاخ اور بے ادب ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (٦)

# ضیافت کی اقسام اور دعوت قبول کرنے کے احکام

ضیافت کی اقسام اور دعوت قبول کرنے کے احکام وآداب یہ ہیں۔

ضیافت کی اقسام بہت ہیں۔ شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ مشکوٰۃ کے باب الولیمہ میں ''مجمع البحار'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ضیافت کی آٹھ قسم ہیں۔

۱۔ دعوت ولیمہ جو نکاح کی خوشی اور مسرت میں کی جاتی ہے

۲۔ دعوت خُرس جو بچہ پیدا ہونے کی خوشی ومسرت میں کی جاتی ہے

۳۔ دعوت اِعذار جو سنت ختنہ کی ادائیگی کے موقع پر کی جاتی ہے۔

۴۔ دعوتِ وکیرہ جو نئے مکان کی تعمیر کے بعد اس کے افتتاح کے موقع پر کی جاتی ہے۔

۵۔ دعوت نقیعہ جو مسافر مہمان کے گھر آنے کی خوشی میں، اس کے اعزاز میں یا اس کی وجہ سے دوسرے دوست واحباب اور رشتہ داروں کو مدعو کرکے، کی جاتی ہے۔

۶۔ دعوت ضمیہ جو کسی مصیبت کے موقع پر کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے گھر میت ہوجائے

یا کسی کے گھر والے کسی مصیبت وحادثہ کے شکار ہو جائیں تو اہلِ خانہ و متعلقین کو کھلایا جاتا ہے۔

۷۔ دعوتِ عقیقہ جو بچہ کا نام رکھنے کے وقت پر کی جاتی ہے۔

۸۔ دعوت مأ دبہ جو بغیر کسی مقصد کے صرف خوشی اور لذت کے حصول کے خیال سے کی جاتی ہے۔ جیسا کہ بے تکلف دوست واحباب میں ہوتی ہے۔

ضیافت کی یہ تمام اقسام مستحب ہیں صرف ولیمہ کے تعلق سے بعض فقہاء کا موقف یہی ہے کہ ولیمہ واجب ہے، اور امام بغوی فرماتے ہیں کہ ولیمہ مستحب ہے۔ دولہا دولہن کو چاہئے کہ اللہ نے ان پر جو انعام واکرام فرمایا ہے اس کے اظہار شکر کے لئے ولیمہ کی دعوت کریں۔

نیز اسی میں رقم طراز ہیں کہ۔

ولیمہ موکد ترین مستحب ہے۔ اور بقول بعض فقہاء فرض کفایہ ہے اور بقول بعضے دعوت ولیمہ قبول کرنا واجب ہے۔ البتہ چند چیزیں ایسی ہیں اگر وہ موجود ہوں تو اس دعوت کو قبول کرنا واجب نہیں ہے۔ مثلاً کھانے سے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ ناجائز اور حرام مال سے تیار کیا ہے۔ یا اس بات کا علم ہو کہ وہ دعوت صرف اہلِ ثروت کے لئے مخصوص ہے یا اس دعوت میں شریر النفس لوگ موجود ہیں۔ یا داعی اپنی جاہ وعزت کے خاطر دعوت کا اہتمام کر رہا ہے یا دعوت کا اہتمام کسی باطل کام میں مدد کرنے کے لئے ہے یا دعوت میں فواحش ومنکرات موجود ہیں اور ذمّی شخص کی دعوت قبول کرنا مکروہ ہے

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

جب تم میں سے کوئی شخص کسی مسلمان کے پاس چلا جائے تو اس کا کھانا کھالینا چاہئے اور اس کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس کی دل جوئی کے خاطر یہ سوال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ کھانا حرام مال سے تیار کردہ ہے یا حلال مال سے؟ اور اگر کسی ذریعہ سے یہ بات

معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس کھانا حرام کمائی سے تیار شدہ ہے تو ہرگز نہیں کھانا چاہئے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص جس کی آمدنی کا زیادہ حصہ حرام اور ناجائز ہے تو اس کے پاس نہیں کھانا چاہئے۔ اور اگر ایسا شخص ہے جس کی آمدنی اور کمائی میں حلال وحرام دونوں کی آمیزش ہے تو حلال کے احتمال سے کھالیا جائے اور اس شخص کا حال صحیح طور پر معلوم کرلیا جائے کہ وہ حلال اور حرام میں فرق کررہا ہے یا نہیں؟

امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات کی جلد اول کے ۲۶۵ ویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ دعوت قبول کرنے کے لئے چند شرائط ہیں۔ احیاء علوم الدین میں مرقوم ہے کہ اگر کھانے سے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ حلال کمائی سے تیار نہیں ہوا ہے یا دعوت کی جگہ میں چھت اور دیواروں پر تصاویر آویزاں ہیں یا گانے بجانے اور دوسرے لہو ولعب کے سامان موجود ہیں تو یہ سارے امور دعوت قبول کرنے کے لئے مانع ہیں اور اس طرح کی دعوت قبول کرنا حرام اور مکروہ ہے اور دعوت دینے والا شخص ظالم، بدعتی، فاسق، شریر النفس، فخر ومباحات کا طالب ہے تو بھی اس کی دعوت قبول نہیں کرنا چاہئے۔

''شرعۃ الاسلام'' میں مرقوم ہے کہ جس دعوت کے پیچھے ریاکاری، ظاہرداری، نام ونمود اور شہرت جیسے عوامل ہوں تو اس کا قبول کرنا واجب نہیں۔

''محیط'' میں مسطور ہے کہ ایسی مجلس میں کھانے پینے نہیں بیٹھنا چاہئے جس میں لہو لعب، گانا بجانا موجود ہو اور ایسے افراد کے ساتھ مل کر کھانے میں شریک نہیں رہنا چاہئے جو غیبت کررہے ہوں، اور شراب وغیرہ استعمال کررہے ہوں جیسا کہ مطالب المومنین میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اس طرح کے شرعی موانع اگر نہ پائے جاتے ہوں تو دعوت کو رَد نہیں کرنا چاہئے۔

صاحب تفسیر احمدی ملاجیوں لکھتے ہیں کہ صاحب ھدایہ نے کتاب الکراھیۃ میں

لکھا ہے کہ اگر تمہیں دعوت میں مدعو کیا جائے اور وہاں لہو ولعب اور گانا بجانا ہو پس اگر اس بات کا علم دعوت کے مقام پر پہنچنے سے قبل ہو جائے تو وہاں شرکت نہ کریں اور اگر حاضری کے بعد علم ہو جائے اور تمہارے اندر اہل مجلس کو ان منکرات شرعیہ سے روکنے کی طاقت ہے تو ضرور روک دینا چاہیئے اور اگر تمہارا شمار قوم کے رہنما و قائد حضرات میں سے ہے تو تمہیں چاہیئے کہ فوراً مجلس سے نکل جائیں اور کھانا نہ کھائیں تا کہ دوسرے لوگ بھی تمہاری اقتداء میں مجلس سے اُٹھ سکیں۔ اور اگر تمہارا شمار عوام الناس میں سے ہے اور لہو ولعب دستر خوان ہی پر ہو تو وہاں سے نکل جائیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ولا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین**

اور اگر لہو ولعب دستر خوان سے دور ہو اور تم دستر خوان پر بیٹھ چکے اور کھانا کھا چکے تو ٹھیک ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ ہر حال میں ایسی مجلس سے نکل جائیں اور کھانا نہ کھائیں۔ یہ تفسیر احمدی کا ماحصل ہے۔ انتہیٰ

صاحب ھدایہ نے تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اس حقیقت کی وضاحت کر رہا ہے کہ ہر قسم کے لہو ولعب حرام ہیں یہاں تک کہ شاخِ درخت سے بجا بجا کر جو گانا گایا جاتا ہے وہ بھی حرام ہے۔

صاحب شرح وقایہ فرماتے ہیں

یہ بات جان لینی چاہیئے کہ اگر دعوت میں جانے سے قبل یہ پتہ چل جائے کہ وہاں لہو ولعب ہے تو وہاں شریک ہونا جائز نہیں اور اگر اس بات کا علم نہیں تھا۔ شریک ہونے کے بعد دیکھا کہ لہو ولعب کا غلبہ ہے تو ایسی صورت میں اگر وہ لوگوں کو منکرات شرعیہ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہے تو روک دے اور اگر روکنے کی طاقت نہیں ہے اور وہ قوم کے قائدین میں شامل ہے تو وہاں سے خود ہی نکل جائے تا کہ دوسرے اشخاص بھی اس کو دیکھ کر مجلس سے نکل

جائیں اور منکرات سے بچ جائیں۔ اور اگر وہ شخص عامی ہے اور بیٹھ گیا اور کھانا کھالیا تو کوئی قباحت نہیں۔ اس لئے کہ دعوت قبول کرنا سنت ہے اور کسی بدعت کی وجہ سے سنت کو ترک نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ نماز جنازہ میں کسی نوحہ کنان عورت کی موجودگی سے نماز جنازہ کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

امام اعظم ابوحنیفہ النعمان فرماتے ہیں کہ میں بھی ایک مرتبہ اس آزمائش (امام و مقتدا ہونے سے پہلے) سے دوچار رہا اور صبر سے کام لیا۔ فقہاء نے وضاحت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا یہ قول ابتلیت (آزمائش میں گھر گیا) حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کو یہ اعتراض ہو کہ ایک سنت ادا کرنے کے لئے فعل حرام کو برداشت کرنا جائز نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب نے صبر کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ اس معنی میں ہے کہ لہو ولعب کو منکرات شرعیہ میں سے خیال کرتے ہوئے اور اس میں انہماک و توجہ اور دلچسپی کے بغیر اس سے اعراض کرتے ہوئے بیٹھے رہنا ہے۔

مولانا شاہ اسحاق مہاجر مکی مائۃ المسائل کے ۹۳ ویں سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ھدایہ کے حاشیہ میں سید نے لکھا ہے کہ دعوت مسنونہ کا قبول کرنا واجب ہے اور اگر دعوت میں منکرات وفواحش موجود ہوں اور تمہاری حاضری سے وہ ختم نہیں ہو سکتے ہیں تو ایسی صورت میں تمہاری حاضری واجب نہیں اور اگر تمہارے پہنچنے سے وہ منکرات ختم ہو سکتے ہیں تو ایسی صورت میں تمہارا حاضری دینا واجب ہے کیونکہ تمہاری یہ حاضری نہی عن المنکر کے باب میں شمار ہوگی۔ (جو کہ ایک عظیم دینی فریضہ ہے)

بادشاہ بخارا کا پہلا سوال جو کسی کافر اور بدعتی کی دعوت قبول کرنے اور نہ کرنے سے متعلق ہے۔ اس کے جواب میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ فرقۂ امامیہ سبّیہ سے ملاقات کا حکم بھی کفار کی ملاقات کے حکم میں ہے۔ یعنی اپنی طرف سے سلام نہیں کرنا

چاہیئے اور اگر ان کی جانب سے کوئی عظیم نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو سلام کیا جا سکتا ہے اور ان کے سلام کا جواب بھی بقدر ضرورت دینا چاہیئے اور اگر سلام کے علاوہ دوسرے افعال تعظیم ( مثلاً قیام اور مصافحہ ) مقام مکافات میں ( یعنی جواب کے طور پر ) خود بھی عمل میں لانا چاہیں تو بقدر مشروع عمل میں لانا چاہیئے۔ اور اسی طرح عیادت، تعزیت، تہنیت اور دعوت قبول کرنے میں بھی مکافات ہی پیش نظر رہنا چاہیئے جیسا کہ کفار کے بارے میں بھی یہی حکم ہے اور خوارج اور نواصب کا بھی یہی حکم ہے۔ انتہی

ان دلائل و براہن کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دعوت قبول کرنے کے لئے شرعی موانع نہ پائے جائیں، نہ کہ موانع سے توبہ۔ موانع کو ترک کرنے والے اور موانع سے توبہ کرنے والے داعی کی دعوت کو رد کرنا، یہ تمام باتیں افراط وتفریط سے خالی نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۷)

# مُردوں کے لئے زندوں کی جانب سے صدقہ وخیرات اور دعا کرنے کا حکم

زندوں کے صدقات وخیرات اور ان کی دعائیں مردوں کے لئے نفع بخش ہیں۔

علامہ تفتازانی شرحِ عقائد نسفی میں فرماتے ہیں۔ زندوں کی دعاؤں اور صدقات وخیرات میں اموات کے لئے اجر وثواب ہے۔ اس مسئلہ میں فرقۂ معتزلہ کا اختلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قضا وقدر میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور ہر شخص اپنے کسب اور عمل کا مرہون ہے اور ہر ایک کو صرف اسی کے عمل کی جزا دی جائے گی نہ کہ دوسرے شخص کے عمل کا بدلہ۔ لیکن ہم اہلِ سنت

وجماعت کا استدلال یہ ہے کہ صحیح احادیث میں اموات کے لئے دعا کرنے کا حکم ہے اور بالخصوص نماز جنازہ میں میت کے حق میں دعا کرنے کی تاکید آئی ہوئی ہے اور اس پر سلف کا عمل تو راتر اختیار کر گیا ہے اگر اس عمل میں اموات کے لئے کوئی نفع نہ ہوتا تو یہ حکم اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی نماز جنازہ ایک سو مسلمان ادا کریں اور وہ میت کی مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھانے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتا ہے، حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! سعد کی والدہ رحلت کر گئی ہیں لہذا ان کی ثواب رسانی کے لئے کونسا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا، پانی۔ اس پر سعد نے ایک کنواں کھدوایا اور فرمایا ھذہ لام سعد، اس کارِ خیر کا ثواب سعد کی والدہ کو پہنچتا رہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک عالم اور ایک متعلم جب کسی شہر سے گذر جائیں تو اس شہر کے قبرستان سے چالیس روز عذاب کو اٹھا دیتا ہے۔ اس باب میں بے حساب احادیث وارد ہیں۔

اور مولانا شاہ اسحاق دہلوی ''مسائل اربعین'' کے اندر ۳۰ ویں مسئلہ میں فرماتے ہیں کہ۔

حنفی علماء کے نزدیک عبادت بدنی اور عبادت مالی دونوں کا اجر وثواب اموات کو پہنچتا ہے چنانچہ ھدایہ میں مرقوم ہے کہ اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک جائز ہے کہ ایک شخص اپنے عمل کا ثواب کسی دوسرے شخص کو پہنچا دے۔ جیسے نفل نماز و روزہ، صدقہ، خیرات وغیرہ

نیز شاہ صاحب کتاب مذکورہ میں فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جامع البرکات منتخب شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ عبادت مالیہ کا ثواب ا موات کو پہنچتا ہے اور عبادت بدنیہ مثلاً نماز اور تلاوت قرآن کا ثواب پہنچنے کے بارے میں اختلاف ہے لیکن صحیح ترین موقف یہ ہے کہ عبادت بدنیہ کا ثواب بھی اموات کو پہنچتا ہے جیسا کہ شیخ ابن ہمام نے تصریح کی ہے۔

نیز شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ کی پہلی جلد کے پانچویں باب میں لکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کا ثواب اموات کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ اور اکثر کی رائے یہ ہے کہ ثواب نہیں پہنچتا اور شافعی و مالکی اور حنفیہ کی ایک جماعت کے موقف سے متعلق یہی مشہور ہے اور شوافع و احناف کے اکثر فقہاء کا موقف یہ ہے کہ تلاوت کا ثواب اموات کو پہنچتا ہے اور امام احمد بن حنبل بھی اسی چیز کے قائل ہیں بلکہ امام احمد سے بھی منقول ہے کہ صدقہ، نماز، حج، اعتکاف، تلاوت قرآن اور ذکر وغیرہ کا ثواب بھی اموات کو پہنچتا ہے۔ البتہ امام موصوف نے یہ تصریح کی ہے کہ قبر کے پاس قرآن کریم کی تلاوت بدعت ہے اور شیخ شمس الدین قسطلانی نے تحریر کیا ہے کہ صحیح موقف یہی ہے کہ رشتہ دار واجنبی اور وارث وغیر وارث کی جانب سے تلاوت کا ثواب اموات کو پہنچتا ہے جس طرح صدقات وخیرات سے اور اجتماعی دعا واستغفار سے اموات کو ثواب پہنچتا ہے۔

امام عبداللہ یافعی نے "تکمیل روض الریاحین" میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں شیخ عز الدین بن عبدالسلام کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں ہم دنیا میں یہ کہتے رہے کہ تلاوتِ قرآن کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ لیکن اب ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ تلاوت کا ثواب پہنچتا ہے۔ لہذا تلاوت کا ثواب ہم پر پہنچایئے۔

صاحب "درمختار" صلوٰۃ الجنائز کے باب میں لکھتے ہیں کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو شخص سورۃ الاخلاص گیارہ مرتبہ پڑھے اور مردوں کو ایصالِ ثواب کرے تو اللہ اپنے فضل وکرم سے کئی ایک اموات کو اجر وثواب عطا فرماتا ہے۔

امام ربانی مکتوبات کی پہلی جلد کے ۱۰۴ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں کہ مصیبت کسی شخص کے انتقال کرنے پر نہیں بلکہ انتقال کرنے والے کی حالت پر ہے کہ اب اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ دعا، استغفار اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ اس کی امداد کرنی چاہیئے

کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر میں میت کی حالت ڈوبنے والے شخص کی طرح رہتی ہے جو ہر لمحہ کسی کی مدد کا طلب گار رہتا ہے۔ اسی طرح مردہ بھی اپنے والدین، بھائی بہن اور دوست واحباب کی دعا کا منتظر رہتا ہے۔ پس جب یہ دعا اس کو پہنچتی ہے تو یہ چیز اس کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اہلِ زمین کی دعا سے اہلِ قبور پر پہاڑوں کے مانند رحمت نازل فرماتا ہے۔ بے شک زندوں کی جانب سے مردوں کے لئے بہترین ہدیہ یہ ہے کہ ان کی مغفرت کے لئے دعا کی جائے۔

اس مقام پر یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ صدقہ سے مراد ایسی چیز ہے جو اللہ کی راہ میں اس کے حکم سے دی گئی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وجعلوا لله مما ذرأ من الحرث والانعام نصيباً فقالوا هٰذا لله بزعمهم وهذا لشر كآئنا فما كان لشر كآئهم فلا يصل الىٰ الله وما كان لله فهو يصل الى شر كآئهم۔ سآء مايحكمون۔**

(اور ان لوگوں نے کھیتی اور مویشیوں میں سے جو (اللہ ہی نے) پیدا کئے ہیں کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر رکھا ہے اور کہتے ہیں اپنے خیال کے مطابق کہ یہ (حصہ) اللہ کا حصہ ہے۔ اور یہ ہمارے دیوتاؤں کا۔ اور پھر جو (حصہ) ان دیوتاؤں کے لئے ہوتا ہے، وہ اللہ کی طرف پہنچتا نہیں۔ اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے دیوتاؤں کی طرف پہنچ جاتا ہے کیسا برا ہے ان کا یہ فیصلہ۔

''صاحب موضح القرآن'' نے مذکورہ آیتؐ کے حاشیہ پر یہ فائدہ سپرد قلم کیا ہے۔

کافر اپنی کھیتی سے اور مویشی میں سے اللہ کی نیاز نکالتے ہیں اور بتوں کی نیاز بھی نکالتے ہیں پھر بعض جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا تو اس کو بتوں کی طرف کا، اللہ کی طرف نہیں بدلتے۔ بتوں سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اب جاننا چاہئے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ ہے کہ اس کی راہ میں جن کو دلوایا، ان کو دینا، اس کا فائدہ اس کو (اللہ تعالیٰ) نہیں پہنچتا ہے۔ مگر اس کی حکم

برداری ہوئی اور چیز سے فقیر کو فائدہ ہوا اور ثواب سے دینے والے کو فائدہ ہوا، پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے اگر یہ اسی وضع پر (کافروں کی وضع پر) ہو تو شرک ہے۔ جس پر اللہ نے الزام دیا ہے مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے یعنی بزرگ کو بزرگ ہی سمجھے اور اپنی طرف سے اللہ کی راہ میں، اللہ نے جن کو دینے کے لئے کہا ہے اُن کو دے تو یہ حکم برداری اللہ کی ہوگی اور چیز فقیر کو۔ اور ثواب اسی شخص کے بدل میں اس بزرگ کو ہوگا۔ یا اس بزرگ کو فقیر کی جگہ ٹھہرا دیں کہ اس کی چیز اس کی کر دی۔ پھر اس کی (یعنی فقیر بزرگ کی) چیز لوگوں کے کام آئے تو اس کو ثواب ہوا۔ یہ صورت مشکوک ہے۔ پہلی صورت بے شک درست ہے۔

اس مسئلہ میں بعض لوگ بہت غلو کرتے ہیں اور فرقۂ معتزلہ کی طرح بطور اعتراض یہ کہتے ہیں کہ مردوں کے لئے ایصالِ ثواب تو کرتے ہو لیکن ایصال عذاب کیوں نہیں کرتے۔ معاندین اسلام اس قسم کے طعنے زمانۂ نبوت میں بھی مسلمانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے اور انہیں ذلیل کرنے کے لیے دیا کرتے تھے اور بعض افراد یہ کہتے ہیں کہ شیطان، خدا پر غالب آجاتا ہے تو مخلوق کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور بعض نادان یہ کہتے ہیں کہ لیجئے محمدؐ کا خدا کہتا ہے کہ میرے محتاج بندوں کو کھانا کھلاؤ اور صدقہ کرو۔ گویا کہ وہ فقیر ہے اور ہم غنی۔ مذبوح کے حلال ہونے پر اور میت کے حرام ہونے پر ہجو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہوا (مذبوح) جانور کھانا حلال ہے اور خدا کا ختم کیا ہوا (میت) جانور کھانا حرام ہے۔ اس طرح کی لغویات و کفریات اور بھی بہت ہیں چنانچہ تفسیر عزیزی میں ہے۔

یہ عجیب تماشا ہے کہ بعض لوگ معتزلہ کی طرح مردوں کے ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سُنی ہونے کا دعوٰی بھی ترک نہیں کرتے اور کبھی یہ حکم دیتے ہیں کہ مردوں کو عبادت بدنیہ کا ثواب نہیں پہنچتا۔ اور اس اجتہاد کے باوجود اپنے مقلد ہونے اور حنفی ہونے کا دعوٰی بھی نہیں چھوڑتے۔

# فائدہ نمبر (۸)

# تعئین صدقات کا حکم

صدقات میں مشروع تعئینات بھی ہیں اور غیر مشروع بھی ہیں۔ شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی شرح مشکوٰۃ شریف باب زیارۃ القبور میں فرماتے ہیں:

مستحب یہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد سات روز تک اس کی جانب سے صدقہ وخیرات کیا جائے اور صدقہ وخیرات کرنے سے میت کو اجر وثواب حاصل ہوتا ہے اور اس مسئلہ میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ اور اس باب میں صحیح احادیث بالخصوص پانی صدقہ کرنے کے بارے میں وارد ہیں۔

اور صاحب زادالاخرۃ ''شرح برزخ'' اور ''کنز العباد'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مومن کے لئے قبر کی آزمائش اور فتنہ سات دن تک ہے اور گنہ گار کے لئے چالیس روز تک ہے۔ اگر میت کے گھر والے صاحب استطاعت ہوں تو چالیس روز تک ایصال ثواب کی نیت سے میت کے حق میں صدقہ وخیرات کرتے رہیں۔ اور اگر صاحب استطاعت نہ ہوں تو سات دن تک صدقہ وخیرات کرتے رہیں ورنہ کم از کم تین دن تک صدقہ وخیرات کا اہتمام کرنا چاہئے۔

نیز ''زادالاخرۃ'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ اہلِ مصیبت یعنی میت کے گھر والوں کے لئے یہ بات مکروہ نہیں ہے کہ وہ تین دن تک فقراء ومساکین پر صدقہ وخیرات کے لئے کھانا تیار کریں اور خود بھی استعمال کریں۔ لیکن ان ایام مصیبت یعنی تین دن رشتہ دار اور خویش و اقارب کے لئے کھانا پکانا اور اقرباء واصحاب کا کھانا، دونوں چیزیں مکروہ ہیں اور تین یوم گذرنے کے بعد میت پر ایصالِ ثواب کے لئے ہو، یا برسبیلِ ضیافت کھانا تیار کرنے میں،

اور اغنیاء وفقراء کو کھلانے میں، یا اُن کے ہاں کھانا بھیجنے میں، کوئی کراہت نہیں۔ کیونکہ اغنیاء کو صدقہ دینے میں بھی ثواب ہے لیکن فقراء و مساکین کو صدقہ دینے میں زیادہ اجر و ثواب ہے جیسا کہ شرح البرزخ واللآلی الفاخرہ فی تذکرۃ الآخرۃ میں مرقوم ہے، اس لئے کہ اموات کے لئے جو صدقہ و خیرات کیا جاتا ہے وہ صدقات واجبہ کی قسم سے نہیں ہے کہ محض فقراء و مساکین ہی کا حق ہو اور ان کے علاوہ دوسروں کے لئے جائز نہ ہو۔ بلکہ اموات کا صدقہ نفل اور تطوع کی قسم سے ہے لہذا فقراء کے علاوہ دیگر افراد اور اغنیاء وغیرہ کو کھلانا بھی جائز ہے۔

''بحر ذخار'' میں کہا گیا ہے کہ میت کے گھر والوں کا لوگوں کے واسطے کھانا تیار کرنا بدعت ہے اور اس کا جواز کسی سے منقول نہیں۔ تین دن تک ضیافت کا اہتمام کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ مصیبت، حزن اور تاسف کے دن ہیں۔ لہذا جو کام بھی خوشی و مسرت کے لوازم سے ہو اس کو ان دنوں میں انجام دینا غیر مناسب ہے۔ البتہ ایصال ثواب کی نیت سے فقراء و مساکین کے لئے کھانا تیار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس میں ایک شرط یہ ہے کہ میت کے وارث بالغ اور مالدار ہوں اور وہ حاضر رہیں اور میت کے ترکہ سے ضیافت کا اہتمام نہ کریں جیسا کہ ''بحر الرائق'' ''تاتارخانی''، ''فتح القدیر'' اور ''فتاوی قاضی خان'' میں مسطور ہے۔

اور ''فتاوٰی عالمگیر'' میں ہے کہ تین دن تک ضیافت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور خزانۃ المفتیین میں مرقوم ہے کہ میت پر ایصال ثواب کے لئے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اس کو کھانے کے لئے جانا مکروہ ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے اس فعل سے بری ہیں جو تین دن مکمل ہونے سے پہلے مصیبت کا کھانا کھا لیتے ہیں۔

اور ''شرح البرزخ واللآلی الفاخرۃ فی تذکرۃ الآخرۃ'' میں مذکور ہے کہ موتی کے

کھانے پرلوگوں کا اجتماع مکروہ ہے کیونکہ اس میں بعض کفار کے ساتھ مشابہت ہے۔

اور ''خزانۃ الروایات'' میں مسطور ہے کہ ضیافت مکروہ ہے جب کہ اس میں صرف اغنیاء اور اقرباءُ کو مدعو کیا جائے اور فقراء و مساکین اور ضعفاء کو محروم رکھا جائے۔

نیز ''خزانۃ الروایات'' میں مرقوم ہے کہ کسی شخص کے انتقال کی مصیبت اور حزن کے موقع پر دوسرے اور تیسرے دن دعوت کرنا بدعت ہے اور یہ عمل صحابہ کرام اور حضرات تابعین سے ثابت نہیں ہے۔

اور شرح سفر السعادۃ میں مسطور ہے کہ اہلِ میت کے لیئے جائز نہیں کہ وہ تعزیت کے لئے حاضر ہونے والوں کی دعوت کریں۔لیکن بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے جب کہ تعزیت کنندگان دور دراز علاقہ سے آئے ہوں اور ایک طویل مدت تک ٹھہرنے والے ہوں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت جان لینی چاہئے کہ عبادت، غیر مشروع کی تخصیص کی وجہ سے بدعت ہوتی ہے خواہ یہ تخصیص، زمان و مکان میں ہو خواہ دیگر وجوہ میں، جیسا کہ اصول میں مقرر ہے۔اس لئے مولانا شاہ اسماعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے دوسرے باب میں فرماتے ہیں

ہر وہ عبادت جو مسلمان سے ادا ہو، اور اس کا ثواب، وفات یافتہ اشخاص میں سے کسی شخص کی روح پر پہنچائیں تو یہ فعل خود اپنی جگہ معتبر اور مستحسن ہے اور ایصال ثواب کا طریقہ بارگاہ الٰہی میں دعائے خیر اور مغفرت ہے۔اور وہ شخص جس کی روح پر ایصالِ ثواب کیا جارہا ہے اگر وہ اہلِ حقوق میں شامل ہے تو اس کے حق کی مقدار میں اس ثواب کا پہنچانا مستحسن اور زیادتی ثواب کا باعث ہوگا۔لہذا عرس و فاتحہ اور اموات کی نذر و نیاز کے مراسم کا اس قدر درست اور ٹھیک ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

اوقات کا تعین اور کھانے کی قسم اور اس کی وضع اور کھانے والے یہ تمام امور قباحت

سے خالی نہیں ہیں۔تاریکی پر تاریکی کے مصداق ہے۔اور قباحت کے مراتب میں بہت فرق اور تفاوت ہے۔

.اور مولانا شاہ اسحاق دہلوی ''مائۃ المسائل'' کے سولھویں سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

چہلم کی فاتحہ کے لئے یوم کی تخصیص اس اعتقاد کے ساتھ کہ چالیس روز سے پہلے یا چالیس روز کے بعد فاتحہ کی گئی تو کھانے کا ثواب میت کو نہیں پہنچے گا یا یہ اعتقاد کہ چالیسویں روز ہی فاتحہ کرنے میں میت کو بہت زیادہ ثواب پہنچے گا، یہ ناجائز اور غلط اعتقاد ہے۔لہٰذا چالیس ویں دن سے پہلے اور اسکے بعد بھی فاتحہ کرنا درست ہے۔

نیز شاہ صاحب اس کتاب میں فتح القدیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اہلِ میت کے لئے یوم کی تخصیص کے ساتھ کھانا تیار کرنا مکروہ ہے۔چہلم ہو یا سوم، یا دسواں وغیرہ۔لہذا اس کام کے لئے کسی ایک دن کی تخصیص اور تعیین مکروہ ہوگی اور کھانا صدقہ دینا اور اس کا ثواب میت کو پہنچانا، کسی بھی دن ہو، جائز ہے اور یہ کسی دن پر موقوف نہیں اور میت پر ایصالِ ثواب کے لئے کسی ایک روز کا تعیین کرنا اس اعتقاد کے ساتھ کہ اسی روز ثواب زیادہ پہنچے گا اور دوسرے دنوں میں اس قدر ثواب نہیں پہنچے گا۔اس قسم کا خیال غلط ہے۔

سالانہ صدقہ کے تعین میں اختلاف ہے۔بعض علماء نے (یاتی قبور الشہداء علی راس کل حول) کی حدیث کی رو سے روز وفات کے تعین کو مستحسن قرار دیتے ہوئے سالانہ صدقہ کے تعین کو جائز قرار دیا ہے۔یہ حدیث شریف ابن جبیر کی کتاب میں موجود ہے اور اکثر علماء نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے سالانہ صدقہ کی تعیین کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ حدیث نبوی صحاح میں موجود نہیں ہے اور ابن جبیر کی کتاب میں صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع احادیث بھی پائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ مذکورہ حدیث متصل

الاسناد اور مرفوع بھی نہیں ہے۔ لہذا صحیح بھی نہیں ہے اور یہ حدیث مجمل ہے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ ”راس کل حول“ سے مراد اول سال یعنی اول محرم ہے یا رحلت شدہ شخص کی وفات کا اول سال ہے اور مجمل حجت کے قابل نہیں جیسا کہ اصول میں مذکور ہے۔ کذا فی مائۃ المسائل

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی کتاب، ماثبت بالسنۃ فی الایام والسنہ، میں ماہ ربیع الثانی کے بیان میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہمارے شہروں میں یہ جو عرف عام ہے کہ مشائخ کرام کی وفات کے ایام میں عرس مناتے ہیں اس کی کوئی شرعی بنیاد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے اپنے شیخ امام عبدالوہاب المتقی المالکی سے اس کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

یہ چیز مشائخ کرام کے طریقوں اور ان کے عادات واطوار سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں ان کی نیتیں اصل ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تمام دنوں کو چھوڑ کر وفات کے دن کی تخصیص کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اس پر فرمانے لگے کہ ضیافت تو مطلق کے طور پر بغیر کسی قید اور تخصیص کے، مسنون ہے۔ لہذا یوم کی تخصیص سے قطع نظر کیجئے اس کے لئے تو اور بھی مثالیں ہیں جیسے نمازوں کے بعد بعض مشائخ کرام کا مصافحہ کرنا، اور یوم عاشورہ میں سرمہ لگانا، بے شک مصافحہ کرنا اور سرمہ لگانا سنت ہے لیکن تخصیص کی وجہ سے بدعت ہے۔ اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا۔ مغرب کے مشائخ متاخرین نے کہا ہے کہ سارے ایام کے مقابلہ میں وفات کے دن زیادہ خیرات و برکات اور نورانیت کی امید ہے پھر شیخ محترم عبدالوہاب متقی نے اپنے سر کو جھکائے رکھا اور سر اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ یہ چیزیں سلف (صحابہ، تابعین، اتباع تابعین، ائمہ اربعہ) کے زمانے میں نہیں تھیں بلکہ یہ متاخرین کے مستحسنات ہیں۔

یہاں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اکثر علمائے کرام نے ابن جبیرؒ کی

حدیث (یاتی قبور الشہداء علی راس کل حول ) کو ضعیف قرار دیا ہے اور ضعیف حدیث فضائل اعمال میں معتبر ہے جیسا کہ ''شرح سفر السعادۃ'' اور ''در المختار'' میں ہے۔ اس بناء پر محبوب الٰہی شیخ نظام الدین بداوتی، قدوۃ الاولیاء شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، زبدۃ العرفاء خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز، ولی کامل مکمل شیخ بہاؤ الدین زکریا اور اس علاقہ کے اکثر شہروں کے علمائے کرام اور اولیائے عظام نے آباء واجداد اور اساتذہ ومشائخ کے حقوق کی ادائیگی کے خیال سے عرس اور فاتحہ کا اہتمام کیا۔ قدس اللہ اسرارہم

غرض غیر مشروع کی تعیین ( تاریخ سوم، دہم، بستم، چہلم، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ یا جو بھی روز اور تاریخ ہو ) اگر اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ تعیین وتخصیص ثواب کا باعث یا ثواب میں زیادتی کا باعث ہے تو یہ فکر اور عمل مکروہ ہے ( ورنہ جائز ہے ) جیسا کہ نمازوں میں کسی سورۃ یا آیت کی تخصیص اس اعتقاد کے ساتھ کہ ان کے علاوہ دوسری آیت یا سورۃ کی تلاوت جائز نہیں ہے تو یہ فکر اور عمل مکروہ ہے اور کسی سورۃ یا آیت کی تخصیص وتعیین اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ ان کے برخلاف دوسری سورۃ یا آیت کی تلاوت جائز ہے تو یہ فکر اور عمل مکروہ نہیں ہے جائز ہے۔

صاحب ''دستور القضاۃ'' باب دوم میں لکھتے ہیں کہ کتاب ظہیریہ میں مرقوم ہے کہ قرآن کی آیات کی تعیین اگر اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ اس کے بغیر بھی جائز ہے تو اس میں حرج نہیں اور کتاب ''شاہان فی الفروع'' میں ہے کہ اگر یہ اعتقاد ہو کہ ان آیات کے علاوہ دیگر آیات کی تلاوت بھی جائز ہے تو ٹھیک ہے۔ تعیین کا مقصد اس کی سہولت ہے تو کراہت نہیں بلکہ ایسا کرنا تو مستحب ہے کیونکہ وہ '' **فاقرء وا ماتیسر من القرآن** '' کی تلاوت کرنے کا پابند ہے اور جو چیز سہل اور یسر میں داخل ہے وہ افضل ہوگی۔

تعیین میں موجب ثواب اور زیادتی ثواب کا اعتقاد نہیں ہونا چاہئے طعام صدقہ کو

قبول کرنا علماء وفضلاء کے لئے مکروہ ہے۔عوام کے لئے نہیں چنانچہ مولانا شاہ اسحاق مہاجر مکی ''مائۃ المسائل'' کے ۵۱ ویں سوال کے جواب میں ''نوادر الفتاوٰی'' کے باب کراہیت و استحسان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد جو کھانا تیار کیا جاتا ہے، وہ اور علماء کے لئے مکروہ ہے۔ تین روز، ہفتہ، مہینہ اور سالانہ وغیرہ کا کھانا علماء وفضلاء اور اکابر حضرات کے لئے مکروہ ہے۔ عوام کے لئے کراہت نہیں ہے۔ چنانچہ سندا لعلماء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ:

حضرات امامین حسنین علیہما السلام کی نذر و نیاز کا کھانا جس پر سورۂ فاتحہ، سورۃ الاخلاص، اور درود شریف پڑھا جاتا ہے، کھانا جائز ہے کیونکہ وہ تبرک ہے لیکن اس کھانے کو تعزیہ اور علم کے پاس لئے جانے سے اور وہاں رات بھر رکھنے سے بلکہ حقیقی قبروں کے پاس لئے جانے سے کفار کے عمل کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کے اندر کراہت پیدا ہوجاتی ہے ۔واللہ اعلم بالصواب۔ اگر دن کی تعیین و تخصیص وقتِ دعا کی یادداشت کے لئے ہے تو مکروہ نہیں ہے لیکن ہمیشہ اسی روز کو لازم کر لینا بدعت ہے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں۔

زیارت قبور کے لئے دن معین اور مخصوص کرنا بدعت ہے۔ اور دراصل زیارت جائز ہے۔ وقت کی تخصیص و تعیین سلف کے زمانے میں نہیں تھی۔ یہ بدعت اسی قبیل کی ہے کہ اس کی اصل جائز ہے اور وقت کی تخصیص بدعت ہے جیسا کہ ملک توران وغیرہ میں بعد نماز عصر مصافحہ کا رواج ہے اگر عرس کا دن میت کے حق میں دعا کرنے اور ایصال ثواب کے لئے اور وقت کی یاددھانی کی خاطر ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اسی دن کو لازم کر لینا بھی بدعت ہے جس کی تفصیل ابھی اوپر گذری۔

مذکورہ دلائل وشواہد سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ تعیین اور تخصیص اگر آسانی کے

واسطے ہو یا یادداشت کے خاطر ہو، اور اس میں موجب ثواب، یا ثواب میں زیادتی کا اعتقاد نہ ہوتو تعیین و تخصیص میں کراہت نہیں ہے۔

نیز یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ دعوت قبول کرنے میں موانع، محرمات اور مشتبہات ہوتے ہیں چنانچہ اس کی تفصیلی چھٹے فائدہ میں گذر چکی ہے۔ ہر چند کے مکروہات، قباحت سے خالی نہیں ہوتے اور اجر وثواب میں نقصان اور کمی کا باعث ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی قباحت اس درجہ کی نہیں ہوتی ہے کہ وہ دعوت قبول کرنے میں محرمات کی طرح مانع ہو جاتے ہیں۔

صاحب'' الاشباہ والنظائر فی االکتاب الخطر والاباحة '' نے بڑی عمدہ بات کہی کہ ہمارا دور شبہات سے اجتناب کرنے کا نہیں ہے جیسا کہ خانیہ اور تجنیس میں بھی مرقوم ہے اور حضرت حموی اس قول'' لیس زماننا زمان الشبهات '' کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر بن ابراہیمؒ سے ان شبہات سے متعلق سوال کیا جو حرام سے قریب ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ زمانہ شبہات کی تفتیش کے درپے ہونے کا نہیں ہے۔ ہمارے لئے حرام سے بچے رہنا ہی کافی ہے جیسا کہ تجنیس میں مرقوم ہے۔

یہ تو اس زمانے اور مسلم حکومت کا حال ہے۔ مسلمانوں کے اس دورِ غربت و اجنبیت میں اور انگریزوں کی حکومت میں مشتبہات سے کیا اجتناب کیا جا سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں بعض نادانوں کی افراط وتفریط دیکھنے کے لائق ہے کہ خود حرام لقمہ کھانے سے پرہیز نہیں کرتے لیکن صدقات مکروہ اور غیر مکروہ کو شدید ترین حرام خیال کرتے ہیں (حالانکہ صدقۂ مکروہ کے اندر ثواب کی کمی ہے، یہ نہیں کہ وہ ثواب ہی سے خالی ہے) اور اس ظن فاسد کی وجہ سے ایک عالم کو صدقات کے کھانے اور کھلانے سے مانع اور حائل ہو رہے ہیں اور صدقہ دینے والوں کو ثواب سے محروم کر رہے ہیں اگر کسی درخت پر غبار

چھپایا ہوا ہے تو اس کو دور کرنا چاہئے نہ کہ درخت ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

اور طرفہ طرازی تو یہ ہے کہ اس خیال خام کی وجہ سے اس قسم کی دعوت قبول کرنے پر بحر العلوم عبد العلی انصاری لکھنوی اور سند العلماء شاہ عبد العزیز دہلوی اور سید واعظ مولانا سید احمد مجاہد اور مولانا ارتضاء علی خان صفوی اور دیگر علماء ومشائخ کو جن کے تعلق سے نیک گمان ہی کیا جا سکتا ہے، طعنہ دے رہے ہیں اور ان گذرے ہوے علماء پر طعن وتشنیع سے دینی مسائل کے اندر ان نادانوں کی جہالت وناواقفیت ظاہر ہو رہی ہے اور ان کے بے ادب اور شوخ وگستاخ ہونے کا ثبوت مل رہا ہے۔ سولھویں مقدمہ میں تعزیہ بے ادبی پر تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۹)

# نذر ونیاز کا حکم

مخلوق زندہ ہو یا مردہ۔ اس کی نذر حرام ہے، نذر خواہ ماکولات کی ہو یا مشروبات کی ہو، یا نقود کی ہو۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کے لئے عبادت جائز نہیں۔

صاحب فتاویٰ الخیر یہ فرماتے ہیں مخلوق کی نذر حرام ہونے پر اجماع ہے۔

فتاوٰی عالمگیری میں مرقوم ہے کہ وہ نذر جس میں اکثر عوام مبتلا ہیں، یہ ہے کہ کسی ولی اللہ کی قبر پر حاضر ہوتے ہیں اور مزار کا غلاف پکڑ کر عرض کرتے ہیں یا سیدی فلاں، اگر میری مُراد پوری ہو جائے تو میری جانب سے آپ کو سونے کی یہ چین پیش کروں گا۔ اس طرح کی نذر باطل ہونے پر اجماع ہے۔ ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ یا اللہ میں نے تیری نذر کی ہے اگر تو میرے فلاں مریض کو شفا عطا فرمائے یا میری فلاں مراد پوری کر دے تو میں سیدہ

نفیسہ (یا کسی اور بزرگ کا نام لے کر) کی درگاہ شریف کے پاس بسنے والے مساکین وفقراء کو کھانا کھلاؤں گا، یا مسجد کے لئے فرش یا چراغ جلانے کے لئے تیل دونگا یا اس شخص کو روپیہ دونگا جو مسجد کی خدمت کرتا ہے تو یہ نذر درست ہے۔ اس لئے کہ یہ ان اشیاء میں سے ہیں جن کا فائدہ فقراء کے لئے ہے اور نذر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور ولی کا ذکر نذر میں اس لئے جائز ہے کہ وہ مستحقین نذر پر نذر کو خرچ کرنے کا محل ہیں لیکن نذر کا مصرف صرف فقراء ہیں۔ اور نذر ذی علم اور شیخ کی درگاہ پر حاضر ہونے والوں پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے مگر جب کہ یہ فقیر و محتاج ہوں تو جائز ہے۔

اور اولیاء اللہ کی مزارات پر اولیاء اللہ کے تقرب کے اعتقاد سے جو چیزیں لئے جاتی ہیں ان کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔ بیک قول جب تک کہ نذر میں محلّہ کے فقراء و مساکین پر اس مال کے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کیا گیا ہو اور عوام کی اکثریت اسی غلطی میں مبتلا ہے۔ فقہائے کرام کے ان اقوال سے اتنی بات واضح ہے کہ نذر اگر بالاستقلال کسی ولی کے لئے ہے تو یہ باطل ہے اور اگر نذر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور ولی کا ذکر مصرف کے بیان کے واسطے ہو تو یہ نذر صحیح ہے۔

۱. اس مسئلہ میں مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بڑی عمدہ تحقیق کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس امت میں ارواح سے استعانت طلب کرنا کثرت سے واقع ہے۔ اس امت کے جہلاء اور عوام جو ہر کام میں اولیاء اللہ کو مستقل فاعل سمجھ لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ شرک جلی ہے۔ حاجات اور مرادیں پوری ہونے کے لیے اولیاء اللہ کی جو نذریں مانی جاتی ہیں وہ معمول اور مرسوم ہیں۔ اکثر فقہائے کرام نے ان کی حقیقت اور نوعیت کو کما حقہ سمجھنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اور اولیاء اللہ کی نذر کو اللہ کی نذر پر قیاس کرتے ہوئے اس پر حرام کا حکم لگادیا۔ نذر اگر بالاستقلال ولی کے واسطے ہو تو یہ صحیح ہے۔ لیکن اس نذر کی حقیقت یہ ہے

کہ میت کی روح کو انفاق مال اور اطعام طعام کے ثواب کا ھدیہ پہنچایا جائے اور یہ صحیح احادیث کی رو سے ایک امر مسنون ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم میں ام سعد وغیرھا کے بارے میں وارد ہے اور ایسی نذر پوری کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اس نذر کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ کو نذر ربانی ہو تو اس طرح کہیں۔ اھدٰی ثواب ھذاالقدر الی روح فلاں ۔ اس چیز کا ثواب میں فلاں بزرگ کی روح کو پہنچاتا ہوں۔ ایسی صورت میں ولی کا ذکر عمل منذور کے تعین کے واسطے ہے نہ کہ مصرف کے واسطے، اور اس نذر کا مصرف نذر کنندگان کے پاس اس ولی کے متوسلین ہوتے ہیں مثلاً اقاریب، خدام اور ہم سلسلہ اشخاص وغیرہ۔

بے شک نذر کنندگان کا مقصد یہی ہے تو اس نذر کا شرعی حکم یہ ہے کہ بلا شبہ جائز ہے اور اس کا پورا کرنا واجب ہے اور اس لئے کہ شریعت مطہرہ میں یہ معتبر قربت اور صحیح تقرب ہے۔

ہاں! اگر اس ولی کو بالاستقلال، حلاّل مشکلات یا شفیع غالب ہونے کا اعتقاد رکھا جائے تو یہ عقیدہ شرک اور فساد تک پہنچانے والا ہے لیکن واضح رہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنا علاحدہ چیز ہے اور نذر ایک علاحدہ چیز۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ نذر کا لفظ ہدیہ وغیرہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے چنانچہ صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں۔

نذر بفتح نون اور سکون ذال معجمہ، پیمان کے معنی میں ہے اور نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی جانب سے کسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لے مثلاً روزہ رکھنا، اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا، بزرگوں کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا کھلانا وغیرہ۔

اور وہ نقد و جنس جو امراء اور سلاطین کی خدمت میں ملاقات کے وقت پیش کرتے ہیں وہ بھی نذر ہے۔ اور امام ربانی مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے۔ نذر شما رسید۔ تمہاری نذر پہنچی اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے صراط مستقیم میں لکھا ہے کہ اولیاء

اللہ کی نذر و نیاز کے صحیح ہونے میں شک اور شبہ نہیں۔

اور بادشاہوں کی خدمت میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ تمام عبادت کے معنی میں نہیں ہیں بلکہ ھدیہ کے معنی میں ہیں۔ مسئلہ نذر کے تعلق سے لوگ ایک دوسرے کے بزرگوں پر جو طعن و تشنیع کررہے ہیں اس سے ہر فریق کی نادانی و جہالت اور نفسانیت ظاہر ہورہی ہے۔

۱؎ ترجمہ حاشیہ : نذر میں مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی اپنے چچا و مرشد مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی سے موافقت رکھتے ہیں چنانچہ صراط مستقیم کے دوسرے باب میں فرماتے ہیں جیسا کہ ماحصل یہ ہے۔

اولیاء اللہ کی نذر و نیاز اگر اس وضع اور طریقہ پر پوری کی جائے کہ اس میں شرکِ خفی مال کا اسراف اور متعدد وجوہ سے بدعات کا اختراع نہ ہو تو نذر و نیاز مستحسن اور مستحب ہے اور وہ شریعت مطہرہ کے حکم کے موافق ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۱۰)

## آدمی کے جھوٹے کا حکم۔ مشرک اور کتابی کے ذبیحہ کا حکم اور ان دونوں کے ذبیحہ کے کھانے کا حکم

آدمی کا جھوٹا پاک ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، جنبی ( جنابت والا شخص ) ہو یا حائضہ، گھوڑے کا جھوٹا اور ہر اس حیوان کا جھوٹا پاک ہے جس کا گوشت حلال ہے جیسا کہ ترجمہ الھدایہ اور اس کے علاوہ دیگر کتابوں میں مرقوم ہے

کتا، خنزیر، اور چیر پھاڑ کر کھانے والے جانوروں کا جھوٹا نجس ہے۔ بلی اور گلی کوچوں میں پھرنے والا مرغ اور چیر پھاڑ کر کھانے والے پرندوں کا جھوٹا اور گھروں میں

رہنے والے جانوروں مثلاً چوہا وغیرہ کا جھوٹا مکروہ ہے۔ خچر اور گدھے کا جھوٹا مشکوک ہے اگر پاک پانی موجود نہ ہو اور آب مشکوک موجود ہو تو وضو کے بعد تیمّم کیا جائے یا اس کے برعکس (تیمّم بعد وضو) عمل کیا جائے اور ہر جانور کے پسینہ کا حکم اس کے جھوٹے کا ہی حکم رکھتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں ایسا ہی مرقوم ہے۔

اس سے یہ بات جان لینی چاہئے کہ مردار حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ انما حرم علیکم المیتۃ ۔ اور ذبیحہ حلال ہے بشرطیکہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو۔ یا کتابی۔ لہذا ایک مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے اور اسی طرح ایک کتابی کا ذبیحہ بھی حلال ہے اگر چہ کہ وہ حربی ہو۔ اور اسی طرح کافر عربی (یہودی ہو یا نصرانی) اور تغلبی (تا کو فتح، لام کو کسرہ، اور غین کو سکون کے ساتھ پڑھا جائے۔ تغلب ایک قبیلہ کے جد اعلیٰ کا نام ہے اور جو شخص بھی اس قبیلہ کی طرف منسوب ہے اس کو تغلبی کہتے ہیں ۔ اس قبیلہ کا شمار عیسائیوں میں ہوتا ہے۔ ترجمہ حاشیہ ۵۲ فصل الخطاب) کا ذبیحہ بھی حلال ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام سے ذبح کرے کیونکہ قرآن کریم میں وارد ہے و طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم۔

اے مسلمانو! اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے جیسا کہ ترجمۃ الھدایۃ میں مرقوم ہے لیکن بہتر اور مناسب یہی ہے کہ ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے جیسا کہ طحطاوی میں مرقوم ہے۔ اور ان (کتابی، حربی، کافر عربی) کے علاوہ دوسروں کا ذبیحہ کھانا حرام ہے۔ اور ذبیحہ کے سوا کافر کتابی یا غیر کتابی کا کھانا حلال ہے اور اکثر فقہاء کرام کا یہی موقف ہے۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ اللہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا انما المشرکون نجس مشرکین نجس ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفسیر حسینی فرماتے ہیں

بجز اس کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مشرکین، باطن کی خباثت اور عقیدہ کی گندگی کی وجہ سے نجس اور پلید ہیں یا اس وجہ سے کہ یہ لوگ نجاستوں سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔

یا جنابت کا غسل نہیں کرتے، اور حضرت ابن عباسؓ کا کہنا ہے کہ مشرکین کتوں کی طرح نجس العین ہیں۔

امام ربانی مکتوبات کی تیسری جلد کے ۲۲ ویں مکتوب میں ملا مقصود علی تبریزی کو لکھتے ہیں کہ یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ تفسیر حسینی ارسال کرنے کا مقصد کیا تھا، صاحب تفسیر انما المشرکون نجس کی تفسیر، ائمۂ احناف کے مسلک کے مطابق کرتے ہیں اور مشرکین کے نجس ہونے کا سبب، ان کے باطن کی خباثت اور اعتقاد کی گندگی قرار دیتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد جو بات وہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نجاستوں سے اجتناب نہیں کرتے۔ اگر مشرکین کے نجس ہونے کا سبب، ان کے باطن خباثت اور اعتقاد کی گندگی قرار دیتے ہیں اس وضاحت کے بعد جو بات وہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نجاستوں سے اجتناب نہیں کرتے اگر مشرکین کے نجس ہونے کی صرف یہی ایک علت ہے تو یہ چیز آج اکثر اہل اسلام میں بھی موجود ہے۔ اس حیثیت سے اہلِ ایمان کے عوام اور کفار و مشرکین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر نجاسات سے اجتناب نہ کرنا ہی آدمی کے نجس ہونے کا سبب ہے تو پھر معاملہ تنگ ہو جائے گا اور اسلام میں سختی و تنگی اور حرج نہیں ہے۔ لا حرج فی الاسلام

اور صاحب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول ''مشرکین کتوں کی طرح نجس ہیں'' جو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ان کا یہ قول توجیہہ اور تاویل کا متقاضی ہے اور یہ شواذ کی قسم سے ہے۔ اس طرح کے اقوال بزرگانِ کرام سے بکثرت منقول ہیں۔ مشرکین کیونکر نجس عین ہو سکتے ہیں، جب کہ سرور دین علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک یہودی کے گھر کھانا کھایا اور طہارت کے لیے ایک مشرک کے برتن کا پانی استعمال فرمایا اور حضرت عمر فاروقؓ نے ایک آتش پرست عورت کے برتن کے پانی سے طہارت حاصل کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہو سکتا ہے کہ انما المشرکون نجس والی آیت کریمہ متاخر

ہواور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، حضرت فاروقؓ کے اثر کے لئے ناسخ ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس دعوٰی کے لیے واضح ثبوت چاہئے، صرف احتمال اور محض گمان کافی نہیں بلکہ آیت کے موخر ہونے کو ثابت کیا جائے تا کہ نسخ کے دعویٰ میں صحت پیدا ہو سکے۔ اس لئے کہ خصم، مدعٰی کے تعیین میں اپنے بیان کا التزام، استفسار کے بعد ہی کرے گا۔ اس سے قبل نہیں! (مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی ترجمہ مشکوٰۃ ''باب اللباس'' میں تحریر کیا ہے کہ ایک حکم کو دوسرے حکم کے ذریعہ منسوخ کرنا کوئی پسندیدہ اقدام نہیں کیونکہ نسخ میں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ ناسخ، منسوخ سے مؤخر ہے۔ لہذا اس باب میں قائل کا محض گمان اور احتمال کافی نہیں ہے۔ ترجمہ حاشیہ ۵۳ فصل الخطاب)

اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ واقعی آیت کریمہ مؤخر ہے تو اس صورت میں بھی تحریم ثابت نہیں ہوگی اور نجاست سے مراد باطن کی خباثت اور گندگی ہوگی کیونکہ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کسی بھی پیغمبر نے کوئی ایسا کام انجام نہیں دیا جو بالآخر اس کی شریعت میں، یا دوسرے پیغمبر کی شریعت میں وہ کام حرام قرار پایا ہو، اگر چہ کہ اس کام کو انجام دینے کے وقت وہ کام مباح ہی رہا ہو، چنانچہ شراب جو شروع میں مباح تھی اور آخر میں حرام ہوگئی لیکن کسی پیغمبر نے شراب کو استعمال نہیں کیا۔

اگر مشرکین بالآخر ظاہری اعتبار سے نجس قرار پاتے اور کتوں کی طرح نجس عین قرار دیے جاتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو محبوب رب العالمین ہیں ہرگز ان کے برتنوں کو تک نہیں چھوتے چہ جائیکہ آپ ان کا کھانا کھاتے اور ان کا پانی استعمال فرماتے۔

نجاست کے مسئلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ نجس عین ہر وقت نجس عین ہے اس میں اباحت سابق اور لاحق کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگر مشرکین نجس عین ہوتے تو آغاز وحی سے ہی نجس عین ہونا چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آغاز ہی سے ان کے ساتھ

ان کی اس حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے معاملہ فرماتے حالانکہ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جب آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر وہ نجس عین بھی نہیں تھے۔

نیز دین کے اندر سختی وتنگی اور حرج کو ختم کر دیا گیا ہے اور آپ کی ذات گرامی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مشرکین کے حق میں نجس ہونے کا حکم دینا اور ان کو نجس عین خیال کرنا مسلمانوں پر کس قدر سختی اور تنگی پیدا کرنا ہے اور ان کو کس قدر تکلیف ومصیبت میں مبتلا کرنا ہے۔ ائمۂ احناف کے ممنون ومشکور رہنا چاہیئے کہ انہوں نے اجتہاد واستنباط اور استحسان کے ذریعہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کے لئے خلاصی اور رہائی کا راستہ ہموار کیا اور حرام کے مرتکب ہونے سے بچالیا، اور ان ائمہ احناف اور بزرگان کرام کے احسان مند رہنا چاہیئے نہ کہ ان پر طعن وتشنیع کی جائے اور ان کے فضل وکمال اور ہنر کو عیب ونقص خیال کیا جائے۔ اور یہ علمی احسان ناشناسی ہے مجتہد پر اعتراض کی کیا گنجائش؟ اس کی خطاء بھی ایک درجہ ثواب کی مستحق ہے اور اس کی تقلید اگر چہ کہ خطا ہی کیوں نہ ہو، نجات کا باعث ہے۔

اور جو علمائے کرام کفار ومشرکین کے کھانے اور پانی کے استعمال کو حرام قرار دیتے ہیں، خود ان کا اس چیز سے محفوظ رہنا عادتاً ناممکن اور محال ہے اور بالخصوص ہندوستان میں تو یہ ابتلاء اور مصیبت زیادہ ہے لہذا ایسا مسئلہ جو عموم بلوی (یعنی وہ مصیب جس میں سبھی گرفتار ہوں) کی حیثیت اختیار کر گیا ہو اس کے اندر مناسب یہی ہے کہ فتوی بہت آسان دینا چاہیئے اگر چہ کہ اپنے مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایسے مسئلہ کے اندر ائمہ اربعہ میں سے جس امام کا مذہب سہل ترین نظر آئے اسی کے مطابق فتوی دینا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔ یرید اللہ ان یخفف عنکم۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے) کی رو سے مسلمانوں کو سختی وتنگی اور حرج میں مبتلا کر دینا اور ان کو

رنج وکلفت میں ڈال دینا حرام ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے۔

بعض مسائل جن میں امام شافعیؒ کا موقف قدرے سخت ہے۔ ان میں شافعی علماء، حنفی مذہب کی روشنی میں فتوی دیتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے آسانی اور سہولت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ کے مصارف میں صدقہ کو زکوٰۃ کی تمام اقسام پر تقسیم کرنا چاہئے جن میں سے ایک قسم تالیف قلوب بھی ہے جو اس دور میں مفقود ہے۔ شافعی علمائے کرام، حنفی مذہب کے مطابق فتوی دیتے ہیں۔ اور ان اصناف میں سے مؤلفۃ قلوب کے بجائے جس صنف کو دیں، کافی قرار دیتے ہیں۔

نیز اگر مشرکین نجس عین ہیں تو ایمان لانے کے بعد بھی وہ نجس عین رہیں گے، لہذا اسی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی نجاست، اعتقاد کی گندگی کی وجہ سے ہے جو ایک زائل ہونے والی چیز ہے اور اندرونی نجاست، بیرونی نجاست سے برسرِ پیکار نہیں رہتی چنانچہ یہ بات ایک کمینہ شخص اور ایک شریف شخص سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ دونوں ظاہر کے اعتبار سے ایک ہی نظر آتے ہیں لیکن باطن کے اعتبار سے دونوں مختلف اور متضاد ہیں۔

نیز انما المشرکون نجس ، والا کلام حسنِ انتظام مشرکوں کی حالت کی خبر دے رہا ہے (یعنی اخبار ہے، انشاء نہیں) اور اخبار میں ناسخیت اور منسوخیت کا کوئی کام نہیں کیونکہ نسخ کسی حکم شرعی کے انشاء میں ہوتا ہے۔ اخبار میں نہیں۔

پس چاہئے کہ مشرکین اگر نجس عین ہی ہیں تو وہ ہر وقت نجس ہی ہوں لیکن ایسا نہیں ہے لہذا نجاست سے مراد اعتقاد کی گندگی رہے تاکہ دلائل میں تعارض اور تصادم نہ ہو اور ان کا جھوٹا کسی بھی وقت میں حرام نہ ہو۔ جس دن فقیر نے اس مبحث میں آیتِ کریمہ و طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم (اور اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے) پڑھی تھی تو آپ نے اس کے مقابلہ میں کہا تھا کہ آیت شریفہ میں طعام سے مراد گیہوں، چنا اور مسور کی دال

راس توجیہہ کو اہلِ عرف پسند فرمالیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن انصاف درکار ہے۔

اس تکلیف دہی اور طویل کلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر رحم کریں اور مشرکین پر نجس ہونے کا عمومی طور پر حکم نہ لگائیں۔ اور ہندوستانیس مسلمانوں کو بھی کفار و مشرکین کے ساتھ اختلاط اور ارتباط کی وجہ سے نجس خیال نہ کریں کیونکہ ان کے ساتھ اختلاط اور ارتباط اور باہمی میل جول کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور فرار کی کوئی صورت بھی نہیں۔

اور نجاست کا وہم و گمان کرتے ہوئے مسلمانوں کے کھانے اور پینے سے اجتناب نہ کریں اور اس عمل کو احتیاط خیال نہ کریں بلکہ اس احتیاط تو اس احتیاط کے ترک کرنے میں ہے۔ اندکی پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزرہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اپنا غم دل تو تمہارے سامنے تھوڑا ہی بیان کیا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کا دل آزردہ نہ ہو جائے ورنہ باتیں تو کہنے کی بہت کچھ ہیں۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں کہ

حلال و حرام کے مسئلہ میں اصل بات جو جاننے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ شریعت نے لوگوں کو یہ نہیں کہا ہے کہ ان چیزوں کو کھائیں جو خدائے تعالیٰ کے علم میں حلال ہیں۔ ایسا اس لئے نہیں کہا گیا کہ کسی فرد بشر کی یہ طاقت نہیں کہ وہ علمِ الٰہی میں سے تحلیل کے حصہ کو جان لے، بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ وہ چیزیں کھائیں جو شریعت مطہرہ سے جانتے ہیں کہ حلال ہیں یا ان میں حرام کا ظہور نہیں ہوا ہے اور یہ بات آسانی کے ساتھ معلوم کی جاسکتی ہے۔ تو اس کے لئے یہ دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک کے پانی سے طہارت حاصل کی اور حضرت عمرؓ نے ایک مجوسی عورت کے برتن کا پانی طہارت کے لئے استعمال کیا۔ اگر یہ حضرات تشنہ لب ہوتے تو پانی بھی نوش فرماتے حالانکہ گندی چیز پی لینا، حلال نہیں ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ ان کے ہاتھ گندے تھے کیونکہ وہ شراب پیتے تھے اور مردار

کھاتے تھے۔لیکن جب کسی قسم کی گندگی اور پلیدی نہیں دیکھی اور نہیں پائی تو پاکی کی وجہ سے ان کے ہاتھ کا کھانا کھایا اور پانی استعمال فرمایا۔اور حضرات صحابہ کرام جس شہر میں بھی جاتے تھے کافروں اور مشرکوں سے کھانا خرید تے اور ان کے ساتھ مل جل کر کام کرتے تھے باوجود اس کے کہ ان کے زمانے میں بھی چور،سودخوار اور شراب پینے والے اور بیچنے والے سبھی قسم کے لوگ تھے لیکن کبھی صحابہ کرام نے دنیا کے مال اور دنیاوی فوائد سے اپنا ہاتھ نہیں روک لیا اور تمام کو بھی برابر خیال نہیں کیا۔ان بزرگوں نے جن مشرکوں میں علانیہ نجاست دیکھی تو ان سے کنارہ کش رہے اور جن میں پاکی وصفائی دیکھی تو ان کے ہاتھ کا کھانا کھایا اور پانی پیا،اور معاملات کو ضرورت اور حاجت کے مطابق برقرار رکھا۔

اس مسئلہ میں بعض عوام کی افراط وتفریط بڑی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے کبھی کافرو مشرک کے جھوٹے کو نجس خیال کرتے ہیں،اور جس جگہ کافر کے چھوٹے کے سوا پانی موجود نہ ہو تو اس پانی سے وضو،غسل اور نماز ادا کرتے ہیں حالانکہ آدمی کا جھوٹا پاک ہے۔

اور کبھی عیسائیوں کے ذبیحہ کو حرام کہہ دیتے ہیں حالانکہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔

اور کبھی مشرک کے کھانے اور پانی کو حرام خیال کرتے ہیں۔حالانکہ کافر اور مشرک کا کھانا اور اس کا پانی حلال ہے جیسا کہ اس کی تفصیل ابھی اوپر گذری۔

مذاہب میں وسیع اور سہل ترین مذہب صرف اسلام ہے اور تنگ و دشوار ترین مذہب یہودیت ہے۔کم عقل اور کوتاہ نظر لوگ وسیع ترین اور سہل ترین مذہب (اسلام) کو تنگ اور دشوار ترین مذہب (یہودیت) سے بھی زیادہ تنگ ترین اور دشوار ترین بنا دینا چاہتے ہیں۔اور مسلمانوں کو تنگی و سختی اور حرج میں ڈال رہے ہیں اور بزرگانِ دین پر لعن وطعن اور تشنیع کر رہے ہیں۔معاذ اللہ من ذلک۔

# فائدہ نمبر (۱۱)

# تمباکو استعمال کرنے کا حکم

تمباکو کا استعمال بدعت ہے لیکن ہر بدعت مذموم نہیں کیونکہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، حرام، مندوب، مباح اور مکروہ

بدعت کی حیثیت کو پہچاننے کے لئے یہ ضابطہ اور اصول ہے کہ اس کو قواعد شریعت کی روشنی میں دیکھیں اور جو بدعت، واجب کے قواعد کے تحت داخل ہو تو وہ بدعت واجبہ ہے۔ اور جو حرام کے قواعد کے تحت میں داخل ہو تو وہ بدعت محرمہ ہے، اور جو مندوب کے قواعد کے تحت میں داخل ہو تو وہ بدعت مندوبہ ہے اور جو مکروہ کے قواعد کے تحت میں داخل ہو تو وہ بدعت مکروہ ہے اور جو مباح کے قواعد کے تحت میں داخل ہو تو وہ بدعت مباحہ ہے۔

اس باب میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے کہ اشیاء میں اصل کیا ہے چنانچہ بعض حرام، بعض توقف اور بعض اباحت کے قائل ہیں۔ صاحب ''دُر'' نے لکھا ہے کہ فقہاء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کے اعتبار سے جائز اور مباح ہے (جب تک کہ اس کے اندر کوئی برائی شامل نہ ہو) نباتات بھی اپنی اصل کے اعتبار سے اباحت کے درجہ میں ہیں۔ مگر جو نباتات، زندگی، یا عقل، یا صحت و تندرستی کو ختم کر دینے والی ہوں تو وہ حرام ہوں گی۔ اور جو نباتات، عقل، یا صحت، یا زندگی کو ختم کرنے کی حد تک کو نہ پہنچے تو وہ حرام نہ ہوں گی۔ اور جب ایک مقدار معین کے ساتھ تمباکو استعمال کرنے میں مذکورہ تین علتوں (ازالۂ حیات و عقل و صحت) میں سے کوئی علت نہیں پائی جا رہی ہو تو تمباکو کا استعمال بھی شریعت کے کلی قاعدہ میں داخل ہوگا (ہر چیز اصل کے اعتبار سے مباح ہے) اور اس کا ایک مقدار معین کے ساتھ استعمال کرنا بدعت مباحہ ہوگا اور اگر تمباکو کے زیادہ استعمال سے عقل و

صحت اور زندگی کے لئے نقصان ہورہا ہے تو یہ چیز ممنوع ہوگی چنانچہ یہی حکم ساری مباح چیزوں کا بھی ہے۔

جمادات میں تھوڑا چونا پان کے استعمال کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے اگرچہ کہ اس کا زیادہ استعمال نمایاں طور پر نقصان پہنچاتا ہے یا آدمی کو ختم کردیتا ہے لیکن اس کے برخلاف تمباکو، بلغم کو سر اور معدہ سے کھینچ نکالتا ہے۔ اور بلغمی مزاج اور سرد طبیعت والے آدمی کو اور دانتوں میں درد اور کیڑے والے شخص کو تمباکو استعمال کرنا فائدہ مند ہے، اور تمباکو کی ناس، نزلہ اور زکام کے لئے مفید ہے پھر بھلا ان فوائد کے ہوتے ہوئے اس کا استعمال کیونکر ناجائز اور حرام ہوسکتا ہے۔

ہاں! اگر کسی خاص شخص کو تمباکو کا استعمال نقصان پہنچارہا ہے تو اس کا استعمال ضرر رسانی کے باعث صرف اس شخص معین کے لئے ممنوع ہوگا نہ کہ سارے لوگوں کے لئے۔ جیسا کہ کسی گرم مزاج والے آدمی کو شہد کا استعمال نمایاں طور پر نقصان پہنچارہا ہے تو اس شخص معین کے لئے شہد حرام ہوگا نہ کہ سارے لوگوں کے۔ لئے۔

بیڑی، سگریٹ استعمال کرنے کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز ہے چنانچہ حموی ''صاحب الاشباہ والنظائر'' کے اس قول ''والنباتات سمیتھا مجھولۃ (وہ نباتات جن کا زہریلہ پن معلوم نہ ہو) کے تحت میں جو قاعدہ ثالثہ میں درج ہے۔ لکھتے ہیں

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بیڑی سگریٹ کا استعمال حلال ہے۔ اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بادشاہ بخارا کے دسویں سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

کل دخان حرام (ہر دھواں بیڑی، سگریٹ، چلہ وغیرہ حرام ہے) حدیث

شریف نہیں ہے اور حقہ کشی کے حرام اور حلال ہونے میں اختلاف ہے، صحیح ترین قول یہ ہے کہ حقہ کشی مکروہ تحریمی ہے اور مکروہ تحریمی ہونے کی ایک علت تو وہ بدبو ہے جو حقہ کش کے منہ سے باہر آتی ہے جیسا کہ کچی پیاز اور کچا لہسن کے استعمال کرنے والے کے منہ سے۔

حقہ کشی مکروہ ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ حقہ پینے والے شخص کے منہ سے جو دھواں نکلتا ہے وہ دوزخیوں کے منہ سے نکلنے والے دھویں کا منظر پیش کرتا ہے لہذا اہلِ دوزخ کے ساتھ اس تشابہ کی وجہ سے حقہ کشی مکروہ تحریمی ہے۔

دسویں سوال کے جواب میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ حقہ کے مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ تمباکو کی گھانس کے اندر حرام کی وجہ متحقق نہیں ہے کیونکہ نباتات میں سے کسی نباتات کے حرام ہونے کی علت دو چیزوں پر منحصر ہے ایک زہر، دوسری نشہ، اور تمباکو کی گھانس کے اندر زہر اور نشہ دونوں چیزیں نہیں ہیں لیکن اس کے استعمال میں اس کیفیت اور جہت سے کہ اس کے دھویں کو ہم اپنے اندر کھینچتے ہیں تین وجوہات سے کراہت لاحق ہوتی ہے۔

پہلی وجہ وہ بدبو ہے جو ایک حقہ پینے والے شخص کے منہ سے نکلتی ہے۔

دوسری وجہ اہلِ دوزخ کے ساتھ مشابہت اور مماثلت ہے جیسا کہ کمر پر ہاتھ رکھ کے کھڑے ہونے کو، اور لوہے کی انگوٹھی استعمال کرنے کو، شریعت نے مکروہ قرار دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس وضع کا استعمال مسلمان کو آگ سے قریب اور مشابہ بنا دیتا ہے اور آگ کے ساتھ ملابست اور مشابہت مکروہ ہے۔ اس لئے کہ آگ عذابِ الہی کی ایک صورت ہے اسی وجہ سے داغ دینے کی ممانعت اور کراہت آئی ہے۔

ہر چند کہ ان تین وجوہات سے نہی تنزیہی لازم آتی ہے لیکن ان تنزیہات کا اجتماع، کراہتِ تحریمی تک پہنچا دیا ہے۔

بعض عقلاء نے یہ تصریح کی ہے کہ کل دخان حرام اگرچہ کہ حدیث شریف نہیں

ہے لیکن معنی و مفہوم کے لحاظ سے دھواں دو چیزوں کا مرکب ہے (ارضیت اور ناریت، آگ، اور مٹی) اور یہ دونوں حرام ہیں۔ اور جو چیز ان دونوں سے مرکب ہے وہ بھی حرام ہوگی۔ مثال کے طور پر پان میں چونے کا استعمال، اور دواؤں میں طین مختوم اور طین ارمنی کا استعمال ارمن ایک ملک کا نام ہے جو درمیان ایران اور فرنگ کے واقع ہے۔ پس اگر بیڑی سگریٹ کا استعمال جسم کی درستگی اور اصلاح (تحلیل ریاح اور دفع قبض) کے طور پر ہے تو اس چیز کو کیونکر حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔

اور فقہ کی بعض کتابوں میں بیڑی سگریٹ نوشی اور حقہ کشی کے حرام ہونے پر فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (انتظار کر اس دن کا کہ لائے آسمان صریح دھواں) والی آیت کریمہ سے استدلال کیا گیا ہے کہ دھواں، عذاب کا آلہ ہے، اور عذاب کے آلہ کا استعمال درست نہیں! اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ صغریٰ اور کبریٰ دونوں ممنوع ہیں کیونکہ دھواں جس طرح عذاب کا آلہ ہے اسی طرح تنعیم کا آلہ بھی ہے جیسا کہ عود کے دھویں سے لذت اور راحت حاصل کی جاتی ہے اور حدیث صحیح ہے مجامر کم الالوہ (جنت میں اھل جنت کے لئے تازہ عود انگھیٹوں میں ڈال کر پیش کیا جائے گا) تاکہ اس خوشبودار دھویں سے لطف و انبساط حاصل کریں۔

علاوہ ازیں عذاب کے آلہ کا استعمال مطلقاً ممنوع بھی نہیں کیونکہ قوم نوح کے لئے عذاب کا آلہ پانی تھا، ایسی صورت میں پانی کے استعمال سے متعلق بھی اسی قسم کے استدلال کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

اہلِ سنت و جماعت کے اس اختلافی مسئلہ میں دونوں جانب کے لوگ بحر العلوم لکھنوی، مولانا باقر آگاہ مدراس، مولانا شاہ اسماعیل دہلوی، مولانا سید محمد علی رامپوری اور دیگر رحلت شدہ بزرگوں پر لعن وطعن کرتے ہیں حالانکہ اختلافی مسائل میں ایک ہی جانب کے حق ہونے

کا یقین کر لینا اور دوسرے جانب کے غلط ہونے کا یقین کر لینا ٹھیک نہیں ہے۔اور باہم ایک دوسرے پر عیب نہیں لگانا چاہئے چنانچہ اس کی تفصیل پانچویں مقدمہ میں گر چکی ہے۔

قطع نظر اس بحث وتقریر کے تمبا کو استعمال کرنے میں بہت سارے فوائد ہیں اور یہ چیز سر اور معدہ سے بلغم خارج کر دیتی ہے۔ کرم خوردہ دانتوں اور دانتوں میں درد کو دور کرنے کے لیے مفید ہے۔ اور نزلہ وزکام کے لئے بھی سودمند ہے۔ اور ریاح توڑنے اور قبض دور کرنے کے لئے بھی کارآمد ہے اور اس کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

## فائدہ نمبر ۱۲

## میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اظہار مسّرت کا حُکم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد مبارک پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا بدعت حسنہ ہے اور میلاد کا عمل دنیا بھر کے علماء اور صوفیاء کا معمول رہا ہے۔ علامہ شیخ ابن حجر مکی ہیتمی اپنی کتاب ''نعمة الكبرى على العالم بمولد سيد ولد آدم ''میں لکھتے ہیں۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بدعت ہے کیونکہ اسلام کی ابتدائی تین صدیوں جن کے مبارک ہونے کی شہادت زبان نبوت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، میں سلف صالحین میں سے کسی سے منقول اور ثابت نہیں ہے۔ لیکن یہ بدعت حسنہ اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی کیونکہ یہ چند مستحسن امور پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں فقراء ومساکین کے ساتھ احسان عظیم ہے (مثلاً کھانا تقسیم کرنا اور روپیہ باٹنا) اور قرآن کریم کی تلاوت ہے اور ذکر کی کثرت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا پڑھنا ہے اور آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ والہانہ محبت والفت اور

بے پایاں خوشی ومسرت کا اظہار ہے اوراس عمل میں غیر مسلم طبقہ کواسلام کی جانب دعوت دینے کا موقع بھی ہے۔

ان ہی گونا گوں فوائد و برکات کی وجہ سے زمانہ خیر القرون کے بعد جب سے میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا ظہور ہوا ہے اس وقت سے ساری دنیا کے مسلمان ماہ ربیع الاول میں میلا دشریف کے موقعہ پر مجلسیں آراستہ کرتے آرہے ہیں۔جن میں وسیع پیمانہ پر ضیافت طعام کا اہتمام ہوتا ہے اور صدقات وخیرات اور نیکی وحسن اعانت کا معاملہ رہتا ہے اور قرآن کی تلاوت، ذکراور سیرت طیبہ کا بیان ہوتا ہے اوراس طرح آپ کی ذات اقدس کے ساتھ خوشی ومسرت کا اظہار کیا جا تا ہے۔

علامہ جزری فرماتے ہیں

میلا دالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی فوائد رہیں یا نہ رہیں یہی ایک فائدہ کیا کم ہے کہ اس میں مسلمانوں کے لئے سروراور انبساط ہے اور شیطان لعین کے لئے ذلت و رسوائی ہے۔جب اہلِ صلیب اپنے نبی کی شب ولادت کوعید اکبر قرار دے سکتے ہیں تو اہلِ اسلام بھی اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ بھی اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر (شرعی حدود میں) خوشی ومسرت کا اظہار کریں۔

امام محقق، ولی کامل ابو زرعہ بن عراقی سے دریافت کیا گیا کہ میلا دالنبیؐ کا عمل مستحب ہے یا کراہت اوراس کے متعلق کوئی دلیل موجود ہے؟ یا کسی ایسی شخصیت سے اس فعل کا صدور ثابت ہے جس کی اتباع کی جا سکے؟ توانہوں نے فرمایا، دعوت تو ہر وقت مستحب ہے پھر بھلا ماہ ربیع الاول کی وہ دعوت کیوں مستحب نہ ہوگی جس میں نور نبوت کے ظہور پر اظہار مسرت کا عنصر شامل ہو۔سلف صالحین میں سے کسی سے میلا د کا عمل ثابت نہ ہو تو اس سے میلا د کا بدعت مکروہ ہونا کوئی ضروری نہیں۔کتنی بدعات حسنہ ایسی ہیں جن کے اندر کوئی

برائی اور خرابی نہ ہوتو ان کا اختیار کرنا نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری سمجھا گیا ہے۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب کو خواب میں دیکھا گیا اور اس سے اس کا حال پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ آگ کے شعلوں میں گھرا ہوں مگر جب دوشنبہ کی رات آتی ہے تو عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے اور میں اپنی ان دو انگلیوں سے پانی چوستا ہوں جن سے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشخبری سن کر ثوبیہ کو آزاد کر دیا تھا

علامہ ابن جزری فرماتے ہیں

ابولہب جیسا کافر شخص جس کی مذمت میں قرآنی آیات نازل ہوئیں اور یہ وہ مذمت ہے جس سے بڑھ کر کسی مذمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب اُس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشخبری سنی تو خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور اس اظہارِ خوشی پر اللہ نے اس کو یہ (عذاب میں تخفیف اور انگلیوں سے پانی جاری ہونا) صلہ عطا فرمایا تو ان مسلمانوں پر عنایات ربانی کا کیا عالم ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور آپ ؐ کی محبت و الفت میں حسب استطاعت خرچ کرتے ہیں۔ میری عمر کی قسم! اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسے مسلمانوں کی جزا یہی ہوگی کہ وہ اس کے فضل و کرم سے جنات نعیم میں داخل کیے جائیں گے۔

نویں صدی ہجری کے مجدد اور احادیث نبوی کے حافظ علامہ شیخ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب ''حسن المقصد فی عمل المولد'' میں لکھتے ہیں

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بس یہی ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور لوگوں کی ضیافت کی جاتی ہے اور یہ وہ امور حسنہ ہیں جن کے

انجام دینے والے کو اجر وثواب دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے کوئی کام بھی خلاف شرع نہیں ہے اور ان کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم ہے اور آپ ﷺ کی ولادت باسعات پر خوشی کا اظہار ہے سب سے پہلے جس شخص نے میلا د النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء کی وہ ابن الملک المظفر ابو سعید کوکری بن زین الدین علی بن بکتین ہے، جس کا شمار دنیا کے عظیم بزرگ اور سخی بادشاہوں میں ہوتا ہے اور اس کے متعدد آثار حسنہ موجود ہیں۔ علامہ ساقون میں واقع جامع المظفر بھی اسی بادشاہ کی تعمیر کردہ ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اس کی سیرت وسوانح سے متعلق تحریر کیا ہے کہ یہ بڑا ذہین، شجاع، عاقل اور صاحب علم بادشاہ تھا۔ ماہ ربیع الاول میں بڑے احتشام کے ساتھ مجلس آراستہ کیا کرتا تھا۔

علامہ سیوطی مذکورہ کتاب میں فرماتے ہیں کہ علامہ ابن جوزی نے ''مرأۃ الزماں'' میں لکھا ہے کہ یہ تفصیل ان حضرات کی بیان کردہ ہے جو بذات خود میلا د شریف کی بعض مجالس میں ملک مظفری کے دستر خوان پر موجود رہے۔ اس دستر خوان پر پانچ ہزار بکریوں، دس ہزار مرغ اور ایک سو اونٹوں کا گوشت رکھا گیا تھا۔ اور ایک ہزار دودھ کی ملائی کے کٹورے اور تیس ہزار حلوے کے کٹورے رکھے ہوئے تھے۔ اور بڑے بڑے علماء اور صوفیاء میلا د شریف کی ان مجلسوں میں شرکت کے لئے بادشاہ کے پاس تشریف لاتے تھے اور بادشاہ انہیں ان مجلسوں میں شرکت کی دعوت دیتا اور خلعتوں سے نوازتا تھا۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ کی پہلی جلد میں فرماتے ہیں کہ ثوبیہ ابولہب کی یہ وہ باندی ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر سن کر اپنے آقا ابولہب کو یہ خوشخبری سنائی کہ تمہارے بھائی عبداللہ کے گھر لڑکا تولد ہوا ہے تو یہ خوشخبری سنانے پر ابولہب نے ثوبیہ کو آزاد کر دیا اور اسے حکم دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دودھ کا انتظام کرے۔ ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ابولہب کے اس اظہار خوشی کا صلہ اللہ تعالیٰ

نے اس کو یہ عطا فرمایا کہ دوشنبہ کے روز اس کے عذاب میں تخفیف کی جاتی ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔اس واقعہ کے اندر اہلِ میلاد کے لئے سند ہے کہ وہ ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شب میں خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں اور مستحسن امور، (اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام عام کرنے کے لئے مجالسِ ختم قرآن، ذکر اور درود شریف کی مجالس اور ضیافت طعام وغیرہ) میں اپنا مال خرچ کر سکتے ہیں۔ابولہب ایک کافر شخص جس کی مذمت میں قرآنی آیات نازل ہوئیں۔ جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ پر خوشی کا اظہار کیا اور اپنی باندی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دودھ کے انتظام کرنے کا حکم دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ صلہ (دوشنبہ کے روز عذاب میں تخفیف اور انگلیوں سے پانی جاری ہونا) عطا کیا تو مسلمان جن کے دل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت والفت سے بھرپور ہیں اگر یہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خوشی ومسرت کا اظہار کریں اور اس کارِ خیر میں اپنا مال خرچ کریں تو ان پر اللہ کے انعامات واکرامات کا کیا عالم ہوگا؟

لیکن مسلمانوں کو چاہئے کہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انعقاد میں ناجائز امور مثلاً گانا، بجانا، آلاتِ محرمہ اور منکرات شرعیہ سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں تا کہ یہ چیزیں انہیں اللہ کے فضل وکرم اور اتباع سنت کے فیوض وبرکات سے محروم نہ کردیں۔

مذکورہ دلائل اور براہین سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہوچکی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فخر موجودات سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا بدعت حسنہ ہے۔صرف شیخ تاج الدین فاکہانی مالکی جن کا شمار علمائے متاخرین مالکیہ میں ہوتا ہے نے اپنی کتاب ''المورد فی عمل المولد ''میں میلاد شریف کو مذموم بدعت لکھا ہے۔ ان کے اس موقف کی تردید بطریق احسن علامہ سیوطی نے اپنی کتاب ''حسن المقصد فی عمل المولد' 'میں کردی ہے۔اس مسئلہ میں پیدا شدہ شکوک و

شبہات کا حل مذکورہ کتاب میں دیکھ لیا جائے۔

یہاں یہ مسئلہ بھی جان لیا جائے تو مفید ہوگا کہ بعض علمائے کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ذکر اور بیان کے وقت حاضرین مجلس کے کھڑے ہونے کو مستحسن فعل قرار دیا ہے۔

علامہ شیخ علی ابن برھان الدین حلبی ''سیرت حلبیہ'' میں فرماتے ہیں

لوگوں کی یہ عادت چل پڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بیان میں جب ولادت کا ذکر سنتے ہیں تو آپ ﷺ کی تعظیم وتکریم کے خیال سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ قیام بدعت حسنہ ہے۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ امت کے جلیل القدر متقی و پرہیزگار عالم، ائمہ اور فقہاء کے امام ومقتدا علامہ تقی الدین سبکی شافعی کو میلاد شریف کی مجلس میں ولادت نبوی کے بیان میں آپ کے نام مبارک کے ذکر کے وقت قیام کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اور آپ کے ہم عصر علماء اور صوفیاء نے اس عمل کی اتباع و پیروی کی۔

سید جعفر برزنجی مدنی ''رسالۃ المولد'' میں فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے بیان میں آپ کے نام مبارک کے ذکر کے وقت میں تعظیماً کھڑے ہوجانے کو صاحب روایت و درایت ائمہ کرام نے مستحسن قرار دیا ہے۔ بڑی خوشخبری اور بڑی بشارت ہے اس شخص کے لئے جس کا انتہائی مقصد صرف ذات رسالت آپ ﷺ کی تعظیم وتکریم ہو۔

یوسف بن محمد اھدل فرماتے ہیں کہ تمام باشندگان حرمین شریفین اور وہاں کے علماء وخواص قیام کو پسند فرماتے ہیں اور اس عمل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر تعظیم و تکریم ہے وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔

ان دلائل سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ میلاد و قیام کے مسئلہ میں مولانا ارتضاء

علی خان صفوی، مولانا محمد سعید اسلمی، سند العلماء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا سید محمد علی رام پوری پر نکتہ چینی بے اصل اور لغو ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۱۳

## زیارت موئے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اور آپ کے آثار و متروکات اور آپ کی مساجد اور آپ کی جانب منسوب کنوؤں کی زیارت کرنا مستحب ہے۔

مولانا مخدوم ہاشم سندھی ''حیات القلوب فی زیارۃ المحبوب'' کے چودھویں باب میں تیرھویں فصل میں مولانا رحمت اللہ سندھی اور ملا علی قاری کی عبارت کا ماحصل یہ تحریر کیا ہے کہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب آثار، کنویں اور مساجد کی زیارت کرنا مستحب ہے اور ان اشیاء کا عین ہو یا جہت، کسی ایک کو جان لینا دونوں برابر ہے۔ حنفیوں، شافعیوں، مالکیوں اور حنبلیوں کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ مطلقاً یعنی بغیر کسی قید کے ان اشیاء کی زیارت کرنا مستحب ہے۔ تحصیلِ سعادت و برکت کے خیال سے حضرت ابن عمرؓ اس بات میں کوشاں رہا کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جگہوں میں نماز پڑھی اور جن جگہوں سے سفر شروع کیا اور جن جگہوں میں نزول اور سکونت فرمائی، ان جگہوں میں نماز پڑھے اور سفر شروع کرے اور نزول و سکونت کرے۔

شفاء میں قاضی عیاض تحریر فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اشیاء کو مقدس و برگزیدہ جاننا اور آپ کے اجزاء

کی تعظیم کرنا، اور آپ کے جمیع اماکن ومقامات کی تعظیم کرنا، جن میں آپ نے سکونت فرمائی یا نزول فرمایا اور ہر وہ چیز جس کو آپ کے دستِ مبارک یا پہلو، یا قدم، یا اعضاء میں سے کسی عضو نے مس کیا ہو تو اس کی تعظیم کرنا، گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرنا ہے اور ان چیزوں کے ثبوت کے لئے نقل صحیح ہو یا یہ چیزیں اخبار و آثار کے بغیر لوگوں میں مشہور ہوں تو یہ دونوں برابر ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''شرح سفر السعادۃ'' میں فقیہ تورپشتی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرام کے درمیان اپنے موئے مبارک تقسیم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس چیز کے ذریعہ لوگوں میں برکت باقی رہے۔ اور آپ کی یاد تازہ رہ سکے، نیز اس میں یہ اشارہ بھی پوشیدہ تھا کہ اب زمانۂ صحبت ختم ہونے والا ہے اور سفر آخرت قریب ہے۔

شیخ عبدالحق دہلوی ''اشعۃ اللمعات ترجمۂ مشکوٰۃ'' میں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ناخنوں اور بالوں کو صحابہ کرام کے درمیان تقسیم کرنے کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ہر ایک کو ایک ایک موئے شریف اور دو دو موئے مبارک نصیب ہو جائے چنانچہ شاعر نے اسی قصہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

مرزا زلفِ تو موئے بسند است ۔۔۔ فضولی میکنم بوئے بسند است

مجھے آپ کے زلف مبارک سے موئے یک تار بس ہے۔ میں نے غلط کہا موئے یکتا نہیں بلکہ اس کی بو بھی کافی ہے۔

اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناخنوں کو بھی تراشنے کے بعد حاضرین میں تقسیم کیا ہے اور آج تک امت میں یہ برکات موجود ہیں۔

''مطبوعہ سفینۃ النجاۃ'' کے ۴۲ ویں صفحہ میں جو لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی تعظیم واجب ہے اگر چہ کی یقینی طور پر یہ ثابت نہ ہو کہ یہ آپ ہی کا موئے مبارک ہے اس لئے کہ جب کل کی تعظیم واجب ہے تو اس کے اجزاء کی تعظیم بھی کل کی طرح ہیں اور بتوں، طواغیت، پنجوں، گھوڑوں کے نعل، خچروں، جھنڈوں اوران کے مانند اشیاء کی تعظیم کفر ہے ان کی تعظیم کی تحریم پر موئے مبارک کی تعظیم کو حرام قرار دینا، باطل اور قیاس مع الفارق ہے (قیاس کرنا ایک چیز کا دوسری چیز پر بغیر اس کے کہ ان دونوں چیزوں میں کچھ مناسبت اور مشارکت ہو۔ مترجم)

ان اسناد اور شواہد سے ظاہر ہے کہ نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی تعظیم کرنا واجب ہے اگر چہ کہ اس کا ثبوت یقینی طور پر نہ ہواور موئے مبارک کی زیارت کرنا مستحب ہے جیسا کہ قریباً ذکر کیا گیا۔

اس مسئلہ میں بعض افراد کی افراط وتفریط دیکھنے کے لائق ہے کہ کبھی موئے مبارک کی تعظیم کو عبادت اور مو پرستی کہہ دیتے ہیں حالانکہ تعظیم الگ چیز ہے اور عبادت الگ چیز ہے جیسا کہ تفسیر کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اگر تعظیم اور عبادت دونوں ایک ہوتے تو اللہ تعالیٰ شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم نہیں دیتا۔ (شعائر اللہ سے مراد قرآن کریم، پیغمبر، کعبہ اور اولیاء اللہ ہے۔ اور ہر وہ چیز بھی شعائر اللہ میں داخل ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو۔ چنانچہ یہی مفہوم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے الطاف القدس میں بیان کیا ہے۔ ترجمہ حاشیہ فصل الخطاب)

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب (جس شخص نے شعائر اللہ کی تعظیم کی تو پس یہ تعظیم دلوں کے تقوی سے تعلق رکھنے والی ہے (شریعت کے حدود کی حفاظت اور ان کے دائرہ میں رہنا تقوی ہے۔ کذا فی الطاف القدس۔ ترجمہ حاشیہ فصل الخطاب)

اور علمائے متاخرین قرآنِ کریم کی تعظیم کے لئے قیام کو مستحب نہیں قرار دیتے جیسا کہ علامہ سیوطی نے اتقان میں تحریر کیا ہے اور نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کے بیان ولادت اور آپ کے نام مبارک کے ذکر کے وقت قیام کو علماء مستحسن قرار نہیں دیتے چنانچہ اس کی تفصیل بارہویں فائدہ میں پیش کی گئی ہے۔

تعظیم اور عبادت میں فرق نہ ہوتا تو مولانا شاہ اسماعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے پہلے باب میں منعم اور اہلِ کمال کی تعظیم کو طریقِ نبوت کے اسباب میں نہیں لکھتے اور شعائر کی تعظیم اور منعم کی محبت کا، نیز شمار نہیں کرتے۔ ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ منعم کی محبت اور اس کی تعظیم اور منعم کے محبت کی جہت کو اس کے ماسوا تمام اشیاء پر ترجیح طریق نبوت کے عمدہ اسباب میں سے ایک سبب ہے اور اس کے شعائر کی تعظیم بھی منعم کی محبت کا جز و اور حصہ ہے اور شعائر سے مراد وہ امور ہیں جو منعم کے ساتھ کوئی خاص مناسبت رکھتے ہوں اور وہ اس حیثیت سے واقف ہوگا تو ان امور کی وجہ سے اس کا ذہن منعم کی جانب سے منتقل ہو جائے گا۔ مثلاً اس کے نام اور اس کی بات چیت اور اس کے لباس اور اس کے ہتھیار کی تعظیم سے ذہن اس کی طرف مائل ہو جائے گا حتیٰ کہ اس کی سواری اور اس کے مسکن سے بھی۔ چنانچہ جس کسی شخص کو ان امور کا تجربہ ہو۔ اور اس کو بڑے بڑے حقوق شناس امراء بلکہ تمام مصاحبین کے ساتھ صحبت وانسیت رہی ہو۔ اور ان امراء و مصاحبین کو حکم شاہی اور تخت شاہی کی تعظیم کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی (کہ شعائر کی تعظیم بھی منعم کی محبت کا جز و ہے)

جب منعم کے شعائر کی تعظیم کمال درجہ کو پہنچتی ہے تو ہر اس چیز کی تعظیم کا سبب بن جاتی ہے جو منعم کی محبت اور اس کے احسانات پر شکر کے جذبات کو پیدا کرنے کی مؤید ہوگی۔ مثلاً اس شخص کی تعظیم کرنا جو منعم کے احسانات کے بدلہ میں دعوت کرتا ہے یا منعم کے محبّ کی تائید و خدمت گذاری کرتا ہے یا منعم کے احسانات کا اظہار و بیان کرتا ہے۔

جب تعظیم کا یہ مرتبہ قوی ہو جاتا ہے تو اس میں افراط اور غلو پیدا ہوتا ہے اور ایسے امور کی تعظیم کا باعث بن جاتا ہے جو منعم کی تعظیم اور اس کی خدمت گذاری میں محبّ سے ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ایسے افعال و اقوال کی تعظیم جو محبّ نے منعم کے احسانات کے مقابلہ میں بجالایا ہو اور ایسے اموال کی تعظیم جو محبّ نے منعم کی رضا میں خرچ کئے ہو۔

کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ چیز اپنے افعال اور اقوال میں عجب اور خود بینی اور اپنے اموال کے خرچ میں غرور کے قبیل سے ہے کیونکہ ان اقوال افعال اور اموال کے دو جہت ہیں۔ ایک محبّ کے ملابسات اور کمالات سے متعلق ہے اور دوسرا منعم کے شعائر سے متعلق ہے اور منعم کی تعظیم دوسرے جہت سے ہے نہ کہ پہلے جہت سے اور یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے دلیل اور حجت کی چنداں ضرورت نہیں اور یہ اس قدر ظہور میں آچکی ہے کہ اس کی وضاحت کی حاجت نہیں ہے۔

جب شعائر اللہ کی تعظیم اور منعم کے متعلقات کی تعظیم یہ حکم رکھتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جزو اور موئے مبارک کی تعظیم کا حکم کیا ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا (میرے گلستان ہی سے میری بہار کا اندازہ کرلو)

جریر بن عبدالحمید قاضی شہر مدینہ منورہ نے امام مالک سے اس حال میں حدیث نبوی دریافت کیا کہ وہ کھڑے ہوئے تھے۔ امام مالک نے حکم دیا کہ انہیں قید کیا جائے۔ لوگوں نے کہا۔ یہ قاضی شہر ہیں۔ فرمایا۔ قاضی اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی تادیب کی جائے۔

ہشام بن عمار نے امام مالک سے حدیث پوچھی اور وہ کھڑے ہوئے تھے حکم دیا کہ ہشام کو بیس کوڑے لگائے جائیں جیسا کہ مدارج النبوۃ کے نویں باب میں مرقوم ہے۔

ایک روز امرا انگلش میں ایک امیر نے توراۃ و انجیل پر قدم رکھا اور کہنے لگا کہ یہ

کتابیں آدمی کے ہاتھ کا عمل ہے۔ان کی تعظیم نامعقول ہے میں نے کہا۔فوج کا جھنڈا اور بادشاہ کا فرمان بھی تو آدمی کے ہاتھ کا عمل ہے پھران کی تعظیم کیوں معقول ہے؟ اور بادشاہ وزیراورارباب مناصب کی تصویریں اوران کے نام بھی تو آدمی کے ہاتھ کا عمل ہے۔پھر بھلا ان چیزوں کوقدموں تلے روندنے اور جوتی سے مارنے پر کسی آدمی کوسزا کا مستحق کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

بعض اہلِ علم کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے کبھی غیر یقینی موئے مبارک کی زیارت کرنے کوناجائز خیال کرتے ہیں حالانکہ موئے مبارک کی زیارت کے لئے یقین کی ضرورت نہیں چنانچہ اس کی تفصیل ابھی گذر چکی۔لیکن اس کے باوجودشریعت مطہرہ میں ان احکام پر عمل کا حکم دیا گیا ہےاورمیراث حاصل کی جارہی ہے۔

تعجب تو یہ ہے کہ کوتاہ نظراشخاص عدم یقین کے باوجوداجتہادی احکام پرعمل کررہے ہیں اورمیراث حاصل کررہے ہیں لیکن غیر یقین موئے مبارک کی زیارت کوناجائز کہہ رہے ہیں اورکبھی موئے مبارک کی زیارت کوصریح گمراہی کہہ رہے ہیں حالانکہ یہ مستحب ہے۔

علاوہ ازیں اس افراط وتفریط کے ساتھ ہردو جانب کے طاعن اشخاص بحرالعلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی سیدواعظ اورتمام زائرین کوموپرست کہہ رہے ہیں اوران کے ساتھ بےادبی اور گستاخی کرنے میں قاصرنہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۱۴)

# تذکرۂ مناقب و فضائل صلحاء و اتقیاء اور ترجمۂ سیر و شمائلِ انبیاء و اولیاء

بزرگانِ دین کے شمائل و فضائل کے تذکرے میں بہت فوائد ہیں۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ بزرگوں کے تذکرے سے دل راحت وسکون پاتا ہے اور قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وکلا نقص علیک من انباء الرسل مانثبت به فوادك یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ہم آپ کو گذرے ہوئے پیغمبروں کے قصے سناتے ہیں تاکہ آپ کے دل کو سکون ملے اور وہ قوی ہو جائے۔

حضرت جنید بغدادی سے پوچھا گیا کہ بزرگوں کی حکایات اور روایات پڑھنے اور سننے سے کیا فائدہ ہے؟ تو فرمایا۔ ان کی بات اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔ اگر کسی آدمی کا دل شکستہ ہے تو ان کی باتوں اور قصوں سے قوی اور مضبوط ہو جاتا ہے اور ان سے نصرت ومدد پاتا ہے۔ چنانچہ اس کی واضح دلیل قرآن کریم کی یہ آیت طیبہ ہے وکلا نقص علیک الایة یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کو گذرے ہوئے نبیوں کے قصے سناتے ہیں تاکہ آپ کے دِل کو سکون ملے اور وہ قوی ہو جائے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اہل اللہ کا تذکرہ اور بیان، رحمت الٰہی کے نزول کا سبب ہے جیسا کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة۔ اللہ والوں کے تذکرے کے وقت رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص دسترخوان چنے تو اس سفرہ پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کو اس دسترخوان سے بے فائدہ نہ رکھا جائے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ (امام ربانی کے مشائخ کے مرشد) حضرت ابو علی دقاقؒ سے پوچھا گیا کہ اہل اللہ کی روایات وحکایات اور واقعات سننے سے کیا فائدہ ہے جب کہ ان کی باتوں پر عمل نہ کیا جائے۔ فرمایا۔ ہاں! اس میں دو فائدے ہیں اول یہ کہ آدمی اگر طالب ہے تو اہل اللہ کی باتوں کو سن کر اس کی ہمت قوی ہو جاتی ہے اور اس کی طلب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ آدمی اگر متکبر اور مغرور ہے تو اس کا غرور اور تکبر ختم ہو جاتا ہے اور اپنے دل ودماغ سے کبر ونخوت کو نکال دیتا ہے اور اب تک اپنے آپ کو جو نیک اور اعلیٰ سمجھ رہا تھا اس کے برعکس خود کو برا اور ادنیٰ تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس کے اندر عقل وشعور اور بصیرت موجود ہے تو اپنی حالت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ حضرت ابن محفوظ فرماتے ہیں کہ اخلاق اور اعمال کو اپنے معیار سے نہ دیکھیں بلکہ اہل اللہ کے اخلاق اور اعمال کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں تا کہ تم ان کے فضل وکمال اور اپنے افلاس اور تہی دامنی کو پہچان سکو۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف ہمدانی سے پوچھا گیا کہ جب یہ عہد اور یہ طائفہ تاریخ کا حصہ بن جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے جس سے ہم سلامت رہ سکیں؟ فرمایا روزانہ ان بزرگوں کے ملفوظات اور سیرت وسوانح کا کچھ حصہ مطالعہ کرتے رہیں۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی باتیں بہترین باتیں ہیں۔ جو قرآن وحدیث کی تفسیر ہیں اور ان کے ارشادات کو پڑھنے سے دنیا کی محبت وفریفتگی کا جذبہ دل سے سرد پڑ جاتا ہے اور آخرت کی یاد اور شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت والفت پیدا ہوتی ہے اور زادِ آخرت کی تیاری میں انہماک پیدا ہوتا ہے۔

چھٹا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کے دوستوں کی تعریف وتوصیف اور ستائش سے ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اللہ کے دوستوں میں سے کوئی دوست خوش ہو جائے اور ستائش کنندہ کی قبر کی تنگی کو وسعت سے بدل دے۔ حضرت یحییٰ ابن معاذ جو شہر ہرات کے امام اور شیخ عبداللہ انصاری

کے استاد محترم تھے۔انہوں نے وفات پائی تو ان کو خواب میں دیکھا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ فرمایا: اللہ نے کہا اے یحیٰ، میں تمہارے ساتھ بہت ہی سخت اور دشوار معاملہ کرنے والا تھا۔لیکن ایک روز تم مجلس میں ہماری حمد و ستائش کر رہے تھے کہ ہمارے دوستوں میں سے ایک دوست کا گذر اس جگہ سے ہوا اور وہ تمہارے اس فعل سے مسرور ہوئے۔ان کے اس مسرور ہونے کی وجہ سے تمہیں بخش دیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو تم دیکھ لیتے کہ تمہارے ساتھ کس قدر سخت معاملہ کیا گیا ہوتا۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے خلاف کوئی سخت اور سست بات کہہ دے تو تم اس کے ساتھ کینہ رکھتے ہو اور غیض و غضب سے مغلوب ہو کر اس کا خون تک بہانے کی سعی و کوشش کرتے ہو، جب تمہارے نفس میں ایک سخن باطل کے اثر کا یہ عالم ہے تو سخن حق کی تاثیر کا عالم کیا ہوگا، بھلے سے تم سخن حق کی اثر آفرینی سے نا آشنا رہو۔

امام عبدالرحمٰن اسکاف سے پوچھا گیا کہ ایک شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا پڑھ رہا ہے تو کیا ایسی صورت میں تلاوت کا اثر اس کی ذات پر ہوسکتا ہے؟ آپ نے جواب دیا! کہ ایک شخص دوا کھا رہا ہے اور وہ اس کے خواص و فوائد سے نہیں جانتا ہے لیکن دوا کا اثر اس کی ذات پر ہو جاتا ہے تو پھر بھلا اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کا اثر پڑھنے والے کی ذات پر کیسے نہیں ہوسکتا۔ہاں! اگر وہ قرآن کریم کی معانی اور مطالب کو سمجھتے ہوئے تلاوت کر رہا ہے تو اس کے قلب و ذہن پر بہت اثر ہوگا۔

آٹھواں فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دور ہے جس میں اشرار الناس نے اخیار الناس کو فراموش کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نیک لوگوں کے تذکرہ کی وجہ سے نیکیوں سے تہی دامن اشرار الناس، صالحین کی فراموش نہ کریں۔اور گوشہ گیر و خلوت نشین بزرگوں کی تلاش میں لگ جائیں اور ان کی جانب مائل ہوں اور ان کی نیک صحبتوں میں ابدی سعادت سے مشرف

ہو جائیں۔

نواں فائدہ یہ ہے کہ یہ وہ دور ہے جس میں مدعیان تصوف، اہل معانی اور اصحاب باطن کے لبادہ میں نمودار ہیں اور اہل دل حضرات کبریت احمر (اکسیر و کیمیا) کی طرح نایاب اور کم یاب ہیں۔

ایسے ماحول میں اہل اللہ کا تذکرہ بہت غنیمت ہے۔ سید الطائفہ جنید بغدادی نے حضرت شبلی سے کہا، اگر سارے جہاں میں ایک آدمی بھی تمہیں اس معاملہ میں ہم مشرب اور ہم مذاق مل جائے تو اس کی صحبت اختیار کرو۔

دسواں فائدہ یہ ہے کہ مدعی تصوف اگر چہ کہ محقق اور کامل نہ ہو لیکن جب اس نے ایک مرتبہ اپنے آپ کو اہل اللہ کے ساتھ مشابہ اور مماثل کر دیا تو اس تشابہ کی برکت سے وہ بھی ان ہی میں شمار کیا جائے گا۔ چنانچہ زبان نبوت نے ارشاد فرمایا۔ من تشبہ بقوم فھو منھم جس شخص نے بھی کسی جماعت کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی تو اس کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوگا۔

سید الطائفہ جنید بغدادی فرماتے ہیں مدعیان تصوف کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو کامل اور محقق کے مشابہ بتاتے ہیں اور ان کے پاؤں کو چوم لو کہ یہ بلند ہمت کے مالک ہیں اگر ہمت بلند نہ رکھتے تو کسی دوسری حقیر چیز کا دعوٰی کرتے۔

گیارھواں فائدہ یہ ہے کہ اُمید ہے کہ قیامت کے روز اہل اللہ کی ستائش کرنے والے شخص کی شفاعت کی جائے گی۔ جو سگِ اصحابِ کہف کی طرح چند قدم بھی اہل اللہ کے نقشِ قدم پر چلا ہو۔ اس کا معاملہ بھی اہل اللہ کے معاملہ کی طرح ہوگا اور جو شخص اہل اللہ کی محبت و دوستی کا دعوٰی کرتا ہو اور اپنی ذات کو ان سے منسلک رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و ھدایات میں مشغول رہتا ہو۔ اور ان کی تبلیغ لوگوں کے درمیان کرتا ہو تو امید ہے کہ اہل اللہ

کی طرح اس پر بھی انعامات ربانی کی بارش ہوگی۔

بارہواں فائدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا المرء مع من احبه۔ آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ وہ محبت رکھتا ہے۔لہذا اہل اللہ سے محبت و دوستی رکھنے والوں کا حشر بھی ان ہی کے ساتھ ہوگا۔اور وہ حریم قرب میں بھی ان کا ساتھی اور مصاحب رہے گا اور اہل اللہ کی محبت و الفت، منعم جہاں کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ایں کار دولت است اکنوں تا کرار سد۔محبت کی دولت کا معاملہ یہ ہے کہ اب پتہ نہیں کہ یہ دولت، کس، کس کو ملے۔

مذکورہ فوائد کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد اہل اللہ کے تذکرے میں موجود ہیں کذافی تذکرۃ الاولیاء۔اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے ساتھ محبت و الفت رکھنے سے یہ فوائد و برکات حاصل ہوتے ہیں تو سرور انبیاء و سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت اور الفت و عقیدت کی وجہ سے برکات و فیوضات اور انعامات و اکرامات کا عالم کیا ہوگا۔

مصطفیٰ اندر میاں آنگہ کسے گوید زعقل　　　آفتاب اندر جہاں آنگہ کسے جوید سُہا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات لوگوں کے درمیان موجود ہوں تو پھر عقل کو کون پوچھے گا۔آفتاب ساری کائنات کو منور کر رہا ہو تو پھر سہا نامی چھوٹے سے ستارہ کی تلاش کسے ہوگی۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "قصیدہ اطیب النعم فی مدح سید العرب والعجم" میں لکھتے ہیں کہ سید المرسلین خاتم النبین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف بیان کرنا آپ کے فضائل و مناقب کا اظہار کرنا اور آپ کی نبوت کے دلائل و شواہد کا بیان کرنا، بلاشبہ فیوض و برکات اور درجات و مراتب کے حصول کا ذریعہ ہے۔

مولانا باقر آگاہ مدراسی ''ہشت بہشت'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ عقائد اور فرائض کے بعد سیرت نبویؐ اور شمائل نبویؐ کا مطالعہ بہترین عبادت ہے اور نوافل و مستحبات میں سب سے محبوب ترین اور پسندیدہ عمل ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ خوش آوازی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور قصائد و مثنویات میں اولیاء اللہ کے مناقب و محامد بیان کرنا، اور انبیائے کرام و سرورِ انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور شمائل بیان کرنا نہ صرف مباح بلکہ افضل اور احسن ہے کیونکہ خوش آواز میں بڑی عجیب تاثیر ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس جواز کے موانع نہ ہوں جیسے حروف کی تبدیلی اور مقامات نغمہ کی رعایت کا التزام اور کانوں کے طرز پر آواز کی تردید، یا اس کے موافق تالیوں کا بجانا وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان قصائد اور مثنویات کا پڑھنا بھی کسی صحیح اور مفید غرض کے تحت ہو نہ کہ لہو ولعب کے طور پر۔

''صاحب عینی'' کس شخص کی گواہی قبول کی جائے اور کس کی نہ قبول کی جائے۔ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر ایسے اشعار جن میں وعظ و نصیحت اور پند و حکمت ہو تو ان کے پڑھنے اور سننے کو سارے فقہائے کرام نے جائز قرار دیا ہے۔

شیخ ابو نجیب ابوالقاہر سہروردی آداب المرسلین میں لکھتے ہیں

قصائد اور اشعار سے متعلق اسلام کا موقف یہ ہے کہ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ جو کلام خوبیوں اور نیکیوں سے آراستہ ہے وہ اچھا ہے اور جو کلام خامیوں اور برائیوں سے آلودہ ہے تو وہ برا ہے۔

لہذا جس کلام میں حکمتیں اور نصیحتیں ہوں، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں کا ذکر ہو۔ صالحین و عارفین کی تعریف و توصیف ہو اور متقی پرہیزگار لوگوں کی عادات و صفات کا بیان ہو تو ایسے کلام کا پڑھنا اور سننا جائز ہے اور جس کلام میں آثارِ قدیمہ، تاریخی مقامات، عہدوں اور

قوموں کا ذکر ہو تو اس کا پڑھنا اور سننا مباح ہے۔ اور جس کلام میں لغویات وہجویات اور کم ظرفی اور مسخرہ پن کی باتیں ہوں تو اس کا پڑھنا اور سننا حرام ہے۔

حضرت کعب بن زہیر نے قصیدہ بانت سعاد نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ کر سنایا تو آپؐ نے بخوشی سماعت فرمایا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شعر پڑھنا اور سننا جائز ہے اور یہ واقعہ بہت ہی مشہور ومعروف ہے اور معارج، مدارج، شواہد اور سیرت کی دیگر کتابوں میں مسطور ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج'' میں لکھتے ہیں کہ عمرۃ القضا میں عبداللہ بن رواحہ جن کا شمار اسلامی شعراء اور مخلص ترین صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے رجزیہ شعر پڑھنے لگے تو حضرت عمرؓ نے انہیں منع کرنا چاہا۔ نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ سے کہا کہ انہیں منع نہ کرو! یہ اشعار کافروں کے دلوں میں تیر کی طرح اثر کر رہے ہیں۔

نیز ''مدارج'' میں لکھتے ہیں کہ بارگاہِ نبویصلی اللہ علیہ وسلم کے شعراء، جو اپنے کلام کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو کافروں کے شر سے محفوظ رکھتے تھے اور اپنے اشعار کے ذریعہ ان کا دندانِ شکن جواب دیتے تھے اور نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے اور کفار کی ہجو کیا کرتے تھے، ان میں تین حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم۔

''روضۃ الاحباب'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ بارگاہِ نبویؐ کے شعراء کرام کی تعداد مردوں میں ایک سوتھی اور خواتین میں بارہ تھی۔

مرزا مظہر جان جاناں اپنے تیرھویں مکتوب میں لکھتے ہیں کہ۔

جو شخص محل فتنہ نہ ہو جیسے عورت اور امرد، تو کلام موزوں، موزوں الحان کے ساتھ کسی

مانع شرعی کی مداخلت اور آمیزش کے بغیر پڑھے، اور اس کی مسحور کن آواز سے سامعین کے دلوں میں کسی برائی کی تحریک نہ ہوتی ہو بلکہ کیف وسرور اور لطف وانبساط یا حزن وغم کی کیفیت پیدا ہوتی ہو تو ایسا کلام سننا بلاشک وشبہ مباح ہے۔ کیونکہ یہ فعل دو مباح امر ( کلام موزوں، آواز موزوں ) سے مرکب ہوگا لہذا ایسی صورت میں اس کو ناجائز کیونکر کہا جا سکتا ہے؟

نیز اسلام کی اول صدی میں بھی جائز ومباح تقریبات مثلاً نکاح اور اکابرین کی آمد کے موقعہ پر شعر خوانی کا معمول تھا اور کبھی کبھی امت کے جلیل القدر اور صالح علمائے کرام سے بھی اس کا صدور ہوا ہے۔ جیسا کہ احادیث کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

لیکن یہاں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ بزرگانِ کرام سے یہ عمل اتفاقی طور پر صدور پذیر ہوا ہے نہ کہ التزام اور استمرار کے طور پر۔

ان اسناد سے واضح ہے کہ بزرگان کرام کے منظوم شمائل وفضائل کو جو خوش آوازی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اگر وہ جواز کے موانع سے خالی ہو تو اس کا پڑھنا اور سننا جائز اور مباح ہے۔ لیکن بعض کوتاہ نظر لوگ اسی چیز کو بھی بدعت ضلالت کہہ دیتے ہیں اور پڑھنے والوں اور سننے والوں پر لعن وطعن اور تشنیع کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر(۱۵)

# عورتوں کے حسن و جمال اور ان کے خط و خال کا تذکرہ

غیر متعین عورت اور وفات یافتہ متعین عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ کرنا جائز ہے البتہ کسی متعین زندہ عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ کرنا مکروہ ہے۔

کس شخص کی شہادت قبول کی جائے اور کس کی نہ قبول کی جائے۔ اس مسئلہ میں ''صاحب عینی'' فرماتے ہیں کہ عورت متعین رحلت شدہ ہو یا زندہ عورت، غیر متعین ہو تو اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ کسی متعین و مخصوص اور زندہ عورت کا تذکرہ کرنا مکروہ ہے۔

بعض لوگ زنِ زندہ و مردہ، متعین اور غیر متعین عورت کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے۔ اور عورتوں کے تذکرہ کو مطلقاً ناجائز خیال کرتے ہیں اور بزرگانِ جلیل القدر پر لعن و طعن کرتے ہیں حالانکہ کسی غیر مخصوص زندہ عورت کا تذکرہ اور ایک رحلت شدہ مخصوص اور غیر مخصوص عورت کا تذکرہ کرنا جائز ہے۔

اس افراط و تفریط کے ساتھ عجیب بات یہ ہے کہ نامور محقق علامہ جامی علیہ الرحمۃ کو بے ادب کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب ''یوسف زلیخا'' میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ حضرت زلیخا علیہا السلام کے حسن و جمال کا تذکرہ کیا ہے اور ایک نبی کی زوجیت کا پاس و لحاظ نہیں کیا ہے۔

اس طرح سوچنے والے اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیویوں کے کفر کا تذکرہ بے ادبی نہیں ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کے حسن و جمال کے تذکرہ کو بے ادبی پر کیوں محمول کیا جائے۔

# فائدہ نمبر (۱۶)

# داعیانِ حق اور دعوت الی اللہ کے مراتب

دعوت سے مراد لوگوں کو خیر و بھلائی اور نیکی کی طرف بلانا اور انہیں شر و برائی اور گناہ سے روکنا ہے۔ اور یہ امر معروف اور نہی منکر فرض کفایہ ہے۔ اس کام کو ایک مسلمان بھی انجام دے تو دوسرے مسلمانوں کی جانب سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ ''آداب الصالحین'' میں مذکور ہے۔

امر اور نہی کی چار قسمیں ہیں۔ واجب، مندوب، مکروہ اور حرام

امر معروف اور نہی منکر اُس شخص کے لئے واجب ہے جس کا قول، فعل اور حکم کسی فتنہ و فساد اور انتشار کے بغیر نافذ ہو سکتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے مستحسن ہے جس کا حکم نافذ تو ہو سکتا ہے لیکن اس کی تاثیر میں گمان ہے۔ اور اُس شخص کے لئے مکروہ ہے جو یہ خیال کرتا ہو کہ اس کا حکم دینا بے سود ہو گا اور وہ عدمِ قبولیت کی صورت میں ذلیل اور خوار ہو جائے گا اور اُس شخص کے لئے حرام ہے جس کے حکم سے فتنہ و فساد اور خلفشار پیدا ہو گا اور مزید نا قابل تدارک گمراہی و ضلالت کا ذریعہ بن جائے گا جیسا کہ ''سفینہ'' میں مرقوم ہے۔

داعیوں اور دعوت کے درجات و مراتب متفرق اور متفاوت ہیں۔ چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات کی جلد دوم کے ۵۷ ویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کے درجات ہیں اور داعیوں اور مبلغوں کے درجات بھی متفرق ہیں۔ علمائے کرام تبلیغ ظاہر کا کام کرتے ہیں اور صوفیائے کرام اصلاح باطن اور تطہیر قلب کا کام کرتے ہیں۔ جو علمائے کرام صوفیاء بھی ہوں تو یہ حضراتِ کرام کبریت احمر (اکسیر و کیمیا) کی طرح ہیں اور یہی جماعت، دعوت کے شایانِ شان ہے اور ظاہر و باطن کی تبلیغ کی سزاوار ہے

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث اور نائب ہے۔ العلماء ورثۃ الانبیاء

حضرات محدثین کرام جو احادیث نبویؐ کی تبلیغ کا کام انجام دے رہے ہیں ان کے تعلق سے ایک طائفہ کی رائے ہے کہ یہ حضرات اس امت میں افضل ہیں۔ ان حضرات کو اگر مطلقاً افضل قرار دیا جائے تو یہ رائے مناقشہ اور خلش کا بیش خیمہ ہوگی اور اگر مبلغین ظاہر کے مقابلہ میں انہیں افضل قرار دیا جائے تو یہ رائے مبنی بر صحت ہونے کی گنجائش ہے۔ مطلق فضیلت تو ظاہر اور باطن کے جامع داعیوں اور مبلغوں کے ساتھ مخصوص ہے، جو تبلیغ ظاہر اور تبلیغ باطن کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اور دونوں کی دعوت دیتے ہیں۔ اور تعلیم و تزکیہ سے وابستہ ہیں۔

لہٰذا ان دونوں شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ میں بھی کمی، نقص کے مترادف ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نقص مطلق فضیلت کے منافی ہے۔ ہر چند کہ ظاہر بہت عمدہ، کثیر البرکات، عمومی افادیت اور نجات کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کا کمال، باطن کے ساتھ مربوط اور منسلک ہے۔ ظاہر، باطن کے بغیر نامکمل اور ادھورا ہے اور باطن، ظاہر کے بغیر ناقابل التفات اور انجام بد کا موجب ہے۔ اور جو علماء، باطن کو ظاہر کے ساتھ جمع کرلیں وہی اکسیر اور کیمیا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا انک علیٰ کل شئی قدیر.

اے ہمارے رب کریم، پوری فرمادے ہم کو ہماری روشنی۔ اور ہم کو معاف فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ دعوت لسانی ہے یا قلمی ہے، دعوت لسانی کا کام تو ہر مبتدی اور متعلم جو کسی دینی درسگاہ میں ہے۔ اور ہر فقیر جو کسی خانقاہ میں ہے بلکہ ہر مسلمان جو کسی مسجد میں آمد و رفت رکھتا ہے، اپنی وسعت کے مطابق انجام دے رہا ہے لیکن دعوت قلمی کا کام انجام دینا انتہائی مشکل ہے۔ اسی لئے جلیل القدر علماء اور صوفیاء نے دینی علوم کی

حفاظت اور امور دین کے انتظام کے خیال سے دعوت قلمی کے فریضہ کو انجام دینے میں غیر معمولی اہتمام کیا تا کہ ان کے علوم وعوارف صدیاں گذرنے کے بعد بھی محفوظ رہ سکیں اور زمانے کے لوگ ان سے مکمل استفادہ کر سکیں۔لیکن اس کے باوجود یہ حضرات اپنی وسعت و طاقت کی حد تک دعوتِ لسانی میں بھی مشغول ومنہمک رہے۔ ہاں! البتہ یہ حضرات منبر آرا نہیں تھے۔ دونوں جماعت کے منبر آراء حضرات ،امر معروف اور نہی منکر کو منبر آرائی میں محصور محدود خیال کرتے ہیں۔اور بحر العلوم عبد العلی لکھنوی ثم المدراسی ،مولانا مولوی محمد باقر آگاہ مدراسی ،مولانا مولوی ارتضاء علی خان وغیرہ اور امام ربانی مجدد الف ثانی ،مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا مولوی سید ماجد وغیرہ حضرات کرام کو وعظ وتقریر ترک کرنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ایسے طاعن لوگوں سے منہ نہ لگانا چاہئے اور ان کی طعنہ زنی کسی مجنون کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ احیاء علوم الدین میں ربع مہلکات میں ایسے ہی منبر آراء خطیب اور واعظ کی سرزنش وملامت میں رقم طراز ہیں۔

وعظ وتقریر کے لئے ایسے اشخاص کو منبر سونپ دیا گیا ہے۔جن کے اندر خوفِ خدا کا فقدان ہے اور دین میں ان کی بصیرت مفقود ہے اور دنیا میں ان کی رغبت حد درجہ ہے اور ان کے اندر لوگوں کو اپنا متبع و پیروکار بنانے کی حرص ہے اور ان کے اندر تعصب وطرفداری کا مرض ہے اور اسی تعصب وطرف داری ،تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی کے باعث قیادت وسیادت کا منصب حاصل نہ کر سکے اور اس تعصب کو اپنے دلوں میں مستحسن سمجھ بیٹھے اور شیطان کے مکر وفریب سے آگاہ اور متنبہ نہ ہو سکے بلکہ اپنے مکر وفریب کی تنفیذ میں شیطان کے نائب بن گئے اور عوام الناس نے اس مکر وفریب پر مداومت اختیار کر لی اور اپنے دین کے ضروری امور واحکام کو طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا۔ان واعظوں اور خطیبوں نے نہ صرف خود کو ہلاک کیا بلکہ

عوام کو بھی ہلاکت کے بھنور میں جھونک دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہماری توبہ قبول فرمائے۔

شیخ فریدالدین عطار نے ''تذکرۃ الاولیاء'' میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، بصرہ تشریف لائے اور اونٹ کی نکیل کمر پر باندھے ہوئے اور تین روز سے زیادہ قیام نہیں کیا کہ ماحول کا مکمل جائزہ لے لیا اور منبروں کو توڑنے کا حکم دیا جن کے ذریعہ یہ بے علم و عمل خطیب اور واعظ لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے اور تمام واعظوں اور خطیبوں کو وعظ و خطابت سے روک دیا۔ اور حضرت حسن بصریؒ کی مجلس میں تشریف لے گئے اور ان سے سوال کیا کہ کیا آپ عالم ہیں یا متعلم؟ عرض کیا کہ میں نہ عالم ہوں نہ متعلم بلکہ جس شخص سے بھی نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مجھ تک پہنچی ہے اس کو بتا دیتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے انہیں تقریر اور تدریس سے منع نہیں کیا اور یہ فرماتے ہوئے بصرہ سے رخصت ہو گئے کہ یہ نوجوان شائستہ سخن کا مالک ہے۔ اور تقریر و خطابت اور درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینے کا مستحق ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

## فائدہ نمبر (۱۷)

## قبر پر عمارت اور گنبد کی تعمیر کے احکام

قبر پر عمارت کی تعمیر کے جوار اور عدم جواز کے مسئلہ میں فقہائے احناف کے درمیان اختلاف ہے۔ اور مختار موقف یہ ہے کہ عمارت بنانے میں کوئی حرج نہیں۔ صاحب تنویرالابصار فرماتے ہیں، قبر کے اوپر عمارت نہیں بنانا چاہئے۔ مختار مسلک یہ ہے کہ تعمیر میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور صاحب الدرّ المختار شرح تنویر الابصار بھی یہی فرماتے ہیں جیسا کہ ''کراھیۃ السراجیۃ'' میں مرقوم ہے۔

طحطاوی کے حاشیہ الدرّ میں مرقوم ہے (لاباس بہ، قبر پر عمارت اور گنبد کی تعمیر میں کوئی مضائقہ نہیں) جواز کا پہلو اس شرط اور قید کا متقاضی ہے کہ عمارت اور گنبد وغیرہ کی تعمیر حلال مال سے ہو اور اس میں زینت ونمائش، فخر ومباحات اور تفاخر کے جذبات نہ ہوں۔ ورنہ اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ موجودہ زمانے میں مزارات کے اوپر سنگِ مَرمَر اور سونے سے ملمع شدہ پتھروں سے عمارات بنا رہے ہیں۔ یہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''شرح سفر السعادۃ'' میں فرماتے ہیں کہ مصنف علیہ الرحمہ نے جو تحریر کیا ہے کہ مزارات پر عمارت نہیں بنانی چاہئے۔ یہ صحیح اور درست ہے اور اس باب میں صحیح احادیث وارد ہیں۔ نبی کریم ﷺ خلفائے راشدین اور حضرات صحابہ کرام کے زمانے میں یہی طریقہ تھا۔ اس کے بعد ہی مزارات پر یہ سارے تکلفات پیدا ہو گئے اور ان کے اندر مفاخرت اور مباہات نے راہ پائی اور آخر زمانے میں عوام کی کوتاہ اندیشی کے باعث اولیاء اللہ کی مزارات پر عمارت اور گنبد وغیرہ کی تعمیر وترویج میں ظاہراً کچھ مصلحتیں دیکھتے ہوئے چند چیزیں بڑھادی گئیں تاکہ اس جگہ سے مسلمانوں کی شان وشوکت اور اولیاء اللہ کی عظمت وبزرگی نمایاں ہو سکے اور بالخصوص ہندوستان کے اندر (دین کے دشمن کفار ہنود کی کثرت ہے) ان مقامات کی شان وشوکت کی عظمت وبلندی اور ترویج سے مسلمانوں کا رعب ودبدبہ پیدا ہو سکتا ہے اور دین حنیف کی جانب کفار وہنود کے رجحان ومیلان کا سبب بن سکتا ہے اور بہت سے اعمال وافعال اور طور طریقے جو سلف کے زمانے میں مکروہات سے تھے۔ آخر زمانے میں مستحسنات بن گئے۔ اگر عوام اور جہلا مزارات کے پاس غیر شرعی افعال کا ارتکاب کریں تو یقین ہے کہ ان امور سے اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی ارواح راضی نہیں ہوں گی۔ اور ان کی دینداری وراستی اور بزرگی وکمال کا دامن داغ دار نہیں ہوگا۔

نیز ''مدارج النبوۃ'' کی پہلی جلد کے اندر نماز جنازہ میں شامل ہونے کی بحث میں

لکھتے ہیں کہ قبر کو بلند اور اونچی نہیں کرنا چاہئے اور اس پر سنگ وخشت سے عمارت نہیں بنانا چاہئے اور قبر کے اوپر عمارت اور گنبد تعمیر نہیں کرانا چاہئے۔ یہ سب بدعت اور مکروہ ہے جیسا کہ ''سفر السعادۃ'' میں مرقوم ہے۔

مطالب المؤمنین میں مرقوم ہے کہ علمائے سلف نے مشہور مشائخ اور علماء کی مزارات پر عمارت تعمیر کرنے کو مباح قرار دیا ہے تا کہ لوگ ان کی زیارت کرسکیں اور اس کے سایہ میں بیٹھ سکیں اور اس میں آرام واستراحت کرسکیں۔

مفاتیح شرح مصابیح سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے شہر بخارا میں مزارات کو دیکھا جن کے اوپر تراشیدہ اینٹوں سے عمارت تعمیر کی گئی ہے اور اسماعیل زاہد جن کا شمار مشاہیر فقہائے کرام میں ہوتا ہے انہوں نے اس چیز کو جائز قرار دیا ہے۔

مولانا عطاء اللہ سمرقندی جو دار الخلافت شاہ جہاں آباد میں مدرس تھے ''رسالہ عثور علی دار السرور'' میں مطالب المومنین کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مشہور علماء ومشائخ کی مزارات کے اوپر عمارت اور گنبد وغیرہ کی تعمیر کو علمائے سلف نے مباح قرار دیا ہے تا کہ لوگ ان کی زیارت سے مشرف ہوسکیں اور اس میں آرام واستراحت کرسکیں۔ عمارت اور گنبد کی تعمیر کے مباح ہونے کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزارِ انور کے اوپر عمارت وگنبد تعمیر کی گئی حالانکہ حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں نہیں تھی۔

اس مسئلہ میں نجدیوں کے غلو اور تشدد کی کوئی حد ہی نہیں رہی کہ جس شہر میں کسی مزار کے اوپر عمارت اور گنبد نظر آئے تو سارے شہر والوں کو کافر کہہ رہے ہیں، مولانا سید علوی حسینی شافعی تریمی'' مصباح الانام'' کی تیرھویں فصل میں فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نجدیوں کو اعتدال کی راہ پر گامزن رہنے کی ہدایت عطا فرمائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جس شہر میں بھی مزار کے اوپر عمارت اور گنبد ہے وہاں کے باشندے کافر ہیں اور وہ

گنبد، بت کی طرح ہے۔ان کے اس موقف سے صدیوں کے مسلمان صالحین، علماء اکابرین سلف وخلف کافر قرار پاتے ہیں اور یہ موقف اجماع فعلی کے خلاف بھی ہے کیونکہ اچھے اور نیک زمانوں میں بھی حضرات انبیاء اور صالحین کی قبروں پر عمارت اور گنبد کی تعمیر کا کام ہوتے آرہا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رشید امام ابن مفلح حنبلی ''الفصول'' میں فرماتے ہیں

قبر کے اوپر گنبد اور احاطہ وغیرہ کی تعمیر اس وقت درست اور مباح قرار دی جاسکتی ہے جب کہ وہ جگہ شخصی ملکیت سے تعلق رکھتی ہو، اور اگر قبر قبرستان میں واقع ہو تو پختہ مزار، گنبد اور احاطہ وغیرہ کی تعمیر مکروہ ہوگی۔ کیونکہ ان کی تعمیرات سے دیگر اموات کی تدفین میں بے ضرورت تنگی واقع ہوجائے گی اور ان چیزوں سے قبرستان کا استعمال ایسے امور میں ہوگا جن کے لئے وہ نہیں بنایا گیا ہے۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر امام احمد بن حنبل کے مذہب کو جاننے والا امام ابن مفلح حنبلی سے بڑھ کر میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا۔

امام ابن مفلح حنبلی کا یہ قول'' فی المسلة بلافائده ''اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ صاحب قبر یقیناً عالم اور ولی نہیں ہے لیکن اس کی زیارت کا قصد کرنا مندوب ہے جیسا کہ حضرات انبیائے کرام کی زیارت کا قصد وارادہ امر مستحسن ہے۔اور زائرین، قبر پر بنی ہوئی عمارت سے گرمی، سردی، ہوا اور بارش سے محفوظ رہنے کے لئے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں اور یقیناً وسائل، مقاصد کے حکم میں ہیں۔ واللہ اعلم۔

نیز مولانا سید علوی حسینی شافعی، مذکورہ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

علامہ ابن حجر مکی نے وضاحت کی ہے کہ غیر قبرستان میں عالم اور ولی کی مزار پر قبہ کی تعمیر مستحسنات میں سے ہے چنانچہ ''التحفہ'' باب الوصیت میں فرماتے ہیں کہ میت نے جو

وصیت کی ہے اگر وہ جہت عامہ سے تعلق رکھتی ہے تو شرط یہ ہے کہ وصیت کسی گناہ اور معصیت میں نہ ہو اور عدم معصیت، مستحسن کو شامل ہے جیسے کافر سے مسجد کی تعمیر کرنا، اور غیر قبرستان میں عالم اور ولی کی قبر پر قبہ وغیرہ کا تعمیر کرنا، علامہ ابن حجر سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اگر یہ چیز غیر عالم کی قبر پر ہو تو کیا یہ جائز ہے؟ انہوں نے جواب دیا اگر احاطہ سے مراد قبر کے اطراف عمارت بنانا ہے گھر کی طرح، یا قبہ وغیرہ کی تعمیر مراد ہے تو یہ کراہت تنزیہی ہے۔

اگر چہ کہ یہ عمارت وغیرہ شخصی ملکیت میں ہی کیوں نہ ہو اور قبرستان میں عالم اور ولی کے مزار کے اوپر قبہ وغیرہ کی تعمیر ممنوع ہے۔

اس موقف پر امام حلبی نے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، علماء اور اولیاء رحمہم اللہ عنہم کی مزارات، مذکورہ ضابطہ سے مستثنٰی ہیں۔ لہذا قبرستان کے اندر بھی ان حضرات کی مزارات پر عمارت اور گنبد کی تعمیر ممنوع نہیں ہے کیونکہ ان کی قبر کھودنا اور اس میں دوسرے کو دفن کرنا حرام ہے اور عمارت و گنبد وغیرہ کی تعمیر ان حضرات کی تعظیم و تکریم کے لئے ہے اور لوگوں کو ان کی زیارت کی دعوت دینے کے لئے ہے۔ لہذا ابن حجر کے قول مذکورہ سے کہیں التباس نہ ہونے پائے۔

علامہ ابن حجر کے موقف پر علامہ طاہر بن حبیب محمد بن ہاشم باعلوی نے بھی ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ قبر کے اوپر صندوق کے مثل کسی چیز کو رکھنا، یا لاش کی حفاظت کے خیال سے کسی چیز کا رکھنا جائز ہے، اور لاش کو کھود کر نکالے جانے کے خوف کی صورت میں تو ایسی چیز کا استعمال کرنا واجب ہے جس کے ذریعہ لاش کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ بات لاش کے بوسیدہ نہ ہونے تک کی مدت کے لئے ہے۔ اور پھر اس کے بعد بناء سے منع کیا جائے گا۔ اس لئے کھود کر نکال لئے جانے کا خوف نہ اب ہے اور نہ آئندہ ہے۔ اور عالم و ولی کی مزار پر صندوق رکھنے والے پر اعتراض کرنا درست نہیں ہے۔ اور یہی بات ''تحفہ'' میں بیان کی گئی

ہے۔اور حنفیوں و مالکیوں کا موقف بھی یہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔لیکن غیر ولی اور ولی کی قبر کے اوپر قبہ کی تعمیر کو حضرت عمرؓ کے اس قول پر محمول کیا جائے جس کو علامہ شربینی نے اقناع میں ذکر کیا ہے۔حضرت عمرؓ نے جب قبر کے اوپر قبہ دیکھا تو فرمایا۔یہ چیز نکال دو۔صاحب قبر کے لئے اس کا عمل ہی اس کے حق میں سایہ دار ہے یعنی کوئی بھی اس کی زیارت کا قصد نہیں کرتا۔ برخلاف نبی ﷺ، عالم، ولی اللہ کے۔اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب شام فتح کیا تو آپ نے حکم نہیں دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر حضرات انبیائے کرام کی مزارات کے اوپر سے قبہ وغیرہ نکال دیا جائے اور ان گنبدوں کو اسی حالت میں برقرار رکھا گیا جو ایک قابلِ غور ولائق تقلید اقدام ہے۔

مذاہبِ اربعہ کے فقہائے کرام کی آراء اور مواقف کی تشریحات سے تم نے اس مسئلہ کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ نجدیوں کی ضلالت اور ان کا بہتان عظیم اور ان کا گنبدوں کو منہدم کرنا اور مزارات کو مٹا دینا اور اصحابِ قبور کی توہین کرنا اور مزارات پر گنبدوں کی وجہ سے انہیں صنم و بت کہہ کر شہر والوں کو کافر قرار دینا، یہ کس قدر تشدد و تعصب دلیل موجود رہنے کے بعد بھی اسے قبول نہ کرنا اور کس قدر انتہا پسند موقف ہے۔اللہ تعالیٰ نجدیوں کو اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال اور توازن و میانہ وری کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر سایہ مطلقاً ممنوع ہوتا تو دنیا بھر کے علماء و فضلاء و اولیاء اللہ اور خود طاعن اشخاص کے مشائخ کرام کی قبروں پر عمارتوں اور گنبدوں کو تعمیر نہیں کیا جاتا تھا اور امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان جن کا شمار حضرات تابعین میں ہوتا ہے ان کی مزار پر تبع تابعین کے زمانے میں گنبد تعمیر نہیں کی جاتی تھی اور حضرات صحابہ کرام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو زیر سایہ نہیں رکھتے تھے۔اس مسئلہ میں طاعن اشخاص کا تعصب اور غلو دیکھنے کے لائق ہے کہ نوبت حضرات صحابہؓ کی تضلیل تک پہنچادئے ہیں بلکہ صحابہ کرام کے اجماع

کے منکر ہوتے جارہے ہیں۔ نجاھم الله تعالیٰ عن التعصب و العناد ھداھم الیٰ سبل اا لرشاد .

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر۱۸

# اھلِ قبلہ کی تکفیر کے احکام

اہلِ قبلہ کو کافر کہنا جائز نہیں ہے اور اہلِ قبلہ سے مراد امتِ محمدیؐ کے تر ہتر فرقے ہیں جن کو امت اجابت کہتے ہیں اور غیر اہلِ قبلہ سے مراد کفار کے فرقے ہیں جن کو امت دعوت کہتے ہیں۔ اور اہلِ قبلہ مومن ہیں اور ان کے مومن ہونے پر اجماع ہے۔ اہلِ ایمان میں نجات پانے والا فرقہ یعنی اہلِ سنت و جماعت اعمال (فاسدہ) کی وجہ سے دوزخ میں داخل کیا جائے گا اور باقی بہتر فرقے اعمال اور اعتقاد (فاسد) کی وجہ سے دوزخ میں داخل کئے جائیں گے لیکن کوئی فرقہ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا جیسا کہ اس کی تفصیل وتشریح، عقائد ملا جلال، میں ملا جلال الدین دوانی نے بیان کی ہے۔

ملا علی قاری ''مسیح الازھر'' میں لکھتے ہیں کہ۔

تکفیر کے مسئلہ میں کفر کے ننانوے احتمال ہوں اور صرف ایک احتمال کفر کی نفی کا موجود ہو تو ایسی صورت میں مفتی اور قاضی کے لئے یہی اولیٰ ہے کہ اس نفی والے احتمال کو اختیار کرتے ہوئے ایک مسلمان کو کافر قرار دینے سے احتراز کرے کیونکہ ایک مسلمان کو فنا کرنے کی غلطی کرنے سے کہیں زیادہ بات سہل ہے کہ ہزار کافروں کو باقی رکھنے کی غلطی کردے۔ مسئلہ تکفیر میں اس بات کی تصریح بھی ہے کہ کلمۂ کفر کہنے والے آدمی کی جانب سے اس کی تاویل قبول کی جائے گی۔ اس قول میں بعض فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ اور یہ تمام

بحث اس وقت ہے جب کہ قائل کی زبان سے عمداً کفر کا کلمہ صادر ہوا ہو۔ اور اگر سہواً ونسیاناً صادر ہوا ہو تو کوئی بحث ہی نہیں کیونکہ یہ قابل عفو ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جو غلطیاں میری امت سے خطاونسیان اور جبر واکراہ کی وجہ سے صادر ہوں گی وہ قابل عفو ہیں۔ اور قاضی خان نے اپنے فتاوٰی میں صراحت کی ہے کہ بے شک جب خاطی (وہ شخص جو اپنے ارادے سے خطا کرے) کی زبان سے کلمۂ کفر صادر ہو تو اس کو خطا ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور اس سے کفر لازم نہیں آئے گا اور اس مسئلہ میں سارے فقہاء کرام کا اتفاق ہے۔

''ینابیع'' میں مرقوم ہے۔

جب کسی مسئلہ میں ایسے متعدد اسباب اور وجوہ پائے جاتے ہوں جن سے تکفیر لازم آتی ہے تو علت بیان کرنا واجب ہے اور صرف ایک ہی وجہ مانع تکفیر ہے تو ایسی صورت میں مفتی پر واجب ہے کہ ایک مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اسی مانع تکفیر وجہ کو اختیار کرے اور اگر قائل کی نیت اس مانع تکفیر وجہ کے ساتھ مطابق ہو تو مفتی کا فتوٰی نفع نہیں دے گا۔ لہذا مفتی کو چاہئے کہ قائل کو کلمۂ کفر سے رجوع کرنے اور توبہ کرنے اور اپنی بیوی کے ساتھ نکاح کی تجدید کرنے کا حکم دے۔

''تتمیمہ'' میں مرقوم ہے کہ

امام ابوحنیفہ النعمان نے فرمایا کلمۂ کفر، کفر نہیں ہے جب تک کہ اس کے ساتھ قلبی اعتقاد موجود نہ ہو۔

''حاشیہ سراجیہ'' اور ''محیط''، اور ''ذخیرۃ'' میں مرقوم ہے کہ۔

مسلمان کافر نہیں ہوگا جب تک کہ وہ کفر کا ارادہ نہ کرے اگر چہ کہ کلمات کفر اس کی زبان سے نکل گئے ہوں۔

خلاصہ میں مرقوم ہے کہ۔

مسئلہ تکفیر میں بنیادی اصول یہ ہے کہ محتمل الفاظ کے ذریعہ کسی شخص کی تکفیر نہ کی جائے کیونکہ کفر، عقوبت کے باب میں آخری درجہ ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں۔ لہذا گناہ کے باب میں بھی آخری درجہ کے گناہ کا متقاضی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محتمل الفاظ کے ساتھ کفر، انتہائی درجہ کا گناہ نہیں ہے۔

''ملتقط'' میں مرقوم ہے کہ۔

جب کسی عالم کے سامنے ایک مسلمان کو کافر قرار دینے کا قضیہ پیش آئے تو اس کو چاہئے کہ اہلِ اسلام کی تکفیر میں جلدی نہ کرے جب تک کہ تلواروں کی چھاؤں میں جبر واکراہ کی وجہ سے کلمات کفر کہنے والے مسلمان کے حق میں اسلام کا ہی فیصلہ کیا جاتا ہے۔

''شیخ الہند عبدالحق محدث دہلوی تکمیل الایمان'' میں فرماتے ہیں کہ۔

ہم اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہیں گے۔ اہلِ قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے قبلہ کی جانب نماز ادا فرماتے ہیں۔ قرآن وحدیث پر عمل کرتے ہیں اور توحید ورسالت محمدیؐ کا اقرار کرتے ہیں تو ان کو کافر نہیں کہنا چاہئے اگرچہ کہ ان کے بعض کلمات سے کفر لازم آرہا ہو لیکن جب تک کہ وہ کلمات کفر کو لازم نہ کرلیں۔ یا کلمات کفر کا لزوم ان کے ساتھ خوب اچھی طرح ظاہر نہ ہو تو ان کی تکفیر نہیں کرنی چاہئے۔ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کے حال کی اصلاح اور توجیہ کرنی چاہئے اور کسی آدمی پر سختی کرنے میں اور کسی کو کافر کہہ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ حدیث شریف ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو کافر کہہ دے اور اگر وہ حقیقت میں کافر نہ ہو تو کہنے والا شخص ہی اسی وقت کافر ہو جائے گا۔

مولانا سید علوی شافعی ''مصباح الانام'' کی پانچویں فصل میں تحریر فرماتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اہلِ سنت و جماعت کا اجماع ہے کہ جاہل اور مخطی (مخطی وہ شخص جو ارادہ نیکی کا کرے اور اچانک اور بے قصد اس سے خطا سرزد ہو جائے، اور خاطی وہ شخص جو

قصداً اپنے ارادے سے خطا کرے۔ مترجم) شخص اگر اعمال کفر وشرک کا مرتکب ہو تو اس کو کافر اور مشرک نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلاشبہ وہ خطاء اور جہل کی وجہ سے معذور ہے یہاں تک کہ اس کے سامنے ایسی دلیل و حجت بیان کی جائے جس کا ترک کرنے والا کافر ہو جاتا ہو۔ وہ دلیل یہ ہے کہ امام وقت یا اس کے نائب کا جاہل اور مخطی کو بلا کر اس طرح افہام و تفہیم سے کام لینا کہ اس جیسوں کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات کی جلد اول کے ۲۶ ویں مکتوب میں لکھتے ہیں کہ۔

کفر کی سزا دوزخ کا ابدی عذاب ہے اور بس۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ ایک آدمی مسلمان ہونے کے باوجود کفر کے رسوم ادا کرتا ہے اور کفار کے مراسم کی تعظیم بجالاتا ہے اور علماء اس کے کافر ہونے کا حکم دیتے ہیں اور اس کو مرتد شمار کرتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان اس بلاء میں پھنسے ہوئے ہیں اور علماء کے فتوؤں کے مطابق یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ شخص آخرت میں ابدی عذاب اور دائمی عقوبت میں گرفتار ہے حالانکہ صحیح احادیث میں ہے کہ جس شخص کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہو تو وہ دوزخ سے نکالا جائے گا اور اس کو ابدی عذاب میں گرفتار نہیں کیا جائے گا تو ایسی صورت میں آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق کیا ہوگی؟

ہم اس کا جواب یہی دیں گے کہ اگر کافر محض ہے تو اس کے لئے آخرت میں ابدی عذاب ہے **اعاذنا الله سبحانه منه** اور اگر کوئی شخص مراسم کفر کو ادا کرنے کے باوجود ذرۂ ایمان سے بہرہ ور ہے تو دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن اس ذرۂ ایمان کی برکت کی وجہ سے ابدی عذاب سے نجات پائے گا اور امید ہے کہ اس کو دائمی نجات حاصل ہوگی۔

یہ فقیر ایک مرتبہ ایسے ہی شخص کی عیادت کے لئے گیا جو سکراتِ موت میں گرفتار تھا۔ میں نے اس کے حال کی جانب توجہ کی تو معلوم ہوا کہ اس کا قلب بہت ساری ظلمتوں کا

شکار ہے ہر چند کہ میں ان ظلمتوں کو دور کرنے کی جانب متوجہ ہوا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوسکا۔ بہت توجہ اور مراقبہ کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ یہ ظلمتیں جو اس کے قلب پر چھائی ہوئی ہیں کفر کی صفات سے پیدا ہوئی ہیں اور ان ظلمتوں اور کدورتوں کے پیدا ہونے کا سبب مسلسل مراسم کفر کا ادا کرنا ہے اور اہلِ کفر کے ساتھ کثرت میل جول اور اختلاط کا نتیجہ ہے اور ان ظلمتوں و کدورتوں کا تنقیہ وطہارت، عذاب دوزخ کے ساتھ مربوط ہے جو کہ کفر کی سزا ہے، تو توجہات سے یہ ظلمتیں دور نہیں ہوسکتیں۔

نیز اس کے دل میں ایمان کی ہلکی سی روشنی موجود ہے تو مجھے اطمینان ہوا کہ وہ اس کی برکت سے دوزخ سے نجات پائے گا۔ جب میں نے اس کے اندر اس حالت کا مشاہدہ کیا تو میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ اس شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ تھوڑی دیر توجہ اور مراقبہ کے بعد مجھے انشراح ہوا کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا چاہئے۔

لہذا جو مسلمان ایمان کے باوجود بدقسمتی سے کفار کے رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے ایام کی تعظیم کرتے ہیں ان کی نمازِ جنازہ پڑھنا چاہئے اور مسلمانوں ہی کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے اور کافروں کے ساتھ ملحق نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ آج کل کیا جارہا ہے اور اس بات کے متمنی اور امیدوار رہنا چاہئے کہ آخر کار ایسے مسلمان ایمان کی ہلکی سی روشنی کی برکت سے ابدی عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ انشاءاللہ

## (الف)

## اہلِ سنت و جماعت کو بدعتی کہنے کی ممانعت

اہل سنت و جماعت کی جانب بدعت کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے اور اس طائفہ کو بدعت کے ارتکاب کی وجہ سے مبتدع، بدعتی اور اہل ہوا نہیں کہنا چاہئے کیونکہ ان الفاظ کا اطلاق روافض، خوارج، جبریہ، قدریہ، ظاہریہ، باطنیہ اور باقی بہتر بدعتی فرقوں پر ہوتا ہے

جو بدعت کا عقیدہ رکھتے ہیں جیسا کہ عقائد کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل دہلویؒ مقدمہ ایضاح الحق کی پہلی فصل میں سنی کو بدعتی اور کافر کہنے کی ممانعت میں لکھتے ہیں کہ

ہر چند کہ شریعت مطہرہ میں بہت سے اعمال، اقوال اور اخلاق کو کفر ونفاق کا ایک حصہ بتلایا گیا ہے لیکن کافر اور منافق کا لفظ بولنے سے فوری طور پر ذہن ایک ایسے مخصوص آدمی کی جانب مائل ہو جاتا ہے جو کفر اور نفاق کا عقیدہ رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بات بھی جاننا چاہئے کہ ہزاروں امور، بدعات کی قسم سے ہیں جن کا کچھ حصہ بطورِ نمونہ یہاں پیش کیا گیا ہے لیکن کسی خاص شخص پر بدعتی کا لفظ بولنے سے فوری طور پر یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص بدعت کا عقیدہ رکھتا ہے۔ لہذا کسی شخص کو بدعت حکمیہ کی ساری اقسام، اور بدعت حقیقہ کی بقیہ اقسام، کا مرتکب ہونے کی وجہ سے بدعتی نہیں کہنا چاہئے۔ اسی لئے بعض وہ اعمال، اقوال اور اخلاق جو کفر ونفاق سے تعلق رکھتے ہیں ان کی وضاحت، سے فقیر کا مقصد یہی تھا کہ لوگ ان افعال اور اخلاق سے اجتناب کریں نہ کہ کفار ومنافقین کے احکامات (مثلاً قتل کرنا، لوٹ لینا، قید کرنا، غلام بنالینا، جزیہ عائد کرنا، ان کی نماز جنازہ نہ پڑھنا، ان کی قبروں کی زیارت نہ کرنا، ان کے مردوں کے حق میں استغفار نہ کرنا) کو بدعات حکمیہ وحقیقیہ کے مرتکب پر جاری اور نافذ کریں۔ اور اسی طرح اقسام بدعت کی تشریح سے بھی فقیر کا مقصد یہی تھا کہ لوگ مذکورہ تمام اقسام سے پرہیز کریں اور سنت خالصہ کو اختیار کریں نہ کہ حدیث نبوی میں اہل بدعت کے بارے میں آئے ہوئے احکامات (مثلاً ان کے اعمال کا ضائع ہونا، ان کی تعظیم وتکریم کو ممنوع کہنا، ان کی عیادت ومزاج پرسی سے اجتناب کرنا، ان کے ساتھ میل جول اور صحبت سے احتراز کرنا، ان سے سلام اور کلام میں پہل کرنا) کو بدعت حکمیہ وحقیقہ کے مرتکب لوگوں پر جاری اور نافذ کریں۔

حاشا للہ کوئی حق و انصاف کا متلاشی اس افراط اور غلو کے راستہ کو اختیار کر لے۔
نعوذ باللہ من ذلک۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(ب)

# فقہی مذاہب میں جدال اور بات چیت میں مخالفت کے احکام!

فقہی مذاہب میں جنگ وجدال کرنا اور بات چیت میں ردوکد کرنا جائز نہیں ہے۔
امام غزالی کیمیائے سعادت کی تیسری اصل میں لکھتے ہیں۔

تیسری آفت یہ ہے کہ بات چیت میں خواہ مخواہ مخالفت کرنا اور لڑائی جھگڑا مول لینا، اس کو خودنمائی کہتے ہیں۔ یہ ایسے آدمی کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے جو بات بھی کہی جائے وہ اس کی تردید کر دے گا اور کہے گا کہ بات ایسی نہیں ہے۔ اس طرح کی بات چیت سے اس کے ذہن میں یہ مفہوم رہتا ہے کہ مخاطب احمق، نادان اور دروغ گو ہے۔ اور میں ہی زیرک وچالاک عاقل وراست گو اور برحق آدمی ہوں۔

اس طرح کے مزاج والے شخص میں دو مہلک صفات کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔
ایک تکبر، دوسری درندگی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بات چیت کے دوران خواہ مخواہ مخالفت کرنے اور لڑنے جھگڑنے سے خود کو محفوظ رکھے اور باطل گوئی سے کام نہ لے تو اس کو جنت میں گھر عطا کیا جائے گا۔ اور اگر بات چیت حق ہی تھی، پھر بھی کچھ نہ کہا تو جنت کے اعلیٰ درجے میں گھر عطا کیا جائے گا۔ ثواب کی یہ زیادتی اس لئے ہے کہ جھوٹ اور محال پر صبر وضبط کرنا بہت دشوار امر ہے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگوں کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ لڑنے جھگڑنے اور مخالفت سے کنارہ کش نہ ہوجائیں اگر چہ کہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ لڑائی جھگڑا اور مخالفت و ردو کد نہ صرف فقہی مذاہب کے باب میں مذموم ہے بلکہ اس طرح کی باتوں میں بھی مذموم اور ناپسندیدہ ہے جو بظاہر چھوٹی سی معلوم ہوتی ہیں مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ یہ انار میٹھا ہے تو آپ اس کی مخالفت و دشمنی کی وجہ سے یہ کہیں کہ میٹھا نہیں، یہ ترش ہے یا کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں مقام سے فلاں مقام تک کی مسافت ایک فرسنگ ہے تو آپ کہیں کہ ایک فرسنگ ہرگز نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

حدیث شریف میں ہے کہ ہر لڑائی جھگڑا جو کسی شخص کے ساتھ کیا گیا ہو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز ادا کی جائے اور یہ بھی لڑائی اور جھگڑا ہے کہ کوئی شخص بات چیت کرے تو تم اس کے کلام میں غلطی پکڑنے کے درپے ہوجاؤ اور اس کے خلل اور خطاء کو نمایاں کرنے میں لگ جاؤ۔ یہ سب حرام ہے کیونکہ اس چیز سے رنجیدگی و دل آزاری کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور ایک مسلمان کو بے ضرورت رنجیدہ کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اور اس قسم کی چیزوں میں لوگوں کی خطاؤں کا اظہار اور ان کی غلطیوں کی تشہیر کوئی فرض نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس خاموشی اور سکوت، ایمان کی نشانی ہے لیکن یہی بحث اور مخالفت فقہی مذاہب کے باب میں ہو تو اس کو جنگ سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور یہ چیز بھی ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

ہاں! خیر خواہی اور نصیحت کے خیال سے تنہائی میں حق بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے جب کہ قبول کرنے کی امید ہو۔ جب یہ امید نہ ہو تو خاموشی اختیار کرلینا چاہئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی امت اس وقت تک گمراہی و ضلالت میں مبتلا نہیں ہوئی جب تک کہ اس کے اوپر مذہبی امور میں جنگ و جدال کا غلبہ نہیں ہوا۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزند کو نصیحت کی کہ علماء کے ساتھ جنگ و جدال نہ کرو ورنہ وہ تمہیں دشمن سمجھیں گے اور کسی باطل ومحال چیز پر صبر اور اعراض کرتے ہوئے خاموش رہ جاتا کہ کوئی فتنہ پیدا نہ ہو، فتنہ سے بڑھ کر مصیبت والی چیز کوئی نہیں ہے اور یہ صبر و ضبط اور سکوت و خاموشی مجاہدہ کے باب میں بڑی عظمت وفضیلت والی چیز ہے۔

حضرت داؤد طائی نے گوشہ نشینی اختیار کی تو امام اعظم ابوحنیفہ النعمان نے ان سے کہا۔ کیوں باہر نہیں آتے؟ عرض کیا مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ اپنے نفس کو بحث وتکرار اور جنگ و جدال سے بچا رہا ہوں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا علمی مناظرہ کی مجلسوں میں شرکت کرو اور سنو۔ لیکن کچھ نہ کہو۔

حضرت داؤد طائی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اس سے زیادہ سخت مجاہدہ کوئی اور نہیں ہے۔ کسی شہر والوں پر اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت اور آفت نہیں کہ شہر کے اندر مذہبی عناد اور تعصب پھیل جائے اور ایک گروہ، جاہ ومنصب اور اقتدار کی طلب میں منہمک اور کوشاں رہتا ہے اور تاثر دیتا ہے کہ جدال ہی دین ہے حالانکہ ان کی درندہ صفت طبیعتیں یہ سوچنے لگتی ہیں کہ مذاہب میں جدال دین ہے تو ان کے اندر اس درجہ حرص وطمع، مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ جدال وخصومت کے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ کیونکہ جنگ و جدال اور خصومت ودشمنی میں نفس کے لئے ہر طرح کی لذت وراحت اور تسکین ملتی ہے۔

حضرت مالک بن انس فرماتے ہیں کہ جدال دین نہیں ہے اور تمام سلف صالحین نے دین میں جنگ وجدال اور خصومت سے منع کیا ہے۔ ہاں! اگر کوئی بدعتی شخص ہے تو انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کی ہے لیکن جیسے ہی یہ محسوس کیا کہ ان کی گفتگو اور افہام وتفہیم بے سود ہے تو انہوں نے اعراض اور کنارہ کشی اختیار کی اور سکوت کو ترجیح دی۔

غرض ہر فرقہ کے کوتاہ نظر آدمی واجب اور متفق علیہ نہیں بلکہ غیر واجبی اور اختلافی

کفریات میں اہل قبلہ کو کافر کہنے میں پیش پیش ہیں اور اعتقادی نہیں بلکہ عملی بدعات میں اہلِ سنت و جماعت کو بدعتی کہنے میں آگے آگے ہیں اور ہر فرقہ کے طاعن آدمی۔ جدال و خصومت میں تعصب اور عناد سے کام لے رہے ہیں۔ معاذ اللہ من ذلک

اس موضوع کی تفصیل پانچویں اور چودھویں مقدمہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ (۱۹)

# سجدۂ تحیت کا حکم

سجدۂ تحیت جمہور علماء کے نزدیک گناہ کبیرہ ہے اور بعض کے نزدیک کفر ہے اور بعض کے نزدیک جائز ہے اور اس کی کسی قدر تفصیل بیسویں فائدہ میں بھی آرہی ہے۔

صاحب ''شمائل الاتقیاء'' نے فتاوٰی تیسیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سجدہ دو طرح کا ہے۔ سجدۂ عبادت اور سجدۂ تحیت۔ سجدۂ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور سجدۂ تحیت اللہ تعالیٰ کے سوا ان پانچ افراد کے لئے تعظیم و تکریم کے طور پر جائز ہے۔ امت نبی کے لئے۔ مرید مرشد کے لئے۔ رعایا بادشاہ کے لئے۔ اولاد والدین کے لئے۔ غلام آقا کے لئے۔ سجدۂ تحیت کر سکتے ہیں۔

مدارج النبوۃ کی پہلی جلد میں اور ''شرح سفر السعادۃ'' میں عبدالحق محدث دہلوی اور ترجمہ مشکوٰۃ کے باب میں سجدہ الشکر میں لکھتے ہیں کہ سجدہ کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کو سجدۂ تحیت کہتے ہیں اور بعض فقہی روایات میں اس کی اجازت آئی ہوئی ہے لیکن مختار موقف یہ ہے کہ سجدۂ تحیت مکروہ تحریمی اور حرام ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات کی دوسری جلد کے ۹۲ ویں مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

ہر چند کے بعض فقہائے کرام نے سجدۂ تحیت کو سلاطین کے لئے جائز قرار دیا ہے لیکن اس معاملہ میں سلاطین کے لائق حال یہی بات ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہی کے حضور میں تواضع کا اظہار کریں اور سجدۂ تحیت کی اس انتہائی تذلل اور حد درجہ انکساری، کو غیر اللہ کے حق میں روا نہ رکھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عالم کو سلاطین کا مسخر کیا ہے اور ان کا محتاج بنا دیا ہے۔ اس لئے اس نعمت عظمیٰ کا شکر بجالا کر جبہ سائی جو کہ انتہائی عجز اور کمال انکسار و تواضع کا اظہا کرتی ہے۔ سلاطین سجدۂ تحیت کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مسلم رکھیں اور اس معاملہ میں اپنی شرکت کی کوشش نہ کریں۔

سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے ایک سائل کے جواب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے وہ سوال و جواب من وعن درج ذیل ہے۔

سوال: فوائد الفواد میں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے ملفوظات میں چند مقامات پر مذکور ہے کہ ان کے پاس آنے والے حضرات زمین پر سر ٹیکتے تھے۔ کسی صاحب نے آپ سے اس فعل کو ممنوع قرار دینے کی درخواست کی تو فرمایا۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ لوگوں کو اس چیز سے منع کروں لیکن اس وجہ سے نہیں روکتا ہوں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ فرید الدین عطار کے پاس آنے والے حضرات بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

اور ایک دوسرے صاحب کے سامنے اس امر سے متعلق سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے یہ وضاحت فرمائی کہ

جب ایک فرض چیز کی فرضیت منسوخ ہو جاتی ہے تو اس کی سنیت باقی رہ جاتی ہے جیسے ایام بیض اور یومِ عاشوراء کے روزے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اباحت باقی ہے۔

مقدس و برگزیدہ حضرات کرام جو ظاہر و باطن کے امام ہیں۔ان کا سجدہ کو جائز قرار دینا محل حیرت ہے اور ان کے اس سوال کی جو حقیقت ہے وہ بھی ظاہر ہے کہ کس قدر بے وزن ہے۔

جواب: منتخب فتح العزیز میں غیر اللہ کے لئے سجدہ کی تحقیق حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں بوجہ احسن پیش کی گئی ہے۔اس کتاب کو شیخ عبداللہ جدید الاسلام فارسی میں لکھ رہے ہیں اس کے کچھ حصہ کو نقل کر کے خدمت گرامی میں بھیجا گیا ہے،اس کتاب کا نسخہ اگر اس وقت موجود ہوتا تو اس سے چند سطور نقل کر کے آپ کی خدمت میں بھیج دیتا۔

اب ہم اس مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ یہ بزرگان کرام سجدۂ تحیت کو کیوں جائز قرار دیتے ہیں۔بہت غور و فکر اور تنقیح و تفتیش کے بعد ان بزرگان کرام کے سجدۂ تحیت کو جائز ٹھہرانے کی توجیہ میرے نزدیک یہ قرار پائی کہ یہ حضرات کرام سجدہ کی دو قسم سمجھتے تھے۔ سجدۂ عبادت اور سجدۂ تحیت۔سجدۂ عبادت کو یہ حضرات کرام بھی کفر ہی سمجھتے تھے اور سجدۂ تحیت کو جائز خیال کرتے تھے۔

سجدۂ عبادت اور سجدۂ تحیت کے درمیان تغائر، تعظیم باطنی اور تغایر نیت کے وصف کے ساتھ دونوں میں،ظاہری اعتبار سے فرق یہ ہے کہ ملاقات اور حاضری کے وقت تعظیم و تکریم کے طور پر تحیت مسنونہ سے آگے بڑھ کر سجدہ کریں تو وہ سجدۂ تحیت ہے اور اگر تعظیم و تقرب کے قصد و ارادے سے ہو تو یہ سجدۂ عبادت ہے۔اگر چہ کہ مسجود غائب ہو۔اور مطلوبہ نفسیاتی کیفیات کے حصول کا قصد ہو جیسا کہ بتوں کی جانب کفار کا سجدہ ہوتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جانب فرشتوں کا جو سجدہ تھا وہ تحیت کی قسم کا تھا چنانچہ اکثر مفسرین کرام کی رائے یہی ہے اور بعض مفسرین کی یہ وضاحت ہے کہ سجدہ تو خدائے تعالیٰ ہی کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام (مسجود علیہ) تھے۔

بہر حال جب ملائکہ پر حضرت آدم کے تعلیم الاسماء کا حق ثابت ہو گیا تو ملائکہ

حضرت آدمؑ کو سجدۂ تحیت ادا کرنے پر مامور ہوئے تو دوسرے متعلم اور مرید، از روئے قیاس جلی بطریق اولیٰ اپنے معلم و مرشد کو سجدۂ تحیت ادا کرنے پر مامور ہوئے۔ شریعت محمدی میں جب سجدہ کی فرضیت منسوخ ہوگئی تو یہ فرضیت، مندوب و مستحسن کی صورت میں بدل گئی لیکن اس استدلال کے مقدمات میں جس نوع کا شبہ وارد ہوتا ہے وہ آپ پر ظاہر ہے جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے۔

اس استدلال سے قوی تر دوسرا شبہ جس کو عبدالکریم بہرہ گجراتی نے اپنی ایک عظیم تفسیر میں جو موافق تصوف، تصنیف کی ہے۔ سورہ یوسف کی تفسیر میں لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہاں درج ہے۔

قاعدہ کے موافق اگلی شریعتوں کے احکام اس وقت تک ہمارے لئے حجت ہیں جب تک کہ ہماری شریعت کے اندران کو منسوخ کرانے والا کوئی حکم نہ پایا جائے۔ نص قرآنی ''خروا لہ سجدا'' کی رو سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تحیت جائز تھا لہذا ہماری شریعت میں بھی وہ جائز ہوگا۔ اور اس جواز کو منسوخ کرنے کے لئے ہماری شریعت میں خبر واحد کے سوا کوئی اور حدیث موجود نہیں ہے لو کنت اٰمرا لاحد لامرت ان تسجد لزوجتھا۔ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ لیکن کسی فرد بشر کے لئے زیبا نہیں کہ وہ
غیر اللہ کو سجدہ کرے اور نص قرآنی کو منسوخ کرنے کے لئے خبر متواتر ہونا چاہئے نہ کہ خبر واحد۔ اور اس کے ساتھ خبر واحد اس بات کی محتمل ہے کہ سجدہ عبادت کا سجدۂ تحیت کے ساتھ مشتبہ ہونے کے مدنظر وارد ہوئی ہے۔ کیونکہ لوگ کفر سے قریب العہد اور غیر اللہ کی عبادت کے عادی اور خوگر تھے۔ اس لئے اس وقت سجدہ کو مطلقاً منع کیا گیا جیسا کہ حنتم اور مزفت کو منع کیا گیا (کوزہ اور پیالہ جو شراب ڈالنے اور پینے کے لئے مخصوص تھے مترجم)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ توضیح اجماع قطعی سے سراسر غفلت کا نتیجہ ہے جو سجدہ تحیت حرام ہونے پر منعقد ہو چکا ہے۔ اور اجماع بر تحریم سجدہ، ناسخ اور منسوخ کی بحث سے مستغنی ہے۔

یہاں یہ بات جان لینی چاہئے کہ قیاس تین شرعی دلائل ( کتاب اللہ، سنت رسول، اور اجماع ) میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی متصادم اور معارض ہو جائے تو وہ غیر معتبر ہے۔ یعنی قیاس اگر اجماع قطعی سے متصادم ہو جائے تو وہ غیر معتبر ہے۔

مولانا بحر العلوم لکھنوی ثم المدراسی ''شرح المسلم'' میں فرماتے ہیں

واضح ہو کہ شریعت کے تین اصول ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع اور چوتھی اصل قیاس ہے اور وہ اس طرح ہو کہ ان تینوں اصول سے مستنبط رہے پھر قیاس مظنون الافادہ ہے یعنی اس کی افادیت کے بارے میں گمان ہے اور جمہور علماء کے نزدیک قیاس سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور اس سے عقائد کا اثبات نہیں ہوسکتا۔

نیز قیاس، تینوں شرعی دلائل میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی متصادم اور متعارض ہو جائے تو وہ غیر معتبر ہے۔ اور قیاس کا حجت ہونا، ہنگامی ہے۔ جب کہ کسی پیش آنے والے واقعہ کے اندر عمل کے لئے تینوں شرعی اصول میں سے کوئی دلیل موجود نہ رہے اگر چہ کہ وہ بھی شارع علیہ السلام کی جانب سے قائم شدہ ہے۔

اسی لئے شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی نے قیاس کو ساقط کر کے اس طرح لکھا ہے کہ شریعت کے اصول کتاب، سنت اور اجماع ہیں اور قیاس اسی وقت معتبر ہے جب کہ ان تینوں اصول کے اندر حکم موجود نہ ہو اور قیاس کے لئے یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ قطب الاقطاب شیخ فرید الدین اور شیخ المشائخ محبوب الٰہی سے سجدۂ تحیت کے جائز ہونے میں جو روایات منقول ہیں وہ اس بات کا احتمال

رکھتی ہیں کہ وہ مذہب اباحت پر مبنی ہوں۔اور یہ بزرگانِ کرام مجتہدین ہیں یا مقلد۔ ان دونوں حالتوں میں بھی ان بزرگوں پر طعن کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ مجتہد اپنے اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے اور وہ معذور ہے اور غلطی کرنے والے مجتہد کی تقلید کرنے والا بھی نجات پانے والا ہے جیسا کہ عقائد اور اصول کی کتابوں میں تفصیل موجود ہے۔

امام ربانی مکتوبات کی تیسری جلد کے ۲۲ ویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

مجتہد پر اعتراض کی کیا بات ہے اس کی خطا ولغزش بھی ایک درجہ ثواب کی حامل ہے اور اس کی تقلید اگر چہ کہ خطا ہی میں ہو، نجات کا باعث ہے۔

اب یہاں یہ بات غور اور توجہ کے قابل ہے کہ علمائے اعلام کے قول کے مطابق یہ بات روشن ہو چکی کہ سجدۂ تحیت، اجماع قطعی کے خلاف ہے اور مومن کو ہرگز اجماع کے خلاف عمل نہیں کرنا چاہئے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اجماع کی مخالفت کرنے سے روکنا چاہئے اور اس اجتہادی خطاء میں مجتہد بھی اولیاء کرام پر طعن و تشنیع کرنے کی بلاء سے پر حذر ہوگا۔

اہلِ سنت و جماعت کے اس اختلافی مسئلہ میں اباحت کا غیر معتبر قول کرنے سے اس فقیر ( صاحب فصل الخطاب حضرت قطب ویلور ) کا مقصود صرف غالی حضرات کی زبان بند کرنا ہے تا کہ وہ اولیائے ذی شان پر طعن و تشنیع اور بزرگانِ کرام کی تضلیل و تکفیر کرنے سے اور ان کی غیبت کرنے سے محفوظ رہ سکیں اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اختلافی مسائل کے اندر ایک دوسرے پر عیب نہیں لگانا چاہئے اور ہر ایک کو اس کے موقف پر چھوڑ دینا چاہئے فربکم اعلم بمن هو اهدى سبيلا ( تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ ہدایت کے راستہ پر ہے ) اس کی تفصیل پانچویں مقدمہ میں گذر چکی ہے۔

اس نقل سے یہ خیال نہ کریں کہ یہ فقیر ضعیف اور غیر معتبر قول پر عمل کرنے کی دعوت اور ترغیب دے رہا ہے اور اس کا مسلک قول ضعیف پر مبنی ہے حاشا و کلا، ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے۔ طرفہ طرازی تو یہ ہے یہ کہ حضرات اکابر چشت ہیں اور طعن کرنے والے افراد کے مشائخ ہیں۔ اپنے ہی بزرگوں کی تضلیل وتوہین کے باوجود اس طریقے کی دعوت دینے سے اور اس طریقہ میں بیعت سے دست کش نہیں ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۰)

# مصاحبت و مخالطت اور اسکے متعلقات

## (۱) حکمِ قیام

باہمی دوستی اور صحبت اختیار کرنے کے آداب اور اُن کے متعلقات بہت ہیں اور اسکے ثمرات ونتائج بے شمار ہیں۔ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں آدابِ صحبت کی بحث میں فرماتے ہیں۔

واضح ہو کہ من جملہ ان امور کے جن کو فطرتِ سلیمہ اور افرادِ انسان میں باہمی حاجات کا وقوع اور حاجات کا سہل طور پر حصول، واجب کرتے ہیں۔ ایک آداب ہیں جن کو بنی آدم باہم ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر آداب تو ایسے ہیں جن کے اصول پر عرب وعجم کے مختلف گروہ متفق ہیں۔ اگر چہ کہ ان کی صورتوں اور اشباح کے اندر ان کا اختلاف ہے۔ پس ان آداب سے بحث کرنا اور ان آداب میں سے اچھے کو برے سے تمیز

کرنا، ان مصلحتوں میں سے ایک مصلحت ہے جن کو پورا کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔

اس موضوع پر شاہ صاحب نے بڑی مفصل و مدلل بحث کی ہے لیکن یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں ہے۔ پس اس کے بعد یہ بات جان لینی چاہئے کہ مجالس اور محافل میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنا، جیسا کہ اس زمانہ میں مشہور و معلوم اور متعارف ہے اُس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک سنّت ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت شیخ عبدالحق دہلوی نے ترجمہ مشکوٰۃ میں کی ہے۔

صاحبِ جامع الرموز نے کتاب الکراھیہ میں لکھا ہے:

کسی شخص کی تعظیم و تکریم اور اس کے ساتھ اظہار محبت و الفت کے لیے قیام کرنا مکروہ نہیں ہے۔ البتہ کسی شخص کا اپنے دل میں اس بات کی خواہش اور تمنّا رکھنا کہ لوگ اس کے لیے قیام کریں یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔

صاحبِ حجۃ اللہ البالغہ نے قیام سے متعلق یہ صراحت کی ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔

تعظیم کے لئے کھڑے ہونے میں احادیث مختلف ہیں۔ اور تعظیم کے لئے کھڑا ہونا، ایک مومن کی خوش نودی کے لیے اور اس کی تعظیم و تکریم کے لئے اور اس کے دل کو خوش کرنے کے لیے ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ یہ قیام اس کے سامنے خدمت گاری کے لیے نہ ہو۔

امام حجۃ الاسلام غزالی نے خالق الناس باخلاقھم کے حکم کے مطابق قیام کی عادت میں قوم کی موافقت کرنے کو سنّت کو شمار کیا ہے چنانچہ کیمیائے سعادت کے دوسرے رکن کی آٹھویں اصل میں فرماتے ہیں:

لوگوں کے حسنِ اخلاق سے پیش آنا اور ان کے دلوں کو خوش کرنا، شریعت میں فعلِ

محمود اور پسندیدہ امر ہے۔اور ہر قوم کی ایک عادت ہوگی جس کی خلاف ورزی اس قوم کے اخلاق میں بدخوئی اور بداخلاقی تصور ہوگی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ہر قوم کے ساتھ اس کی عادت وخصلت کے موافق زندگی گزاریں جب کہ یہ قوم اس موافقت اور مطابقت سے خوش ہو رہی ہو اور موافقت نہ کرنے کی وجہ سے حیران اور متوحش ہو رہی ہو تو ایسی صورت میں اس کے موافقت و مطابقت کرنا سنّت کی قبیل سے ہے۔اور حضرات صحابہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قیام نہیں کرتے تھے، کیوں کہ یہ بات آپ کو ناپسند تھی۔لیکن جب قیام عادت کے مقام میں ہو اور اس کا ترک کرنا، حیرت واستعجاب اور وحشت کا باعث ہو تو لوگوں کی خوشی اور ان کا دل رکھ لینے کے لیے قیام کرنا بہتر ہوگا۔کیوں کہ عربوں کی عادت الگ ہے۔اور عجمیوں کی عادت الگ ہے(انتہی)

اس مسئلہ میں حق بات تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مجلس میں داخل ہونے والے کی تعظیم وتکریم کے لیے قیام کرنے کی عادت نہ تھی۔قیام کرنے اور قیام نہ کرنے کا مسئلہ حالات واشخاص اور زمانوں کے مطابق مختلف رہا ہے اور اس فتنہ وفساد کے زمانے میں خصوصاً ہندوستان کے شہروں میں قیام کرنا واجب ہے۔کیوں کہ قیام نہ کرنا، چغل خوری وغیبت اور دشمنی وخصومت کا باعث ہو جاتا ہے اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جو حرام کی طرف کھینچ لے جائے وہ بھی حرام ہے۔

''خزانۃ الروایہ'' کے حوالہ سے ملّا علی قاری نے لکھا ہے کہ جب کسی شہر میں ایک دوسرے کی تعظیم وتکریم کے لیے کھڑے ہو جانے کی عادت اور رسم ہو اور اگر کوئی مسلمان قیام نہ کرنے سے رنجیدہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی دل جمعی اور تالیف قلب کی خاطر قیام کرنا چاہئے۔کیوں کہ ایک مسلمان کو ایذا پہنچانا حرام ہے۔(انتہی)

اور ابنِ ابطال کہتے ہیں کہ جب ایک فعل کسی شخص کو حرام کی جانب مائل کر سکتا ہے تو

وہ فعل اس شخص پر حرام ہو جاتا ہے۔ بھلے سے وہ شخص حرام کا قصد کرنے والا نہ ہو۔(انتھی)

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی مناسبت سے فقہاء نے یہ حکم دیا کہ شب میں بلند آواز کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا اور ذکرِ الٰہی کرنا اگر چہ کہ سنّت ہے لیکن جب ایک ہمسایہ کی نیند میں خلل ہو رہا ہو اور اس کو تکلیف پہنچ رہی ہو تو بآوازِ بلند تلاوت اور ذکر سے باز آجائے۔ ورنہ حاکم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی طاقت کے ذریعہ اس کو منع کر دے۔

اسی طرح مصلی کو سجدہ میں اپنے دونوں بازو کو پہلو سے دور رکھنا اگر چہ کہ سنّت ہے لیکن جماعت کی نماز میں اپنے بازوؤں کو پہلو سے دُور نہ رکھے تاکہ اس کے قریب والے مصلیوں کو ایذا و تکلیف نہ ہو۔

''حمیدی'' میں کہا گیا ہے کہ یہ علّت اس حقیقت کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ ایک مسلمان کو تکلیف دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ حالاں کہ اس کی ایذا میں اقامتِ سنت کا پہلو موجود ہے۔ بلکہ فقہا نے حاکم کی موجودگی کو نمازِ جمعہ وعیدین کی ادائیگی کے لیے ایک شرط قرار دی ہے۔ جیسا کہ یہ شرط اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ فتنہ وفساد کے اندیشہ کی صورت میں سنّت تو کجا فرض اور واجب کی ادائیگی بھی جائز نہیں رہتی۔ اسی لیے علامہ ابن صلاح اور علامہ ابنِ عبدالسلام نے اپنے دور میں فتنہ وفساد کھڑے ہونے کے اندیشہ سے یہ فتوٰی دیا تھا کہ مجالس میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنا واجب ہے بلکہ بعض فقہاء نے تو مال داروں کے لیے قیام کرنے کو مکروہ قرار نہیں دیا۔ اور بعض فقہاء نے تو مسجد میں اور تلاوتِ قرآن مجید کے دوران بھی دوسرے کی تعظیم وتکریم کے لیے کھڑے ہو جانے کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ صاحبِ جامع الرموز نے کتاب الکراھیہ میں تحریر کیا ہے۔

ابو القاسم الحکیم کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ مال داروں کے لیے قیام کرتے تھے اور فقرا و مساکین کے کے لیے قیام نہیں کرتے تھے۔

اور نہایہ میں مرقوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیر کی تعظیم کے لیے قیام کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور زاہدی میں مسطور ہے کہ مسجد میں کسی شخص کی تعظیم وتکریم کے لیے قیام کیا جائے تو یہ کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ بات نہیں ہے اور اسی طرح تلاوت کرنے والا شخص کسی کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جائے تو یہ کوئی کراہت والی بات نہیں ہے۔ (انتہی)

بعض علماء نے مصحفِ شریف کی تعظیم کے لیے قیام کو مستحب کہا ہے جیسا کہ علامہ بدخشانی نے معارف العلوم میں اور علامہ سیوطی نے ''الاتقان'' بحثِ رسم الخط میں لکھا ہے:

''قواعد'' میں شیخ عزالدین عبدالسلام نے فرمایا کہ مصحفِ شریف کے لیے قیام کرنا بدعت ہے۔ پہلی صدی ہجری میں یہ فعل ناپسندیدہ تھا۔

اس مسئلہ میں صحیح موقف تو وہی ہے جس کو امام نووی نے اختیار کیا ہے۔ چناں چہ انہوں نے ''تبیان'' میں لکھا ہے کہ یہ فعل مستحب ہے کیوں کہ اس کے اندر تعظیم وتکریم اور عدم تحقیر کا پہلو موجود ہے۔ (انتہی)

بعض علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کے بیان میں اسم مبارک کے ذکر کے وقت میں تعظیم وتکریم نبویؐ کے لیے کھڑے ہو جانے کو مستحسن قرار دیا ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل ہم بارھویں فائدے میں پیش کر چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۲)

# سلام، مصافحہ اور معانقہ کا حکم

واضح ہو کہ سلام، مصافحہ اور معانقہ بھی آدابِ صحبت میں سے ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں آدابِ صحبت سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

من جملہ آدابِ صحبت میں سے ایک سلام کرنا بھی ہے۔ جس کو بعض، بعض کے لیے عمل میں لایا کرتے ہیں، کیوں کہ لوگوں کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار کریں اور باہم لطف و مہربانی اور مہر و وفا سے پیش آئیں۔ اور چھوٹے بڑوں کو بزرگ خیال کریں۔ اور بڑے چھوٹوں پر شفقت کریں، اور اہلِ زمانہ آپس میں بھائی بھائی اور دوست بن کر رہیں کیوں کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو باہمی صحبت اور ہم نشینی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور نہ ہی صحبت سے کوئی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اظہارِ مسرت کے لئے کسی ایک لفظ کا تقرر ایک ناگزیر صورتِ حال ہے کیوں کہ خوشی اور مسرت ایک اندرونی چیز ہے جو قرائن سے استنباط کئے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہر قوم کے سلف کا طریقہ آپس میں سلام کے برتاؤ کا چلا آیا ہے۔ پھر وہ ان کے مذہب کا شعار ہوگیا۔ اور اس بات کی علامت اور اس امر کا نشان ہوگیا کہ فلان شخص فلاں قوم سے ہے۔ چنانچہ مشرکین انعم اللہ بک علینا اور انعم اللہ بل صاحا کہا کرتے تھے۔ اور مجوسی ''ہزار سال بزی'' کہا کرتے تھے۔ اور شریعتِ مصطفویؐ کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس امر میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو انبیاء کرام کی سنت سے ہو۔ اور جس کو انبیاء نے ملائکہ سے سیکھا ہے اور وہ طریقہ دعا اور ذکر الٰہی کے قبیل سے ہو۔ مثلاً درازی عمر، زیادتیٔ دولت کی

آرزو، اوراس طریقہ میں حد سے زیادہ تعظیم نہ ہو کہ آدمی کو شرک کے قریب کردے جیسے سجدہ کرنا، زمین بوسی وغیرہ اور وہ طریقہ، سلام ہے (جس میں دعا، ذکر الٰہی، اعتدال پر مبنی تعظیم اور دنیاوی نعمتوں کی سلامتی وغیرہ شامل ہے۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ، اور جب تک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الفت نہ کرو گے تو مومن نہ ہون گے۔ کیا میں تم کو ایسی چیز کی نشان دہی نہ کروں جس کو اپنانے سے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا ہو جائے؟ پس تم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا کرو۔!

میں یہ کہتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کا سبب بیان فرمایا۔ کیوں کہ لوگوں کا آپس میں محبت کرنا یہ ایک ایسی خصلت ہے جو اللہ کو پسند ہے اور باہمی محبت و الفت پیدا کرنے کے لیے سلام ایک عمدہ اور مفید ذریعہ ہے۔ اسی طرح مصافحہ اور دست بوسی وغیرہ بھی باہمی محبت و الفت پیدا ہونے کے لیے ایک مفید ذریعہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چھوٹے بڑوں کو، چلنے والے بیٹھے ہوئے لوگوں کو، تھوڑے افراد بہت سے لوگوں کو اور سواری پر جانے والے پیادہ چلنے والوں کو سلام کریں۔

میں کہتا ہوں، لوگوں میں یہ دستور عام تھا کہ باہر سے آنے والا شخص گھر والوں کو سلام کیا کرتا تھا۔ اور ادنیٰ درجہ کا آدمی، اعلیٰ درجہ کے آدمی کو سلام کیا کرتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بدستور باقی رکھا البتہ اس میں تغیر یہ فرمایا کہ آپ عورتوں اور بچوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو بھی سلام کیا کرتے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ انسان کا اس شخص کو بزرگ سمجھنا، جو اس سے بڑا اور اشراف ہے اپنے اندر متفرق فضائل کو جمع کر لینے کے اعتبار سے ہے، بے

شک اس میں ایک طرح کی خود پسندی ہے۔اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستور مقرر کیا کہ اعلیٰ درجے کے لوگ تواضع وانکساری اختیار کریں اور کم درجہ کے لوگ، اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی تعظیم وتکریم کریں۔چناں چہ آپؐ نے صاف لفظوں میں فرمایا:

جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔اور سوار کو پیادہ چلنے والے کیے سلام کا طریقہ اس لیے مقرر فرمایا کہ لوگوں کے نزدیک سوار باہیبت اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے باعظمت ہوتا ہے۔اسی لیے آپؐ نے سوار کے لیے تواضع اور انکسار کا حکم دیا۔اور شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

اور مصافحہ کرنے میں اور خوش آمدید، مرحباً اھلاً وسہلاً کہنے میں اور باہر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ کرنے میں یہ راز ہے کہ ان امور سے محبت والفت اور خوشی ومسرت بڑھتی ہے اور وحشت واجنبیت اور نفرت وعداوت دُور ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان باہم ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں اور اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان محبت والفت اور لطف ومہربانی کا پایا جانا اور ان کے درمیان اللہ کا ذکر جاری ہونا یہ ایسی خصلت ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسندیدہ ہے۔اور اس سے خدا خوش ہوتا ہے۔ (انتہیٰ)

سلام سے متعلق صاحب ترجمہ مشکوٰۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سلام، اسلام کے عظیم ترین شعائر میں سے ایک شعار ہے۔جو اسلام کے ابتدائی دور میں کافر اور مسلمان کے درمیان فرق وامتیاز کی علامت تھا۔یہودیوں اور عیسائیوں کا سلام زبان سے کچھ کہے بغیر صرف ہاتھ سے اشارہ کرنا ہے۔مگر یہود کا اشارہ انگلیوں سے ہے اور

عیسائیوں کا اشارہ ہتھیلی سے ہے۔اور اسلام کا سلام زبان سے السلام علیکم کہنا ہے اور سلام کرنا سنت ہے۔اور اس کا جواب دینا فرض ہے۔اکثر اہلِ علم کی رائے کے مطابق سلام کا معنی اور مفہوم یہ ہے کہ آپ کو میرے طرف سے سلامتی اور امن ہے۔اور آپ بھی مجھے اپنی طرف سے امن اور سلامتی دیں۔(انتہیٰ)

زبان سے سلام کرتے وقت یا سلام کا جواب دیتے وقت ہاتھ سر پر رکھنے کے جواز میں مولانا محمد مخدوم ہاشمی سندھی نے ایک سوال کے جواب میں جو لکھا ہے وہ من وعن یہاں نقل کیا جارہا ہے:

سوال: سلام کے وقت زبان سے السلام علیکم، کہے بغیر صرف ہاتھ سر پر رکھ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سلام کرنے کے وقت میں اور جواب دینے کے وقت میں زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ سر پر رکھنا جائز ہے۔سلام اور سلام کے جواب میں زبان سے کہے بغیر صرف ہاتھ کا سر پر رکھنا بدعت قبیحہ ہے اور صرف ہاتھ وغیرہ سے اشارہ کردینا کافی نہیں ہے۔ابنِ شبیہ نے عطا سے روایت کی ہے کہ زبان سے کہے بغیر صرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سلام کرنا مکروہ ہے۔اور سر کے اشارے سے سلام کرنا مکروہ نہیں ہے۔

''شرح المہذب'' میں مرقوم ہے کہ زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے اشارہ کے ساتھ سلام کیا جائے تو بہت خوب ہے اور یہ سنت ہے۔جیسا کہ اسماءِ بنت یزید فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد کے پاس سے تشریف لے گئے جہاں عورتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔آپؐ نے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔یہ حدیثِ پاک اس حقیقت کی نشان دہی کررہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام میں لفظ اور اشارہ دونوں کو جمع فرمایا۔

اور امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے جو لفظ اور اشارہ کے جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ مگر ابوداؤد نے اپنی روایت میں ''فسلّم'' روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اپنی روایت میں'' فالوی بیدہ'' کہا ہے اور ابوداؤد نے اس کے مقام پر فسلّم۔ ویسے ہی مذکور حدیث کی روایت ابن ماجہ اور الدارمی نے بھی کی ہے جیسا کہ مشکوٰۃ میں ہے۔

پس حدیثِ مذکور کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اس میں زبان سے لفظ سلام اور ہاتھ سے اشارہ دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور حدیث میں الگ الگ دونوں طریقوں سے بھی روایت ہے تو پھر ابوداؤد میں ایک امر یعنی زبان سے سلام کا ذکر کرنا اور ہاتھ سے اشارہ کا ذکر ترک کرنا یا تو بھول کی وجہ سے ہوسکتا ہے یا اسی قسم کی اور کسی وجہ سے۔ الی آخرہ (اذکار النووی للشیخ ابنِ علّان البکری الشافعی)

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ سلام کرتے وقت یا سلام کا جواب دیتے وقت زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کو سر پر رکھیں تو جائز ہے اور اس کے برعکس یعنی صرف اشارہ سے سلام کرنا یا جواب دینا دونوں ناجائز ہے۔

سلام کرتے وقت جھک جانا مکروہ ہے۔ عالمگیری میں مرقوم ہے کہ بادشاہ وغیرہ کو سلام کرتے وقت جھکنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ طریقہ مجوسیوں کے فعل سے مشابہت رکھتا ہے، جیسا کہ ''جواہر الاخلاطی'' میں مرقوم ہے۔

سلام کرتے وقت جھک جانا مکروہ ہے اور اس کے متعلق ممانعت آئی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ''تمرتاشی'' میں مرقوم ہے۔ (انتہیٰ)

حاصلِ کلام! سلام کرتے وقت جھک جانا خواہ وہ گردن سے ہو یا پشت سے ہو، مکروہ ہے۔ اور نہ جھکنا اگر چہ کہ سنت ہے لیکن چوں کہ دیارِ ہند میں نہ جھکنا مسلمانوں کے لیے ایذا اور تکلیف کا باعث ہو جاتا ہے اور غیبت، چغل خوری بلکہ دشمنی اور نزاع تک پہنچنے کا

سبب ہوتا ہے۔ اور یہاں لوگوں کو سلام کے وقت جھکنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ لہذا حدیث نبوی خالق الناس باخلاقھم (ہر شخص کے ساتھ اس کی عادت وخصلت کے موافق زندگی گذارو۔) کی رعایت کرتے ہوئے ہمسر اشخاص کو گردن جھکا کر سلام کرتے ہیں۔ اور بزرگوں کو پشت کے ساتھ جھک کر سلام کرتے ہیں۔ (یہ طریقہ دکن بالخصوص حیدرآباد میں عام ہے چھوٹے، بڑوں کو جھک کر سلام نہ کریں تو بے ادبی اور بد اخلاقی تصور کیا جاتا ہے)

یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ سلام کرتے وقت نہ جھکنا سنت ہے اور ایک مسلمان کو تکلیف دینا حرام ہے۔ اور ایک سنت کو قائم کرنا، حرام کے وقوع کا سبب بن رہا ہے۔ لہذا ہر وہ چیز جو حرام کی جانب لے جائے وہ بھی حرام ہے اور یہ شریعت کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل قیام کے حکم میں گزر چکی ہے۔

## (۳)

# قدم بوسی کا حکم

نیز جاننا چاہئے کہ قدم بوسی سنت ہے۔ صاحبِ درالمختار فرماتے ہیں کہ کسی نے کسی عالم یا زاہد سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا قدم اس کی طرف بڑھائیں اور قدم بوسی کا موقع دیں تو درخواست قبول کر لینا چاہئے۔ اور ایک قول ہے کہ اس کی اجازت نہ دے۔ انتہی

ردّالمختار، حاشیہ درالمختار میں مرقوم ہے کہ عالم اس شخص کی درخواست کو قبول کرے گا اس حدیث کے پیش نظر، جس کو حاکم نے اخراج کیا ہے۔ کہ ایک آدمی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز بتلائیے جس سے ایمان وایقان میں زیادتی ہو سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس درخت کے پاس جاؤ اور اس کو بلاؤ۔ پس وہ شخص درخت کے پاس گیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا، اللہ کے رسول تجھے بلا رہے ہیں۔

پس وہ درخت چلا آیا۔ اور نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کوسلام کیا۔ آپؐ نے درخت سے فرمایا: اچھا لوٹ جاؤ۔ بس وہ لوٹ گیا۔ اس آدمی نے آپؐ سے قدم بوسی کی اجازت چاہی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دے دی، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک اور دونوں پیروں کو چوم لیا۔

اس پر نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں کسی شخص کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو ضرور عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

حاکم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے (از رسالہ شرنبلالی انتہی)

صاحب المنیہ درمختار کی عبارت: اجابہ کے تحت کہا ہے کہ بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دست بوسی اور قدم بوسی کیا کرتے تھے جیسا کہ الاختیار میں مذکور ہے۔ انتہیٰ

شیخ الہند ''شرح سفر السعادۃ'' میں لکھتے ہیں کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے افراد جب مدینہ منورہ پہنچتے تو اپنے سواریوں سے اتر پڑتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ انتہیٰ

شیخ الہند ترجمہ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں صاحبِ صحیح المسلم امام مسلمؒ جب صاحبِ صحیح البخاری امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے تھے کہ مجھے آپ قدم بوسی کا موقع عنایت فرمائیے۔ انتہیٰ

شرف الملّت والدین یحیٰ منیری ۱۸۱ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں کہ مرید کی نظریں ہمیشہ اپنے مرشد کے کمال اور خوبی پر مرکوز رہنی چاہئے اور اپنے نقص وعیب کی جانب نظر رہنا چاہیے۔ اور اگر مرشد کے کسی ایسے فعل کا صدور دیکھے جو اس کی عقل اور حوصلہ میں نہ سما

سکے تو یہ اعتقاد رکھے کہ مرشد کا فعل اپنی جگہ صحیح اور درست ہے البتہ میری عقل اس فعل کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہی ہے۔ اور یہ کہ مریدین جو مرشدوں کی دست بوسی و قدم بوسی کرتے ہیں، درست ہے۔ اور منقول ہے کہ مرشد کی قدم بوسی صحابہ کرامؓ کی سنت ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کو بہت بوسہ دیے ہیں۔

روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوی اور نو آیات بینات کے متعلق دریافت کی تو آپؐ نے انہیں تفصیل بتلائی۔ پس اس جماعت نے آپؐ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا اور آپؐ کی باتوں کی تصدیق کی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دست بوسی اور قدم بوسی سے منع نہیں کیا۔ اگر یہ فعل خلاف شرع ہوتا تو آپؐ ضرور ان کو منع فرماتے۔

اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دست بوسی اور قدم بوسی فعل مشروع ہے۔

حضرت ذراع بن عامر فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دست بوسی اور قدم بوسی کرتے ہیں۔

خادم عباسؓ حضرت صہیبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو حضرت عباسؓ کے ہاتھ اور پیر چومتے ہوئے دیکھا ہے۔ انتہیٰ

کوتاہ نظر اشخاص دست بوسی اور قدم بوسی کے مسئلہ میں بزرگوں کو طعنہ دیتے ہیں۔ ان کی یہ طعنہ زنی ان کے علم کی کمی اور ان کے بے ادب و بے باک اور گستاخ ہونے کی نشانی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۴)

# زمین چومنے اور زمین پر رخسار یا جبین رکھنے اور سجدہ کرنے کا حکم

نیز یہ جاننا چاہیے کہ زمین بوسی اور رخسار یا جبین زمین پر رکھنے اور سجدہ کرنے کے احکام مختلف اور جداگانہ ہیں۔ شیخ الہند ترجمۂ مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

علماء، مشائخ اور امراء کے آگے زمین بوسی حرام ہے اور اس کا کرنے والا اور اس پر راضی رہنے والا ہر دونوں گناہ گار ہوں گے اور گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔ اور اگر اس فعل میں عبادت کا تصور شامل رہا تو کافر ہوں گے۔ اور اسی طرح اگر اصلاً کوئی بھی نیت مستحضر نہ تو بھی کافر ہوں گے۔ اکثر علماء کے نزدیک پیشانی یا رخسار زمین پر رکھنے سے کہیں زیادہ ہلکا اور سبک تر زمین بوسی ہے جیسا کہ ظہیریہ میں مرقوم ہے۔ انتہی

صاحب ''الاشباہ والنظائر'' فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کو سجدہ کرے اور اس کی نیت عبادت کی نہ ہوگی تو وہ کافر نہیں ہوگا۔ اس کی اصل آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ان کے بھائیوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہے۔

اور اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کے لیے سجدہ نہ کرنے پر قتل کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں سجدہ کا حکم اگر عبادت کے طریقہ پر ہو تو افضل یہی ہے کہ وہ آدمی صبر کرے جیسا کہ کسی شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے۔ اور اگر وہ سجدہ کا حکم، سلام و تحیت اور تعظیم و تکریم کے طریقہ پر ہو تو سجدہ افضل ہے۔

صاحب الاشباہ والنظائر کے قول ان سجد للسلطان الخ کے تحت علامہ حمویؒ

لکھتے ہیں کہ عینی نے ''مختصر الفتاویٰ الظہیر یہ'' میں لکھا ہے کہ ابو منصوری ماتریدنے فرمایا

جب کوئی شخص بادشاہ کے آگے زمین کو بوسہ دے یا اس کے لیے اپنی پشت جھکائے یا اس کے لئے اپنے سر کو جھکائے تو وہ کافر نہیں ہوگا کیوں کہ وہ ان افعال میں بادشاہ کی تعظیم و تکریم کا ارادہ کیا ہے نہ کہ اس کی عبادت کا۔

ابو منصور ماتریدی کے علاوہ دیگر مشائخ نے فرمایا۔ جب کوئی شخص ان ظالم اور جابر لوگوں کو تعظیم کی نیت سے سجدہ کرے تو اس کو گناہ کبیرہ کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ بعض نے کہا کہ سجدہ کرنے والا کافر ہو جائے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلق کافر ہو جائے گا۔ خواہ تعظیم کے لیے سجدہ کرے یا عبادت کی غرض سے۔

اور اکثر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم اسباب و وجوہ پر مبنی رہے گا۔ اگر وہ شخص سجدہ کے ذریعہ عبادت کا ارادہ کیا ہے تو کافر ہوگا۔ اور اگر سلام وتحیت اور تعظیم وتکریم کا ارادہ کیا ہے تو کافر نہ ہوگا۔ مگر یہ فعل اس کے حق میں حرام ہوگا۔ لیکن زمین بوسی سجدے سے قریب ہے مگر یہ فعل زمین پر رخسار و جبین رکھنے سے ہلکا اور سبک تر ہے۔ انتہی

بعض علماء نے اولیاء کرام کی درگاہوں کی چوکھٹ چومنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیل ۳۸ ویں فائدہ کے آخر میں آرہی ہے

شیخ الہند مدارج النبوۃ کی جلد اول اور شرح سفر السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ

سجدہ کی ایک دوسری قسم بھی ہے، جس کو سجدۂ تحیت کہتے ہیں۔ اور بعض فقہی روایات میں اس کی اجازت آئی ہوئی ہے اور مختار قول یہ ہے کہ سجدۂ تحیت بھی حرام اور مکروہِ تحریمی ہے

لیکن یہ روایت فقہیہ چوں کہ اجماع قطعی کے مخالف ہے، اعتبار کے قابل نہیں۔ لہذا ایک مسلمان کو ایسی باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس موضوع کے حق کی ادائیگی تو نو ویں فائدہ میں ہے۔ وہاں ملاحظہ کیجیے۔

(۵)

# خالق کے ساتھ صحبت کا حکم

نیز جاننا چاہئے کہ خالق اور مخلوق کے ساتھ صحبت کے آداب بہت ہیں۔ امام غزالی ''زاد الآخرت'' میں خالق کے ساتھ صحبت کے آداب کی بحث میں فرماتے ہیں:

دوستوں کے ساتھ صحبت اور ہم نشینی کے آداب سیکھنا ضروری ہے جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن وہ دوست جو ہمیشہ تیرے ساتھ ہے، وہ دوست جو ہمیشہ تیرے ساتھ سفر وحضر، خواب و بیداری اور موت وحیات میں ہے اور تیرا پیدا کرنے والا ہے اور تیرا مالک ہے اور جب کبھی تو اس کو یاد کرے تو وہ تیرے ہی ساتھ ہے۔ (اس کی صحبت کے آداب کا جاننا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔)

چناں چہ حدیثِ قدسی میں ہے: میں اس کا جلیس اور مصاحب ہوں جس نے مجھے یاد کیا۔ اور جب کبھی تیرا دل تیری تقصیر کے باعث اس کے حق میں شکستہ ہو جائے تو وہ تیرے ہی نزدیک اور پاس ہی ہے کیوں کہ اسی کا ارشاد ہے، میں شکستہ دلوں میں بسا ہوا ہوں۔

جب تو اس کو پہچان لے گا جیسا کہ پہچان کا حق ہے تو تُو اس کے علاوہ کسی اور کو اپنے ہمراہ نہیں رکھے گا۔ اور کسی کو اپنا دوست نہیں بنائے گا۔

اگر تو اس کے ساتھ تمام اوقات میں نہیں رہ سکتا ہے تو کم از کم یہ کوشش کر کہ شب و روز میں ایک ساعت اور ایک لحظہ اس کے ساتھ خلوت میں رہ اور اس کے ساتھ سرگوشی اور مناجات کر۔ اور تیرے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت میں رہنے کے آداب سیکھ لے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت کے آداب یہ ہیں:

اچھی طرح بیٹھ جیسا کہ تو تشہد میں بیٹھا ہے اور اپنی نگاہوں کو سامنے مرکوز رکھ اور

زبان کو خاموش رکھ اور دل کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر رکھ، اس طرح کہ تیرے دل میں اللہ کے سوا کسی چیز کا گزر اور بسر نہ ہو۔ اور اعضاء کو ساکت رکھ۔

اور تمام اوقات میں ملازم فرمان رہ۔ اور دل میں، جو بات بھی پیش آئے اس کی تقدیر پر اعتراض نہ کر۔ اور اسکی قضا وقدر سے راضی اور خوش رہ اور اللہ کے فضل وکرم پر تکیہ کر، اور اسی ذات پر اعتماد کر اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ تیرے حق میں تقدیرِ الہیٰ ء کا جو بھی فیصلہ ہوگا اس میں تیرے لیے خیر و بھلائی ہوگی۔ اور ہمیشہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں پر نادم اور شرمسار رہ اور اللہ کے جلال کی عظمت اور ھیبت سے شکستہ اور گرفتہ دل رہ۔

اور ضروری ہے کہ یہ تمام احوال اور کوائف ہمیشہ تیرے ساتھ ظاہر اور باطن میں پیوستہ رہیں۔ کیوں کہ یہ ایسی ذات کی صحبت کے آداب ہیں جو ہمیشہ تیرے ساتھ ہے اور تجھ سے کبھی جدا نہ ہوگی۔ اور دوسرے جو بھی ہیں وہ سب تجھ سے جدا ہو جائیں گے۔ انتہی

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۶)

# سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و آداب

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بہت ہیں، جو تمام پیغمبروں کے سردار اور تمام مرشدوں کے مرشد ہیں،۔ صاحب ''مواہب لدنیہ'' قسم ثالث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص فضائل اور کرامات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

نبی کریم کے مخصوص فضائل و آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی حدیثیں پڑھنے کے لیے غسل کرنا اور خوش بو لگانا مستحب ہے۔ احادیث کے پڑھنے اور سننے کے دوران

آوازوں کو بلند نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اپنی آوازوں کو پست رکھنا چاہیے۔ جس طرح آپؐ کی حیاتِ ظاہری میں جب آپؐ کلام فرماتے تو سبھی خاموش رہا کرتے تھے۔

پس بے شک آپؐ کا کلام آپؐ کی رحلت کے بعد بھی رفعت ومنزلت کے معاملہ میں آپؐ کی زبان مبارک سے سنے جانے والے کلام کے مانند ہے۔ اور احادیث کو اچھے اور بلند مقام پر پڑھنا چاہیے۔

مطرف سے روایت ہے کہ لوگ امام مالکؒ کے پاس آتے تو گھر سے باہر باندی نکل کر آتی اور کہتی کہ امام صاحب دریافت فرمارہے ہیں کہ آپ لوگ حدیث نبویؐ کا علم حاصل کرنے آئے ہیں یا فقہی مسائل پوچھنے کے لیے؟ اگر کہا جاتا کہ مسائل دریافت کے خاطر آئے ہیں تو امام موصوف اسی وقت گھر سے باہر نکل آتے اور فقہ کے مسائل اور احکام بتلا دیا کرتے اور اگر یہ کہا جاتا کہ علم حدیث حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں تو امام صاحب غسل خانہ میں داخل ہوتے اور غسل کرتے اور خوشبو لگاتے اور نئے کپڑے پہن لیتے اور عمامہ باندھ لیتے اور طیلسان ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جو خطبہ پڑھنے والے حضرات اپنے کندھوں پر ڈال لیا کرتے تھے، نامی چادر اوڑھ لیتے اور اس کے بعد باہر تشریف لاتے اور آپ کے لیے ایک مخصوص چوکی پیش کی جاتی، جس پر خشوع وخضوع کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے اور اس چوکی پر درسِ حدیث کے سوا کسی دوسرے موقع پر نہیں بیٹھتے تھے اور اس وقت تک عود جلایا جاتا تھا جب تک کہ آپ حدیث نبویؐ کی قرات اور تشریح سے فارغ نہیں ہوتے۔

ابن ابی ادریس فرماتے ہیں کہ امام مالک سے اس اہتمام اور انتظام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مین چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعظیم وتکریم کروں اور ممکنہ طہارت ونظافت کی حالت میں بیان کروں اور منقول ہے کہ ان آداب اور طریقوں کو امام مالک نے حضرت سعید بن میسّب سے سیکھا ہے۔ اور قتادہ، مالک

اور ایک جماعت نے طہارت کے بغیر حدیث بیان کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت، اعمش بغیر وضو ہوتے تو تیمّم کرنے کے بعد ہی حدیث بیان کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں۔ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وحرمت اور تعظیم و توقیر آپؐ کی وفات کے بعد بھی آپؐ کے ذکر اور آپؐ کی حدیث پاک کے ذکر و بیان اور آپؐ کے اسم مبارک اور آپؐ کی سیرت وشمائل سننے کے وقت بھی اسی طرح ہونی چاہیئے جس طرح کہ آپؐ کی حیاتِ ظاہری میں ہوتی رہی۔

اور آپؐ کے خصائص میں یہ بھی ہے کہ حدیث پڑھنے والے شخص کے لیے مکروہ ہے کہ وہ دورانِ قرآت میں کسی شخص کے لیے قیام کرے۔

ابنِ امیر الجاج ''مدخل'' میں فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی خاطر حدیث کے پڑھنے اور سننے کو منقطع کر دینا یہ ایک ایسا عمل ہے جو نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب واحترام میں کمی وقلّت اور آپؐ کے ساتھ بے توجہی ہے۔ پھر کیسے یہ عمل بدعت ثابت ہوسکتا ہے۔ اور سلفِ صالحین، حدیث کی تدریس اور سماعت کو منقطع نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اگر چہ کہ ان کے بدنوں کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے اور وہ ہر تکلیف ومشقت کو برداشت کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ محض اپنے نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام واکرام کے خیال سے تھا۔ تمہارے لیے یہی ایک نظیر کافی ہے کہ امام مالکؒ کو بچھو نے سترہ مرتبہ ڈنک مارا اور آپ نے حرکت تک نہ کی۔ اور آپ یہ ساری تکلیف حدیثِ نبویؐ کی تعظیم وتوقیر میں یہ سوچ کر سہتے رہے کہ وہ حدیث پڑھ رہے ہیں۔ حالاں کہ وہ بچھو کے ڈنک مارنے سے معذور تھے۔ پھر ایک بدعت کے لیے اٹھنا کیسے ضرورت بھی نہیں ہے۔ خصوصاً ایسا اٹھنا امورِ عادیہ میں سے بھی نہیں ہے۔ انتہی

شیخ الھند مدارج کے نویں باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابن مہدی فرماتے ہیں کہ

میں ایک روز امام مالک کے ساتھ مدینۂ منورہ میں وادی عقیق (جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ مقدس فرمایا کرتے تھے اور اس کا ذکر اشعار میں کثرت سے پایا جاتا ہے مترجم) کی جانب سے گزر رہا تھا کہ آپ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا تو مجھے منع کرتے ہوئے فرمایا: اس سوال سے پہلے تم میری نگاہوں یں بزرگ تھے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے متعلق سوال کرتے ہو۔ حالاں کہ ہم راہ چل رہے ہیں۔ (یعنی راہ چلتے ہوئے حدیث نبویؐ سے متعلق سوال وجواب نبی کریمؐ کے ساتھ ادب میں داخل نہیں ہے)۔

جریر بن عبدالحمید جو شہر کے قاضی تھے انہوں نے امام مالک کے کھڑے ہونے کی حالت میں حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق استفسار کیا تو آپ نے انہیں قید کرنے کا فتوی دے دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ شہر کے قاضی ہیں۔ فرمایا: قاضی اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ پہلے اس کو ادب سکھلایا جائے۔

ہشام بن عمار نے امام مالک کو کھڑے ہونے کی حالت میں حدیث سے متعلق سوال کیا آپ نے اس کو بیس کوڑے مارے۔ اس کے بعد شفقت سے پیش آئے۔ اور جس حدیثوں کو بیان کیا۔ اس پر ہشام نے کہا: مجھے یہ بات بھلی معلوم ہوتی کہ کاش مجھے اور زیادہ کوڑے مارتے تاکہ آپ اور زیادہ احادیث بیان کرتے۔

عبداللہ بن صالح سے منقول ہے کہ مالک اور لیث ہمیشہ باوضو احادیث لکھا کرتے تھے۔ اور یہ بات بہت ہی مشہور ہے کہ امام بخاری اپنی صحیح لکھنے کے وقت میں ہر حدیث کے لیے غسل فرماتے تھے۔ اور دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔ اور یہی اہتمام کتاب کے تراجم کے لکھنے میں بھی رہتا تھا۔ اور بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری آبِ زم زم سے غسل فرماتے اور مقامِ ابراہیم میں دوگانہ ادا کرنے کے بعد حدیث کو تحریر کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# (۷)

# اہلِ بیت کے حقوق و آداب

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کے حقوق اور آداب بھی بہت ہیں۔

صاحب تنبیہ الضالین فرماتے ہیں کہ خاتم المجتہدین ابن حجر مکی نے ”حسن التوسل“ میں لکھا ہے کہ اہلِ بیت کا ادب واحترام اور ان کا پاس ولحاظ اور رعایت کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے واجب ہے۔ کیوں کہ یہ قرابت نبوی سادات کرام سے رفض و بدعت کے صدور کی وجہ سے منقطع نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے باوجود بھی ان پر سب وشتم اور لعن طعن سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ ماں باپ کا نافرمان لڑکا وراثت سے محروم نہیں ہوتا اور نہ ہی نسب سے خارج ہوتا ہے۔ صدیقؓ اور فاروقؓ کے حق میں نیک گمان یہ ہے کہ ان کے قرابت داروں کی جانب سے ان کے حق میں جس کسی عیب چینی کا ظہور ہوا ہے اس کو معاف کردیا جائے۔

لہٰذا تم پر واجب ہے کہ سادات کرام کے ساتھ حسنِ ظن قائم رکھیں اور شفاعتِ محمدی دراصل اہل بیت کے گناہ گار افراد ہی کے لیے ہے اور ان سے گناہوں کی گندگی دور کی گئی ہے۔ اور بیت نبویؐ کے افراد نص قرآنی انما یرید اللہ الایۃ کی رو سے پاک و صاف ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اکابر اہل علم نے آیت تطہیر کا یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اہلِ بیت کا کوئی فرد دنیا سے نہیں جائے گا، جب تک کہ وہ رجسِ معنوی اور نجسِ باطنی سے پاک وصاف نہ ہوجائے اور یہ طہارت و نظافت بیماری یا دیگر آلام ومصائب کے ذریعہ ہوگی۔ اگر چہ کہ موت سے کچھ دیر قبل ہی کیوں نہ ہو۔

بعض اکابر اہلِ علم نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ ساداتِ کرام کے کسی فرد پر شرعی حد

واجب ہو جائے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ جس طرح کہ غلام اپنے آقا کے پاؤں کی نجاست کو دور کرتا ہے۔

مختصر فتوحاتِ مکیہ کے انتیسویں باب میں جس کا اختصار امام شعرانی نے کیا ہے۔ لکھا ہوا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد جو قیامت تک ہوگی وہ سب اس آیت: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس الایۃ کے حکم کے مطابق بخشش و معافی میں داخل اور شامل ہے۔ اور اہلِ بیت کے لیے یہ جو بزرگی اور شرف حاصل ہے اس کا حقیقی ظہور آخرت ہی میں ہوگا۔ کیوں کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد کا حشر مغفرت کے ساتھ ہوگا۔ لیکن دنیا میں ان میں سے کوئی شخص گناہ کر بیٹھے تو اس پر حد جاری کی جائے گی جیسے گناہ سے توبہ کرنے والا شخص حد شرعی سے بچ نہیں سکتا۔ جب حاکم کو یہ ثبوت مل جائے کہ ساداتِ کرام کے کسی شخص نے گناہ کیا ہے، یا چوری کی، یا شراب پی لیا تو وہ اس پر حد جاری کرے گا اگر چہ کہ اس کی مغفرت ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت ماعز بن مالکؓ صحابیِ رسول تھے لیکن جب ان سے زنا کا صدور ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کیا اور اس کی مذمت جائز نہیں ہے۔

اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ایک مسلمان اور مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس قول انما یرید اللہ الایۃ کی تصدیق کرنا لازم ہے اور یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اہلِ بیت کے اشخاص سے جو خطائیں اور لغزشیں صادر ہوتی ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو زیبا نہیں کہ وہ اہلِ بیت کی مذمت کریں اور ان کی عزت و آبرو لیں۔ جن کے تعلق سے خود اللہ نے شہادت دی کہ میں ان کو پاک و صاف کیا ہوں۔ اور نجاست سے دور کیا ہوں۔

اہلِ بیت کے افراد کو یہ مقام کسی نیک عمل کو انجام دینے سے نہیں ملا، یا اُن سے کچھ نیکی صادر ہونے کے باعث نہیں ملا۔ بلکہ ابتداء ہی سے ان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی

ہوی اور یہ خدا کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔

مولانا جامی سلسلۃ الذھب میں فرماتے ہیں:

ایک عارف باللہ کے نزدیک انما یرید اللہ لیذھب الایۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مراد رجس اور فساد سے اہلِ بیت کی تطہیر ہے۔ ذی عقل اور صاحبِ فہم اشخاص سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ رجس گناہوں میں بدترین گناہ ہے۔ جب رجس، ذلت اور عصیان ہے تو عفو اور مغفرت کے بغیر اس سے پاکیزگی نہیں ہوسکتی۔ لہذا سارے اہلِ بیت مغفور ہیں۔ اور آخرت کی عقوبات سے محفوظ ہیں۔ جب یہ افراد گناہ سے بری ہیں تو ان کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اور ان کو گناہوں سے معصوم بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے ان کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

اسی طرح کی تفصیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر میں بھی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیں۔ ابن حجر مکی نے صواعق میں یہ حدیث درج کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص میری آل کا حق نہ پہنچائے تو اس کا حق نہ پہنچانا۔ تین باتوں میں سے کسی نہ کسی ایک بات کی وجہ سے ہوگا۔ یا تو وہ منافق ہوگا یا ولدالزنا ہوگا۔ یا اس کی ماں کو حالتِ حیض میں حمل رہا ہوگا۔

اور امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ جو شخص اہلِ بیت کے ساتھ بغض وعناد رکھے وہ منافق ہے۔ اور دیلمی نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا سخت ترین عذاب ہوگا جس نے اہلِ بیت کا حق نہ پہچان کر، یا اُن کے ساتھ بغض وعناد رکھ کر یا ان کو ایذا دے کر، مجھے تکلیف دی۔

اور ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ جو شخص کسی سید کو حقارت کے خیال سے چھوٹا سید کہے تو وہ کافر ہے۔

نیز تنبیہ الضالین میں فرماتے ہیں کہ یہ بات قابل غور ہے کہ جب ایک گنہ گار سید کا ایمان اور احترام، قرآن وحدیث اور ائمہ کرام کے اقوال سے اس قدر ثابت ہے تو کسی جلیل القدر عالم باعمل سید کے ایمان اور احترام کا عالَم کیا ہوگا۔

شیخ فریدالدین عطار ''تذکرۃ الاولیاء'' میں فرماتے ہیں کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ درس کے دوران دس بارہ مرتبہ کھڑے ہوئے اور بیٹھ گئے تو آپ سے قیام کی وجہ دریافت کی گئی، فرمایا: ایک سید زادہ گیند کھیل رہا تھا اور ہر بار میرے سامنے آجاتا تو میں اس کی تعظیم اور تکریم کے لیے کھڑا ہوتا رہا۔ اس لیے کہ یہ بات نازیبا ہوگی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرزند آئے اور اس کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہو جاؤں۔

امام شعرانی بحر المواردمیں لکھتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ ہم ایک سید زادی سے نکاح کریں۔ جب کہ ہم نے اپنے آپ کو اس سید زادی کے خدام میں شمار کیا۔ اس لیے کہ وہ سید زادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جز اور حصہ ہے۔

شیخ الہند شاہ عبدالحق دہلوی، ''اخبار اخیار'' میں شیخ امان پانی پتی سے نقل کرتے ہیں کہ کامل محبت اور کمال الفت کی علامت یہ ہے کہ محبت اپنے محبوب سے تجاوز کر کے اس کے متعلقین کے ساتھ بھی قائم ہو جائے۔ لہذا حق تعالیٰ کے ساتھ کامل محبت کی علامت یہ ہوگی کہ اس کی محبت میں اس کے محبوب پیغمبرؐ کی متابعت کی جائے اور پیغمبر کے ساتھ محبت کی علامت یہ ہوگی کہ آپؐ کی محبت کے ساتھ آپؐ کے اہلِ بیت کے ساتھ بھی محبت کی جائے۔

منقول ہے کہ شیخ امان پانی پتی کے درس کے اوقات میں ساداتِ کرام کے بچّے کھیلتے کودتے آپ کے کوچہ میں آ پہنچتے تو آپ کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور یہ بچے جب تک وہاں کھیلتے رہتے آپ کو بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

نیز شیخ الہند اخبار اخیار میں لکھتے ہیں کہ قاضی شہاب الدین عمر دولت آبادی نے

مناقبِ سادات کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اہلِ بیت کے ساتھ محبت و عقیدت کا حق ادا کیا ہے۔ انشاء اللہ یہ چیز ان کے لیے آخرت میں سرمایۂ سعادت اور نجات کی پونجی ہوگی۔

انہوں نے اس تصنیف کا سبب یہ بیان کیا کہ قاضی صاحب کے زمانے میں سید اجمل نامی ایک سید تھے جن کا شمار اکابر وقت میں ہوتا تھا لیکن ان کا جمال نسب علم و فضل کے زیور سے خالی تھا۔ غالبًا قاضی صاحب کو ان کے ساتھ امراء و سلاطین کی بعض مجلسوں میں تقدیم و تاخیر کے معاملہ میں نزاع ہوگئی تھی۔

قاضی صاحب اولاً اس بات کے قائل تھے کہ ایک بے علم جاہل سید کے مقابلہ میں ایک عالم کو فضیلت و برتری اور فوقیت و اولیت کا شرف حاصل ہے پھر اس کے بعد ایک غیر سید عالم اور بے علم سید کے درمیان برابری کے قائل ہو گئے اور اس موضوع پر یہ کتاب تحریر کی۔ جس میں انہوں نے وضاحت کی کہ ہماری عالمیت ایک امر یقینی ہے اور تسلیم شدہ حقیقت ہے اور تمہاری سیادت غیر یقینی اور مشکوک ہے۔ لہذا ہمیں تمہارے اوپر فوقیت و برتری اور ترجیح ثابت ہے۔ قاضی صاحب کے اس نقطۂ نظر سے اُن کے استاد ناخوش اور ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے قاضی صاحب کی طبیعت منحرف ہوگئی اور وہ اپنے اس نقطۂ نظر سے رجوع کر گئے اور سادات کرام کے فضائل و مناقب میں یہ کتاب لکھی اور ان کی نوک قلم سے جو باتیں نکلیں ان سے معذرت پیش کی۔ بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحب نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ انہیں اس نقطہ نظر پر زجر و تنبیہ فرما رہے ہیں اور سید اجمل کی خوش نودی حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص دلا رہے ہیں۔ قاضی صاحب خواب سے بیدار ہو کر سید اجمل کے پاس پہنچے اور ان سے معافی چاہی اور توبہ کی اور یہ رسالہ تصنیف کیا۔ انتہی

جب نفسِ سیادت اور سادات کرام کی عوام کا یہ مقام ہے تو سادات کے اہل علم و

کمال کا مقام کیا ہوگا؟ جو ساری دنیا کے امام اور مقتدا ہیں۔ اور جمہور سلاسل ان ہی حضرات کی جانب لوٹتے ہیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''ہمعات'' میں نسبت اویسیہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ہر سرِّ الٰہی جو اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے، لامحالہ اسی عالم سے اس کی ایک خاص جسم و صورت ہوتی ہے جو سرِّ الٰہی کے ساتھ جاری رہتی ہے اور اس اعتبار سے عالم غیب کی توجہ اس شخص میں متشکل اور متشخص ہوتی ہے اور انسان کے اس مثالی قد و قامت کی عظمت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پہلا شخص جس نے انجذاب کا دروازہ کھولا اور اس منزل میں قدم رکھا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور اسی لیے طریقت کے تمام سلسلے آپؓ کی جانب راجع ہیں۔ اور فی الحقیقت آپؓ کی طرف اولیائے کرام کے سلاسل کا رجوع روایت کی جہت سے ثابت نہیں ہے اور حضرت حسن بصری کو آپؓ کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہے۔ کیوں نہیں معلوم۔ اس کے باوجود حضرت علیؓ کی جانب جمیع سلاسل کے رجوع کرنے پر صوفیاء کے طبقے یکے بعد دیگرے متفق ہیں اور یقیناً صوفیاء کا یہ اتفاق بے وجہ نہیں ہے۔ اور وہ وجہ فقیر کے نزدیک یہ ہے کہ حضرت علیؓ اس امت کے اندر پہلے صاحب انجذاب ہیں۔ اور امت کے اولیاء اور طرق و سلاسل کے اصحاب میں سب سے زیادہ طاقت ور اور قوی تر شخص حضرت غوثِ پاکؒ ہیں۔ جنہوں نے موکد وجوہ کے ساتھ راہِ جذب کے اتمام کے بعد اس نسبت کے اصل کی طرف میلان رکھا اور اس راہ میں کامل و مکمل طریقہ سے قدم رکھا ہے۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ حضرت غوث پاکؒ اپنی مزار میں زندوں کی طرح تصرف فرما رہے ہیں اور اس فقیر کو آگاہ فرمایا گیا کہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ صوفی جذب کے بعد ہی

نسبت اویسیہ کے جوہر حاصل کے رنگ سے رنگین ہو جائے۔

نیز ملت مصطفویہ میں خصوصاً اس دور میں کوئی شخص ان دو (حضرت علیؓ اور حضرت غوثِ پاک) بزرگوں سے زیادہ خرقِ عادت کے باب میں مشہور نہیں ہے۔

یہ بات اس حقیقت کی متقاضی ہے کہ عالم غیب کی توجہ اپنی طرف ان دو بزرگوں میں متشکل دیکھے۔

حاصلِ کلام یہ اسباب اس بات کے متقاضی ہیں کہ آج کے روز اگر کسی شخص کو کسی خاص بزرگ کی روح سے مناسبت پیدا ہو جائے تو وہ ان کی روح سے فیض حاصل کرتا ہے۔ غالباً یہ بات بعید نہیں کہ یہ فیض حضرت امیر المؤمنین علیؓ اور حضرت غوثؒ جیلانی کی نسبت سے ہو۔

شیخ الہند ترجمہ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ جب کبھی عبداللہ بن عمرؓ، اور دیگر صحابہ کرام سواری کی حالت میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تو نیچے اتر پڑتے اور جب کبھی حضرات حسنین کو سواری پر دیکھتے تو ان کے رکاب کو بوسہ دیتے تھے۔

مولانا باقر آگاہ مدراسی "ریاض الجنان" میں لکھتے ہیں

اور ہو کے سوار جب شیخین — جاتے کوی راہ میں یا کہ ذی النورین
اور عباس و مرتضٰی اے یار — ہوتے تھے اوں دونوں سی رہ میں دوچار
جلد او ترتی تھی تینوں کب سی — اور چلتی پیادہ سات اونکی
اور ہوتا تھا جب سوار حسن — وہ حبیب خدا کا من موہن!
ابنِ عباس اور دِگر اصحاب — آ پکڑتی تھی اوس کی دو تو رکاب
اور چلتی تھی اوس کی کچھ ہمراہ — بوجتی اوس میں اپنی عزت و جاہ

اور رسالہ ہشتم (۸) ''ہشت بہشت'' میں کہا ہے:

اور شافعی وہ امامِ امت | تھی جس سے قوی نبی کی ملت
رکتا تھا حبّ آل اطہار | یہاں تک کہ خوارج تبہ کار
کرتی تھی برفض اوس کو منسوب | بہت اوس سی ہے اس میں نظم مرغوب
کرتا ہوں بشوقِ دل بیاں میں | دو بیت کا ترجمہ یہاں میں
ای آلِ رسول ذی المناقب | الفت ہے تمہاری سب پر واجب
قرآن میں حق کہا ہے یہی بات | پس تم کو یہہ قدر ہو مباہات
کہ جو نہ پڑھے درود تم پر! | ہی اوس کی نماز تار واتر

☆☆☆☆☆☆☆☆

## (۸)

# مرشدِ کامل کے حقوق و آداب

نیز واضح ہو کہ مرشدِ کامل کے حقوق و آداب بہت ہیں۔ امام ربانی رسالہ ''مبداو معاد'' میں تحریر فرماتے ہیں:

علم کی شرافت اور علم کا مرتبہ، معلوم کی شرافت اور اس کے مرتبہ کے مواقق ہوتا ہے معلوم جس قدر شریف تر ہوتا ہے اس کا علم بھی اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔

پس علم باطن جس سے صوفیاء ممتاز ہیں، علم پارچہ باقی وغیرہ سے۔ علم ظاہر سے اشرف ہوگا۔ جو علمائے ظاہر کا حصہ ہے جیسا کہ علم ظاہر کی بزرگی و شرافت سے بہت اونچی ہے۔

پس مرشد جس سے علم باطن حاصل کیا جاتا ہے اس کے آداب کی رعایت، استاذ کے آداب کی رعایت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگی۔ جس سے علم ظاہر سیکھا جاتا ہے اسی

طرح علم ظاہر کے استاذ کے آداب کی رعایت، فنِ حجامت و حیاکت کے استاذ کے آداب کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔

اور یہی فرق علم ظاہری کے اصناف میں جاری ہے۔ علمِ صرف ونحو کے استاذ سے علم کلام وفقہ کا استاذ اولیٰ ہے۔ اور علمِ صرف ونحو کا استاذ، علم فلسفہ کے استاذ سے اولیٰ ہے۔ کیونکہ علوم فلسفہ علوم معتبرہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے اکثر مسائل لا حاصل اور بے فائدہ ہیں۔ بہت ہی کم مسائل وہ ہیں جو کتب اسلامیہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ اور ان میں بھی تصرفات کئے گئے ہیں اور وہ بھی جہلِ مرکب سے خالی نہیں ہیں کہ عقل اس میدان میں جولانیاں بتا نہیں سکتی۔ ظہور نبوت عقل ونظر کی پہنچ سے ماوراء ہے۔

جاننا چاہئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے انعامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کے بعد مرشد کے حقوق تمام دوسرے حق داروں کے حقوق پر فوقیت رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کو مرشد کے حقوق سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام کے مرشد حقیقی ہیں۔

ہر چند کہ جسمانی ولادت والدین سے ہے لیکن معنوی ولادت مرشد کے ساتھ مخصوص ہے، جسمانی ولادت کی زندگی چندروزہ ہے۔ ولادتِ معنوی کی زندگی دائمی اور ابدی ہے۔

اور یہ مرشد ہی ہے جو مرید کی معنوی نجاستوں کو اپنے قلب وروح کے ذریعہ دور کرتا ہے اور اس کے باطن کو پاک وصاف کرتا ہے۔ بعض مریدوں کے حق میں جو توجہات ہوتے ہیں ان میں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نجاستِ باطنی کی تطہیر میں کچھ آلائش صاحبِ توجہ (مرشد) کو لاحق ہوتی ہے جس کا اثر کچھ مدت تک رہتا ہے۔ مرشد ہی ہے جس کے وسیلہ سے (مرید) اللہ عزوجل تک پہنچتا ہے اور یہ (خدا تک پہنچنا) تمام دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے بلند تر ہے۔ مرشد ہی ہے جس کے وسیلہ سے نفس امّارہ (جو اپنی ذات سے گندہ اور خبیث

ہے) پاک اور مطہر ہو جاتا ہے اور وہ (نفس) امّارہ کے مقام سے مطمئنہ تک پہنچتا ہے اور کفر طبعی سے نکل کر اسلام حقیقی میں آجاتا ہے۔

"گر بگویم شرح ایں بے حد شو" (ترجمہ) اگر میں اس کی شرح کروں تو بے حد و بے انتہا ہوگی۔ جاننا چاہئے کہ مرشد کی قبولیت میں سعادت ہے اور مرشد کو ردوانکار کرنے میں شقاوت ہے نعوذ باللہ من ذلک۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی، مرشد کی رضا و خوش نودی میں پوشیدہ ہے۔ جب تک مرید اپنے مرشد کی مرضی اور خوش نودی میں اپنے آپ کو گم نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل نہیں کرتا۔ مرشد کو آزار و تکلیف دینے میں مرید کے لیے آفت ہے۔ اس کے بعد جو ذلّت بھی ہو اس کا تدارک ممکن نہیں ہے لیکن مرشد کو آزار دیے جانے کا کسی چیز سے تدارک ممکن نہیں۔ مرشد آزاری، مرید کے لئے شقاوت کی جڑ ہے۔ العیاذ باللہ سبحانہ من ذلک

معتقداتِ اسلامیہ میں خلل اور احکام شرعیہ پر عمل میں قصور اس مرشد آزاری کے ثمرات و نتائج ہیں۔ احوال و مواجید کا تعلق تو باطن سے ہے۔ ان کا کیا حال بیان کیا جائے اگر اتفاقاً مرشد آزاری کے باوجود ان احوال کا کوئی اثر باقی رہے تو اس کو استدراج سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ مرشد کو ایذا و تکلیف پہنچانا آخر کار تباہی اور خرابی کا باعث ہوگا اور نقصان و خسران کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

☆☆☆☆☆☆☆☆

# (۹) آدابِ عالم

نیز جاننا چاہیے کہ امام غزالیؒ زادالآخرت میں فرماتے ہیں:

''عالم کے آداب یہ ہیں کہ اگر وہ واقعی اہلِ علم سے ہوگا تو اس کا ادب یہ ہے کہ وہ فراخ حوصلہ، بردبار اور نیک خصلت ہوگا اور اس کی نشست و برخاست، باوقار اور عزت و حرمت کے ساتھ ہوگی۔ سر آگے جھکا ہوا ہوگا، مگر بر سبیل تکبر نہیں بلکہ بر سبیلِ ہیبت و حرمت۔ مخلوق میں سے کسی شخص کے ساتھ تکبر نہیں کرے گا۔ مگر ظالموں کے ساتھ تکبر کے ساتھ پیش آئے گا۔۔ تاکہ انہیں اور ان کے جور و ستم کو لوگوں کی نگاہ میں حقیر و ذلیل قرار دے۔ مجلسوں میں صدارت کا خواہاں اور جویاں نہیں رہے گا۔ کیوں کہ ایسی خواہش کرنا تکبری ہے۔

مسخرے پن اور کھیل تماشہ کی عادت نہ ڈالے کیوں کہ اس سے لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت و عظمت ختم ہو جائے گی۔ شاگردوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور کوئی طالب علم اس سے سوال کرے تو جھڑکی نہ دے۔ اگر سوال میں کوئی خلل ہو تو اس کی اصلاح کرے! اور س پر غصہ کا اظہار نہ کرے اور اگر کوئی چیز خود نہ جانتا ہو تو اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کو ننگ و عار خیال نہ کرے اور اگر کوئی شخص اس کی کسی غلطی پر دلیل و حجت کے ذریعہ آگاہ کرے تو قبول کرنے کو عار نہ سمجھے اور پھر اپنی بات واپس لے لے۔ اور شاگرد کو ایسے علم سے منع کرے جو اس کے لیے نقصان و زیان کا باعث ہو۔ اور اس کو نفع بخش اور سودمند علم میں مشغول کرے۔ اور یہ سودمند علم فرضِ عین ہے نہ کہ فرض کفایہ، اور وہ علم جو فرضِ عین ہے علمِ تقوٰی ہے، جو اس کے ظاہر و باطن کو ناشائستہ صفات سے پاک و صاف کرتا ہے۔ اور احکامِ خداوندی سے اس کو آراستہ کرتا ہے اور اس کو دنیا سے آخرت کی جانب راغب و متوجہ کرتا ہے اور حرص و طمع سے پاک کرتا ہے۔ اور عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرے کیوں کہ گفتارِ بے کردار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۰)

# آدابِ متعلم

نیز جاننا چاہئے کہ امام غزالیؒ زادالآخرت میں لکھتے ہیں کہ:

استاذ کے ساتھ شاگرد کے آداب یہ ہیں کہ وہ سلام میں پہل کرے، اوراس کے روبرو بات چیت بہت مختصر کرے اوراپنی طرف سے گفتگو کی ابتدا نہ کرے اور نہ کوئی مسئلہ پوچھے جب تک کہ بات چیت کرنے اور سوال پوچھنے کی اجازت نہ لے۔اور جب استاذ جواب دے تو اس پر اعتراض نہ کرے، اور یوں نہ کہے کہ فلاں شخص اس کے برخلاف یہ کہتاہے اور یوں نہ کہے کہ اس کے برخلاف یہ بات بہت درست ہے۔اوراس کے سامنے کسی شخص کے ساتھ چپکے چپکے کوئی راز کی بات نہ کہےاوراس کے سامنے نگاہیں نیچی رکھےاور اگراستاذ کوئی بات کہےتو اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کرے۔ادھر اُدھر نہ دیکھے۔اورادب واحترام کے ساتھ نماز کی حالت کے مانند بیٹھے۔ جب استاذ ملول ہوتو مسائل کا پڑھنا اور پوچھنا دوسرے وقت کے لیے اٹھار کھے۔ جب وہ اٹھ کھڑے ہوں تو بات ختم کردے۔اوراس کے ساتھ ساتھ چل پڑےاورراہ چلتے چلتے کوئی سوال نہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ گھر پہنچ جائے اور اگراس سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھنے میں آئے تواس کے ساتھ بداعتقاد نہ ہوں۔ بلکہ یہ خیال کرے کہ وہ ہم سے زیادہ بہتر جانتا ہےاوراس کے نزدیک اس چیز کے متعلق کوئی توجیہ ہوگی جس تک میرا علم نہ پہنچتا ہو۔اور حضرت موسیٰؑ وخضر علیہما السلام کے واقعہ کو یاد کرلے کہ کس طرح کشتی میں سوراخ ڈالنا، حضرت موسیٰؑ کو منکر نظر آیا لیکن حضرت خضر کے علم میں وہ فعل منکر نہ تھا۔لہٰذا بزرگانِ کرام سے جو بھی اقوال اورافعال سننے اوردیکھنے میں آئیں توان سے

متعلق ایسا ہی خیال کرے۔ انتہی

محمد خلیل بدخشانی ''معارف العلوم'' کی دوسری فصل میں لکھتے ہیں کہ:

شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاد کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے۔ چارزانو اور دونوں قدم کھڑا کر کے سرین کے بل نہ بیٹھے اور اس سے دو ہاتھ یا اس جیسے فاصلہ پر بیٹھے۔ اور اتنی دوری ہو کہ وہ استاذ کی آواز کو بخوبی سن سکے، کیوں کہ شاگرد کو استاذ کے سامنے بلند آواز کے ساتھ بات چیت کرنا منع ہے۔ اس مسئلہ کو کتاب القضاء کے حوالے سے محیط کی چوتھی فصل میں بیان کیا گیا ہے۔

نیز اسی کتاب معارف العلوم میں متعلیمن کی تعلیم اور استاذ کی تعظیم وتوقیر اور اس کی اولاد کی تعظیم وتوقیر اور اس کے متعلقین سے متعلق لکھتے ہیں: کہ

ہمارے استاذ شیخ الاسلام برہان الدین مصنف ''ہدایۃ'' حکایت بیان کرتے ہیں کہ بخاری کے جلیل القدر ائمہ کرام میں سے ایک امام مجلس درس میں تشریف فرماتھے اور وہ کبھی کبھی دورانِ درس میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میرے استاذ کے صاحب زادے گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور کبھی کبھی مسجد کے دروازے تک آجاتے ہیں۔ جب بھی میری نظر ان پر پڑتی ہے تو میں اپنے استاذ کی تعظیم کے خیال سے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

نیز اسی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ شاگرد اپنے استاد کی جگہ پر اس کی موجودگی اور غیر موجودگی میں بھی نہ بیٹھے اور اس کے سامنے نہ ہنسے اور نہ اس کے سامنے اپنی آواز بلند کرے اور نہ اس سے کسی بات پر جھگڑا کرے بلکہ اس کی باتوں کو تسلیم کرے۔ بات چیت میں اور چلنے میں اپنے استاذ سے سبقت نہ لے جائے۔ جیسا کہ ''خلاصہ'' اور ''عمدۃ'' میں مرقوم ہے اور جب استاذ شاگرد کو اپنے آگے چلنے کا حکم دے۔ اور اس کے علاوہ وہ امور جو

شاگرد کے حق میں ممنوع ہیں ان کو بجالانے کا حکم دے تو ایسی صورت میں تعمیلِ حکم کے تحت بات کو مان لے کیوں کہ اس کے حکم پر عمل کرنا ادب سے بھی بڑی چیز ہے۔الامر فوق الادب

مولوی باقر آگاہ مدراسی ''احسن التبیین'' میں لکھتے ہیں:

استاذ کے حق کی ادائیگی کی کیفیت اور شکل یہ ہے کہ اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اس کی تعظیم اور توقیر کا پورا پورا خیال رکھے۔اگر استاذ کی غیر موجودگی میں کوئی شخص اس کا ذکر بدی اور برائی سے کرے تو اپنی طرف سے خفگی اور ناراضگی کا اظہار کرے اور مذمت اور برائی کرنے والے کو اس کی بدگوئی کے مقدار میں زجر و تنبیہ کرے اور مذمت کنندہ کی تنبیہ اور تہدید پر قدرت نہ ہو تو اس مجلس سے نکل جائے۔اور اگر کوئی شخص استاذ کی بدی اور مذمت کے علاوہ کوئی بات کہے یا کوئی بدعتی استاذ کے کلام پر کوئی تردید لکھے تو شاگرد میں اگر جواب دینے کی قدرت ہو تو اسکی تردید لکھے اور اس بات کو استاذ کے آگے بیان نہ کرے۔ ہاں خیر خواہی کے خیال سے تنہائی میں استاذ کے سامنے اس بات کو بیان کردے تو کوئی مضائقہ نہیں اور مخالف و بدعتی کے کلام کو جابجا مجلسوں میں بیان نہ کرے۔اور استاذ کی ساری زندگی تک سلامتی اور عافیت کی دُعا کرتے رہے اور اس کی وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کو اپنے اوپر لازم کرلے۔اور جس قدر ممکن اور سہولت ہو اس کے نام سے صدقہ کرے۔اور اس کی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرے اور اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کرے۔اور ان شہروں میں یہ معمول بن گیا کہ دو تسلیم عرفی بجالاتے ہیں۔تحصیل علم کا دور ختم ہونے کے بعد استاذ کے پاس اپنی آمد و رفت بند نہ کرے بلکہ جب بھی فرصت ملے اس کی خدمت میں چلا جائے۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ استاذ کے روبرو عاجزی اور فروتنی کے ساتھ دوزانو ہو کر بیٹھے جیسا کہ حدیث جبرئیل سے اس کی نشان دہی اور آگہی ہوتی ہے اور اس کی جانب،

دل کی توجہ کے ساتھ کان لگا کر اور فرصت کے لمحات میں وضاحت کے لئے کہے، نظریں جھکا کر متوجہ رہے تا کہ اس کے کلام کو اچھی طرح اخذ کر سکے اور ضبطِ ذہن نہ ہونے کی صورت میں دوبارہ وضاحت کے لیے نہ کہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(١١)

# والدین کے ساتھ فرزند کے آداب

نیز جاننا چاہیے کہ ماں اور باپ کے ساتھ فرزند کے آداب بہت ہیں۔ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں لکھتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ بیٹے کے آداب یہ ہیں کہ والدین جو بھی کہیں غور سے سنیں اور ان پر نظر پڑتے ہی اٹھ کھڑا ہو جائے اور اُن کے آگے نہ چلے اور وہ جو بھی حکم دیں اس کو بجالائے اگر اس میں کسی گناہ و معصیت کا پہلو نہ ہو۔ اور اپنی آواز کو اُن کی آواز سے بلند نہ کرے۔ اور جب بھی وہ پکاریں فوراً لبیک کہے اور ان کی رضا و خوشنودی کا متمنی اور حریص رہے۔ اور ہمیشہ خود کو ان کے آگے پست و عاجز بنائے رکھے۔ اور ان لمحات کو کبھی فراموش نہ کرے جب کہ وہ گہوارہ میں مقید تھا تو والدین نے بڑے ناز و نعم کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کے لیے راتوں کو اپنی میٹھی نیند قربان کر دی تھی۔ تو وہ آج کے روز جوانی کیا اس درجے پر آ پہنچا ہے۔ اُن کے ساتھ سلوک اور رعایت کرنے کو احسان نہ خیال کرے اور ان کی طرف غصہ و ناراضگی سے نہ دیکھے اور نہ چہرے پر جھریاں ڈالے اور ان کی اجازت کے بغیر سفر نہ کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۲)

# بھائیوں اور دوستوں کی صحبت کے آداب

بھائیوں اور دوستوں کی صحبت کے آداب دوسرے ہیں۔ امام غزالیؒ زاد الآخرت میں دوستوں اور بھائیوں کی صحبت و ہم نشینی کے آداب میں تحریر فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ برادرانہ اور دوستانہ تعلقات قائم نہ کرلو جب تک کہ اس کے اندر دوستی کے شرائط اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کا جائزہ نہ لے لو۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوست کے دین، عادات، اطوار، اخلاق اور معاملات وغیرہ پر ہوتا ہے۔ لہذا غور کرو کہ تم کس کے ساتھ دوستی کر رہے ہو۔ تم جس کسی سے بھی دوستی کرو اس میں پانچ صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

اول یہ کہ یہ شخص صاحبِ عقل و فہم ہو کیوں کہ احمق کی صحبت سے کسی طرح کی بھلائی اور بہتری حاصل نہیں ہوگی۔ اور آخر کار وحشت و حیرانی ہوگی۔ اور ترکِ تعلقات کی نوبت آ جائے گی۔ احمق کے ساتھ دوستی کی سب سے بہتر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرے اور وہ اسی جذبہ کے تحت ایسا کام کر بیٹھتا ہے کہ جس سے تمہیں نقصان و زیاں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ جانتا بھی نہیں کہ اس کام کی وجہ سے تمہیں کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مثل مشہور ہے نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔

دوم یہ کہ وہ شخص نیک خصلت اور اچھی عادت کا مالک ہو۔ کیوں کہ بری عادت والے کے ساتھ دوستی بہت دشوار ہے اور اس کے ساتھ گزر بسر نہیں ہوگا اور اس کی بدخوئی یہ

ہوتی ہے کہ حرص اور غضب کے وقت اپنے آپ میں نہیں رہتا۔

اسی لیے یہ کہا گیا کہ دوستی ایسے شخص کے ساتھ کرو جس کے ساتھ مل بیٹھنے سے تمہیں آرام و آسائش حاصل ہو۔ اور کام کے وقت میں وہ تمہارا معاون و محافظ ہو اور ضرورت و حاجت کے وقت وہ تمہارے لیے خزانہ ثابت ہو۔

دوستی ایسے شخص کی اختیار کرو کہ اگر تم کوئی کام کرو تو وہ تمہارا ساتھ دے اور تمہارے اندر کوئی نیکی دیکھے تو اس سے متاثر ہو اور تمہارے اندر کوئی برائی اور عیب دیکھے تو اس کو چھپا دے۔

دوستی ایسے شخص کی اختیار کرو کہ اگر تم کوئی بات کرو تو وہ تمہاری تصدیق کرے۔ اگر کوئی کام پیش آئے تو تمہیں اپنا امیر بنائے اور تم کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچے تو خود کو تمہارے لیے سپر بنائے اور کوئی راحت پہنچے تو تم پر ایثار کرے اور یہ دعوٰی نہ کرے کہ راحت میرا حصہ ہے۔

علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

برادرِ حقیقی تو وہ ہوتا ہے جو تمام کاموں میں تمہارے ساتھ رہے اور تمہارے نفع کے واسطے خود رنج و مشقت اٹھائے اور اگر تمہیں کوئی ضرورت پیش آئے تو اپنی ضرورت کو چھوڑ کر تمہاری ضرورت کو پورا کرے۔

سوّم یہ کہ اس کے اندر نیکی اور صلاح کی صفت ہو، کسی مفسد اور فاسق شخص کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اس کے شر اور فتنہ سے تم بچ نہیں سکتے، اس لیے کہ جب اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ بھی بدل جاتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ کسی کبیرہ گناہ پر ہمیشگی اختیار نہیں کرتا بلکہ گناہ کا دیکھنا بھی نقصان و زیاں کا باعث ہوتا ہے، اگر چہ کہ تم دل میں گناہ کو ناپسند کرتے ہو لیکن جب

بہت سارے گناہوں کو دیکھتے رہو گے تو دل بھی اس گناہ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور تم پر اس گناہ کا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غیبت کرنا، نیک لوگوں کے لیے سونے کی انگوٹھی اور ریشم کا لباس پہننے سے زیادہ آسان ہے۔ حالاں کہ غیبت بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن غیبتیں سُن سُن کر اور غیبت کرنے والوں کو دیکھ دیکھ کر، تمہارے لیے بھی غیبت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

چہارم یہ کہ اس کے اندر دنیا کی حرص و طمع نہ ہو کیوں کہ ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنا جس کے اندر دنیا کی محبت ہو، زہرِ قاتل ہے۔ جو شخص زاہدوں کی صحبت میں رہتا ہے تو اس کے دل میں دنیا حقیر ہو جاتی ہے اور جب قاتل دنیا داروں کی صحبت میں رہتا ہے تو اس کے دل میں دنیا شیرین و محبوب ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی خود غرض دنیا دار بن جاتا ہے۔

اور آدمی کی طبیعت دوسروں کی ریس کرنے کی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر ایک استر کو دوسرے استر کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو وہ ہم رنگ ہو جائیں گے۔ اسی طرح ایک دوست کی خصلت دوسرے دوست کی عادت بن جاتی ہے۔ کیوں کہ آگ کے نزدیک رہنے والی چیز اس کی حرارت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور دونوں ہم رنگ اور ہم خصلت ہو جائیں گے۔

پنجم یہ کہ اس کے اندر راست گوئی کی عادت ہو۔ کیوں کہ دروغ گو کی صحبت سے کوئی راحت اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جو بھی کہتا ہے اعتماد اور بھروسہ کے قابل نہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خصلتیں اور عادتیں ایک ہی شخص میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ اگر یہ ساری باتیں کسی شخص میں تلاش کرتے رہیں تو ایک دوست بھی نصیب نہیں ہوگا اور تنہا زندگی گزارنا پڑے گا۔ یا ہر شخص کے ساتھ اس کی خصلت اور عادت کے مطابق دوستی

کرنی ہوگی۔

دوست تین ہیں : ایک دوست آخرت کے واسطے ہے۔

ایسے دوست میں دین اور ورع وتقویٰ کے سوا کوئی دوسری چیز تلاش نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرا دوست دنیا کے واسطے ہے اس میں نیک خو اور اچھی خصلت اور مفید عادت تلاش نہیں کرنی چاہیے۔اور تیسرا دوست انس ومحبت اور زندگی گزارنے کے واسطے ہے۔ایسے دوست پر نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ تم اس کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ سکیں۔

کہا گیا ہے کہ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ایک غذا کی طرح ہیں، جن سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔دوسرے دوا کی طرح ہیں جن کی کبھی کبھی ضرورت پیش آتی ہے۔

تیسرے بیماری کی طرح ہیں جو کسی کام کے نہیں۔ جب اس قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آجائے تو صبر کرنا چاہیے۔اور ان کی خاطر مدارات کرنی چاہیے تاکہ ان سے پیچھا چھڑا سکیں۔اور اس قسم کے لوگوں کی صحبت بھی فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ عقل مند شخص جو بھی برائی دیکھتا ہے اس سے خود کو علاحدہ کر لیتا ہے۔نیک بخت آدمی وہ ہے جو دوسروں سے پند و نصیحت حاصل کرے۔ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔یعنی ہر اچھائی اور برائی کا جائزہ دوسرے شخص کی اچھائی اور برائی سے لیا جاتا ہے۔عیسی علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ آپؑ نے ادب کس سے سیکھا؟ جواب دیا ہر ہر آدمی سے۔کیوں کہ جس شخص میں بھی مجھے کوئی برائی نظر آئی تو میں اس برائی کو برا سمجھنے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر لوگ دوسرے میں کوئی برائی دیکھیں اور اس برائی سے کنارہ کش اختیار ہونے لگیں تو خود بخود با ادب اور با اخلاق ہو جائیں گے۔

(۱۳)

# مجہول اشخاص کی صحبت کے آداب

نامعلوم اشخاص کی صحبت کے آداب دوسرے ہیں۔

امام غزالی ''زاد الاخرت'' میں لکھتے ہیں کہ :۔ غیر متعارف اور پراگندہ حال اشخاص کے ساتھ صحبت کے آداب یہ ہیں کہ ان کی گفتگو میں شامل نہ رہو۔ اوران کی نا ئشتہ باتوں کو نہ سنواوران باتوں کودوسروں کے سامنے نہ بیان کرواوران کی ناہموار باتوں سے خود کوعلاحدہ رکھو۔ اورکوشش کروکہ تم ان کے حاجت مند نہ رہو۔ اوران سے ربط وضبط اور تعلق کم رکھو۔ اوران کی نائشستہ حرکت یا بے ہودہ بات دیکھواور سنوتو لطف ومہربانی کے ساتھ نصیحت کرو۔ اگر تمہیں امید ہوکہ وہ قبول کرلیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۴)

# لوگوں کے ساتھ صحبت و آداب

امام غزالیؒ ''زاد الآخرت'' میں فرماتے ہیں کہ ایک حکیم نے اپنے شاگرد کو یہ آداب سکھلائے اور وصیت کی کہ تمہیں چاہیے کہ جب تم لوگوں کے ساتھ بیٹھواٹھوتو دوست اور دشمن کے ساتھ خود کو خندہ رواور کشادہ ابرو رکھو، اورلوگوں کے ساتھ رعایت وحسنِ سلوک اور لطف ومہربانی سے پیش آؤ، نہ اس طرح کہ خود کو ذلیل وخوار کرو، لیکن وقار و بردباری اور تواضع وانکساری کے ساتھ تکبر ومذلت کے بغیر رہو۔ اورتمام کاموں میں اعتدال اورمیانہ روی اختیار کرو۔ نہ اس طرح افراط اور تقصیر سے کام لو کہ اس میں بھی حد سے متجاوز جاؤ۔ اور جب راہ چلوتو خودنمائی سے بچو۔ اورسیدھے اور بائیں طرف دیکھتے نہ چلو۔ اور کسی مقام پرلوگوں کی

جماعت دیکھو اور ان کے ساتھ بیٹھنا ہے تو خاموش بیٹھ جاؤ اور اُکھڑ پنجوں کے بل مت بیٹھو
ور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں مت ملاؤ۔ داڑھی اور انگشتری سے مت کھیلو۔

اور لوگوں کے سامنے ناک میں انگلیاں نہ ڈالو اور دانتوں میں خلال نہ کرو اور نہ تھوکو اور اپنے سامنے سے مکھیوں کو اڑانے کے لیے بار بار ہاتھ نہ ہلاؤ۔ اور لوگوں کے سامنے جمائی نہ لو اور اپنی تعریف مت کرو۔ اور اپنی بات کو آہستہ اور سلیقہ و ترتیب کے ساتھ کہو اور کوئی بات پراگندہ و منتشر انداز میں نہ کہو اور کوئی بات بھی اچھی ہو تو اس کو توجہ اور خوشی کے ساتھ سنو۔ بات چیت پر تعجب کا اظہار نہ کرو۔ مخاطب سے بار بار بات کو دھرانے کا مطالبہ نہ کرو اور ایسی بات سے پرہیز کرو جو ہنسی اور تحقیر کا باعث بن جائے۔ اور اپنی تعریف اور اپنے بچوں کی تعریف نہ کرو اور اپنے شعر و تصنیف کی تعریف مت کرو۔ اور جو چیز بھی تم سے تعلق رکھنے والی ہے اس کا اظہار نہ کرو اور عورتوں کی طرح خود کو نہ سنوارو اور خود کو غلاموں کی طرح میلے کچیلے، ذلیل و خوار بنائے نہ رکھو۔

اور جس شخص سے بھی اپنی کوئی حاجت بیان کرو تو پوری کرنے کے لیے بے حد اصرار نہ کرو اور کسی شخص کا ذکر اس کے ظلم اور معصیت کے ساتھ نہ کرو۔ اور کسی کے سامنے اپنے مال و دولت کی مقدار نہ بیان کرو اور یہ چیز اپنی بیوی بچوں سے بھی پوشیدہ رکھو۔ اس لیے کہ اگر تمہارے مال کی مقدار کم ہے تو تم ان کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے اور اگر تمہارے مال کی مقدار زیادہ ہے تو تم کبھی ان کی رضا اور خوشنودی حاصل نہ کر سکو گے اور اُن کے ساتھ سختی کے بغیر وقار کے ساتھ زندگی گزارو اور ایسی نرمی سے پیش آؤ جس میں تمہاری کمزوری و ذلت نہ ہو۔

نوکروں، بچوں اور شاگردوں کے ساتھ ہنسی، مذاق اور تمسخر نہ کرو۔ تاکہ تم ان کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہو جاؤ۔ اور جب کسی کے ساتھ دشمنی ہو جائے۔ تو تیزی مت بتاؤ

اور اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور اپنی بات کو حجت و دلیل کے ساتھ کہو اور اسی وقت کہو جب کہ تمہارے پاس قوی دلیل ہو۔ اور گفتگو کے درمیان ہاتھ نہ ہلاؤ اور دو زانو ہو کر نہ بیٹھو۔ اور جب تک غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے کسی بات چیت میں دخل نہ دو۔

اگر بادشاہ تم کو اپنا مصاحب اور مقرب بنا لے تو غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ بلکہ اس کے ساتھ بہت احتیاط اور خوف کے ساتھ رہو اور اس کے تعلق پر اعتماد نہ کرو۔ اور اپنے مال کو اپنی ذات سے زیادہ عزیز نہ رکھو۔ تمہاری خوش حالی کے زمانے میں دوستوں سے پرہیز کرو کیوں کہ جب تک تمہارے نزدیک مال اور دولت ہے اور عزت و حشمت ہے وہ تمہارے دوست بنے رہیں گے اور تمہاری مفلوک الحالی اور مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں تم سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ انتہی

بہت سے لوگ صحبت اور ہم نشینی کے آداب اور طور طریقوں سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے لیے ایذا و تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔ اور باہمی اختلاف و دشمنی اور تفریق کا شکار ہو جاتے ہیں، ضروری ہے کہ ہر مسلمان ایذائے مسلم اور تفریق و اختلاف سے خوف کھائے اور شریعتِ مطہرہ کے اصول و قواعد کی روشنی میں صحبت کے آداب اور طور طریوں سے واقفیت حاصل کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۱)

# سلام کے بیان میں جو سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ھے

آداب صحبت شرعیہ جو گذشتہ فائدے میں بیان کر چکے ہیں ان میں سے ایک زبان سے السلام علیکم کہنا بھی ہے سلام، اسلام کا عظیم ترین شعار ہے۔ لیکن اس دیار وامصار کے سرمایہ دار اور بڑے لوگ اغنیاء واکابر چھوٹوں کو زبان سے لفظ السلام علیکم کہنے کو اپنی کسر شان اور اپنے وقار کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ لفظِ سلام کے عوض پشت خم کرنے کو اور دوسرے غیر شرعی آداب وطریقوں کو کمالِ ادب اور انتہائی تمیز کی بات خیال کرتے ہیں۔

شیخ الہند ''شرح سفر السعادۃ'' میں فرماتے ہیں کہ سلام جو ملتِ اسلامی کا عظیم ترین شعار ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ اور سارے مسلمانوں کی عادت سے ثابت ہے اور قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ: ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا سے بخوبی واضح ہے۔ اسلام کا یہ عظیم شعار ہندوستان کے بعض شہروں میں متروک اور مہجور ہو چکا ہے۔ اور کمر و پشت خم کرتے ہوئے جھک کر تسلیم بجالانا جو اہلِ بدعت کا شعار ہے، سلام کا قائم مقام بن چکا ہے اور ہندوستان کے بعض شہروں میں سلام کا طریقہ، سر پر ہاتھ رکھنا اور انگلیوں کو زمین پر ٹیکنا پھیل چکا ہے۔ اکثر لوگوں کے نزدیک زبان سے السلام علیکم کہنا سوء ادبی اور بدتمیزی میں شمار کیا گیا ہے۔ لہذا اربابِ مسلم کی لازمی ذمہ داری ہے کہ سلام کا طریقہ عام کرنے میں انتہائی درجہ کی سعی وکوشش کریں اور اس مقصد کی تکمیل میں تمام تر کوششیں اور محنتیں صرف کریں۔ اور اسلام کے اس عظیم ترین شعار کو زندہ کرنے میں لطف و

مہربانی سے کام لیں اور احیائے سلام کو عظیم ترین قربِ خداوندی اور نجات کا شریف ترین ذریعہ اور رب الارباب کی قربت کا عظیم ترین سبب سمجھیں۔

ہندوستان میں علمائے کرام نے مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو زندہ کرنے میں اور اسلام کے اس عظیم شعار کو پھیلانے میں انتہائی کوششیں صرف کیں۔ لیکن بے دیانت حکام اور متکبر امراء (العادۃ طبیعۃ خامسۃ عادت پانچویں طبیعت ہے) کے حکم کے تحت ہندوستانیوں کی عادت کے مطابق لفظِ سلام کے دشمن تھے۔ انہوں نے خود کو شریعت کے تابع نہیں کیا اور عادت پسند عوام بھی الناس علی دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر گامزن رہا کرتے ہیں) کے حکم کے تحت، بدعت کی عادت کی پیروی کرنے والے اور طریقِ سنت کے دشمن تھے اور علمائے دین دار اس عموم بلوٰی (وہ مصیبت و مشکل جس میں سبھی گرفتار ہیں) سے ناچار اور بے بس ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کے اس دورِ اقتدار میں جس میں مسلمانوں کی عادت زائل اور ان کی حکومت زوال پذیر تھی۔ دین داروں کی ایک جماعت نے سلام کی سنت کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہاں تک کہ سلام کی سنت عوام و خواص کی نظروں میں آفتاب رابعۃ النہار کی طرح پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ لیکن اربابِ ولایت اور حکام ریاست نے خود کو احیائے سلام کی کوششوں سے الگ رکھا۔ تو سلام کی سنت گنتی کے چند نیک اشخاص ہی میں پھیل سکی۔

احیائے سلام پر قابو پانے کے ان دنوں میں عزت و وجاہت کے متلاشی جاہلوں اور کبر و نخوت خو، غالیوں کا ایک گروہ خطابت و موعظت کے شرائط اور تقاضوں سے عاری اور غالی، وعظ کے منبر پر بیٹھ کر اور مشیخیت و سجادگی کے لوازم کے بغیر مسندِ ارشاد پر جم کر، من لم یوقر کبیرنا (جو بزرگوں کی توقیر نہ کرے وہ ہمارے میں سے نہیں ہیں) والی حدیث کے ا

ظہار سے باز رہا۔ اور مصافحہ، دست بوسی، قدم بوسی اور بزرگوں کے تمام آداب کی مشروعیت کے اعلان کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اور افشوا السلام بینکم (تمہارے درمیان سلام پھیلاؤ) کی حدیث کو پھیلانے اور اہلِ عرب کی عادات کو عام کرنے اور انحناء و پشت خم کرنے اور زمین بوسی، سجدہ تعینات (مثلاً سوم، دسواں، بیسواں) ومزامیر کی برائی کو ناجائز قرار دینے کا ببانگِ دہل اقدام کر دیا۔ (یعنی یہ لوگ مذکورہ اشیاء پر ہی زور دیتے رہے ہیں) نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عوام حرام نوکری اور دیگر حرام کمائیوں، ناجائز کھانے پینے، فرض نمازوں کو ترک کرنے، سود خواری، ریش تراشی اور دیگر غیر شرعی امور کو حساب میں ہی نہیں لا رہے ہیں، لیکن مکروہات اور غیر مکروہ کھانوں اور غیر تائب اشخاص کی مجالس میں جو محرمات سے بالکل خالی ہیں، شرکت کرنے کو شدید ترین حرام خیال کر رہے ہیں۔ اور اس حلال کو حرام قرار دینے کے ساتھ ساتھ خود کو بزرگانِ دین سمجھ رہے ہیں اور رب العالمین کے مقربین خیال کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ عزت کے طالب افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، سلام کے پھیلانے کو اپنی دین داری کے لیے ڈھال بنا کر لفظِ سلام کی آڑ میں آباء واجداد، مشائخ و اساتذہ، ساداتِ کرام اور تمام اکابر وامجاد کے ساتھ لفظِ سلام سے پیش آکر اپنے ہم سروں اور ساتھیوں کا معاملہ کر کے عدمِ تعظیم وتوقیر غیر شرعیہ کے مرتکب ہو رہے ہیں اور سلام کی سنت ادا کرنے کے پردہ میں تکبر وفساد کی داد دے رہے ہیں۔ اور دست بوسی وقدم بوسی کو بھی ناجائز خیال کر رہے ہیں۔

طرفہ یہ کہ قدم بوسی کی مشہور سنت کو ایک مرتبہ والی سنت (یعنی وہ عمل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ کیا گیا ہو) کہہ رہے ہیں۔ اور اس ایک مرتبہ والی سنت کی پیروی کا انکار کر رہے ہیں۔ حالاں کہ مطلقاً سنت کا انکار کرنا اور اس کو حقیر ومعمولی

تصور کرنا کفر ہے۔ خواہ وہ سنت ایک مرتبہ کی گئی ہو یا مکرر وسکرر اور یہ انکار، جو برائی اپنے اندر رکھتا ہے وہ اچھی طرح ظاہر ہے۔

اس بارے میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کا فیصلہ زبان زد جمہور ہے جو ایک مسلمان اور یہودی کے درمیان پیش آیا تھا۔ اور طرفہ یہ کہ مجالس ومحافل میں داخل ہونے والے شخص کے لیے قیام کرنے کو فرض عین کی طرح خیال کر رہے ہیں۔ حالاں کہ امام غزالی اور دیگر جلیل القدر علماء کے نزدیک بدعت ہے جیسا کہ گذشتہ فائدہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اور قیام نہ کرنے کی صورت میں اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں اور انتہائی غیض وغضب کی وجہ سے اُن کے چہرے خون کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر یہ لوگ اہلِ عرب کی عادت اور عہدِ نبوت کے طریقہ کو ایک قلم فراموش کر دیتے ہیں۔ زبان پر ہی نہیں لاتے۔ سبحان اللہ! اس افراط وتفریط کے باوجود اپنی طرف عوام کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے اور ان سے فوائد ومنافع حاصل کرنے کے لیے بلند دعوٰی کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے مکر وفریب سے جاہلوں کو اپنا معتقد بنا رہے ہیں۔ اور خود کو متقی وپرہیزگار اور متبعِ سنت کہہ رہے ہیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا الخ

حاصل کلام! واعظین خام کا بھی فساد بہت ہے یہی وہ مقام ہے کہ شیخ عطار نے "تذکرۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ بصرہ تشریف لائے اور حکم صادر فرمایا کہ منابر توڑ ڈالیں اور واعظین کو وعظ کرنے پر پابندی عائد کر دی اور حضرت حسن بصری کی محفل میں تشریف لے گئے اور انہیں وعظ گوئی سے منع نہیں کیا اور فرمایا: یہ جوان شائستہ سخن صاحب علم اور صاحب تقویٰ ہے اور پھر واپس چلے گئے۔

اور اسی طرح نااہل سجادہ نشین حضرات کا فساد بھی بے شمار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء نے دہلی میں ایک سجادہ نشین عالم کو جو نفس وشیطان کے

چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور صاحب فنا و بقا نہیں تھا، اسے مسند سجادگی سے اٹھادیا اور بیعت کرانے پر پابندی عائد کرادی۔

غرض شیطان، نفس بدانجام کے ساتھ اسی سلام کی سوراخ کے ذریعہ خانہ اسلام میں داخل ہوا اور مسلمانوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر اختلاف و پھوٹ اور لڑائی و دشمنی پیدا کردیا۔ اور ہر کس و ناکس کو ابھار دیا کہ وہ اتباعِ سنت کے دعوے کے ساتھ مشائخ، علماء سادات، صلحاء، اساتذہ، آباء و اجداد اور دوسرے واجب الاحترام بزرگوں کے ساتھ ان کے علم و فضل کی جانب التفات کئے بغیر، برادرانہ تعلقات اور اپنے ہمسروں سے ملنے جلنے کی طرح صرف لفظ سلام سے پیش آئیں۔ اور مصافحہ، دست بوسی، قدم بوسی، تواضع، خاکساری اور دیگر آداب شرعی اور صحبت کے فوائد و برکات جو گزشتہ فائدے میں گزر چکے ہیں ان سب سے باز رہے۔ اور مجسم نخوت کی طرح نظروں میں دکھائی دے۔

پس سلام پھیلانے کا حکم جو شارع علیہ السلام نے مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کے واسطے صادر فرمایا تھا، آج وہ دشمنی و عداوت پیدا کرنے میں تبدیل ہوگیا۔ اور اللہ کی رضا، شیطان کی رضا سے بدل گئی اور لوگوں کے درمیان خصوصاً عزت پسند، مغرور افراد اور عادت پسند عزت مند اشخاص کے درمیان سخت دشمنی اور مخالفت وقوع پذیر ہوگئی۔ اس حد تک کہ باپ بیٹے میں جدائی، میاں بیوی میں علاحدگی ہوگئی۔ اور ہر ایک دوسرے کی شکست کے درپے ہوگیا۔ اور مسلمانوں میں اختلاف و تفریق، جو دشمنانِ دین کی سب سے بڑی آرزو اور اہم مدعا ہے، انگریزی حکام کو معمولی توجہ اور ایک پائی خرچ کئے بغیر آسانی کے ساتھ حاصل ہوگئی۔ مسلمان چوں کہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی فریاد رس نہیں ہے جو اُن کے فساد کی اصلاح کر سکے اور ہر شخص کو شرعی احکام کی حد میں رکھے۔ اس لاچار صورتِ حال میں مسلمانوں کو اپنے باہمی تنازعات اور مخاصمات میں انگریزوں کی عدالت کی

جانب رجوع کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ اور انگریزی حکام، اجنبیت، مسافرت اور زبان وملت کی مغائرت ومخالفت اور اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کے فساد کی اصلاح کی طاقت نہیں رکھتے تھے مجبوراً انہوں نے اہلِ خصومت کی اصلاح وتادیب کے عوض، قید اور جرمانہ کا حکم دینا شروع کر دیا۔ معاذ اللہ من ذلک۔

اگر سلام بزرگانِ کرام کے آداب مشروع کے ساتھ ملا اور جڑا ہوتا تو ان شرور و مفاسد کی گنجائش نہ رہتی۔

فلاسفۂ اسلام، اہلِ اسلام کے زمرہ میں داخل ہونے کے باوجود اپنی خود رائے سے عقول، نفوس ہیولی، صورت اور افلاک وما فیہا کے قدیم ہونے کی رائی رکھتے تھے۔ لہذا آسمان کے پھٹ جانے اور ستاروں کے منتشر ہو جانے کا انکار کر بیٹھے، حالاں کہ آسمان میں شگاف اور ستاروں میں انتشار کا واقع ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ نے رسالہ ''منقذ'' میں فارابی، ابنِ سینا اور دیگر فلاسفۂ اسلام کی تکفیر کی ہے۔

غرض فلاسفہ اپنی خود رائے کی وجہ سے گمراہی وضلالت کی وادی میں بھٹک گئے اور ایک عالم کو بھی دینِ حق کے صراط مستقیم سے برگشتہ کر دیا۔ ھلکوا فاھلکوا۔ خود ہلاک ہو گئے اوروں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور اسی طرح معتزلہ بھی خود رائے خود بینی کی وجہ سے سنت جماعت کے راستہ سے برگشتہ ہو کر ایک عالم کی گمراہی وضلالت کا باعث بن گئے ضلوا فاضلوا خود گم راہ ہوئے اوروں کو بھی گم راہ کر دیا۔

علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ:

رئیس المعتزلہ واصل بن عطا، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس سے کنارہ کش ہوا، اس حال میں کہ وہ ثابت کرتا تھا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے اور نہ کافر اور مرتکب کبیرہ کے لیے دو مرتبوں کے درمیان ایک مرتبہ ثابت کرتا تھا اس پر حضرت حسن بصری نے کہا: وہ ہم

سے دور ہو جا۔ اسی واقعہ سے واصل بن عطا اور اس کے ہم عقیدہ افراد معتزلہ کے نام سے موسوم اور مشہور ہو گئے۔ اور یہ لوگ خود کو اصحابِ عدل و توحید کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اصحابِ عدل کی توجیہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک طاعت کرنے والے کو ثواب اور گناہ کرنے والے کو عذاب دینا، اللہ پر واجب ہے۔ اور اصحاب توحید کی توجیہہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے صفاتِ قدیمہ کی نفی کرتے ہیں۔ یعنی صفات، عین ذات ہیں۔ پھر معتزلین علم کلام میں پوری طرح مشغول ہو گئے اور اصول و احکام میں اور بہت سی چیزوں میں فلاسفہ کی اتباع کرنے لگے۔ اور ان کا مذہب لوگوں میں مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ شیخ ابوالحسن اشعری نے اپنے استاذ شیخ ابوعلی جبائی سے کہا کہ ان تین بھائیوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، جن میں ایک طاعت کی حالت میں مر گیا۔ دوسرا معصیت کی حالت میں مر گیا اور تیسرا نابالغی کی حالت میں مر گیا۔

جبائی نے کہا پہلے کو ثواب میں جنت دی جائے گی اور دوسرے کو دوزخ میں عذاب دیا جائے گا اور تیسرے کو نہ ثواب دیا جائے گا اور نہ عذاب دیا جائے گا۔

اس پر ابوالحسن اشعری نے فرمایا: پس اگر تیسرے نے یہ کہا کہ اے میرے رب! تو نے مجھے بچپن ہی میں موت کیوں دیدی اور کیوں زندہ نہ رکھا۔ یہاں تک کہ میں بالغ ہو جاتا اور تجھ پر ایمان لاتا اور تیری طاعت کرتا اور جنت میں داخل کرتا، تو اس پر اللہ تعالیٰ کیا کہے گا؟

جبائی نے کہا: اللہ تعالیٰ یہ کہے گا کہ میں تجھ سے بہتر جانتا ہوں۔ اگر تو بالغ ہوتا تو ضرور نافرمانی کرتا اور دوزخ میں داخل ہوتا۔ تیرے لیے یہی بہتر تھا کہ تو بچپن ہی میں مر جائے۔ اس پر اشعری نے کہا: پس اگر دوسرا یہ کہے کہ اے میرے رب تو نے مجھے بچپن ہی میں موت کیوں نہ دی تا کہ میں تیری نافرمانی نہ کرتا اور نہ دوزخ میں داخل ہوتا تو اللہ تعالیٰ کیا کہے گا۔

پس جبائی مبہوت اور لاجواب ہو گیا اور ابوالحسن اشعری نے اس کے مذہب کو ترک کر دیا۔ آپ اور آپ کے متبعین معتزلہ کے مذہب کی تردید وابطال میں مشہور ہو گئے اور جو چیز سنت سے وارد ہے اس کو ثابت کرنے میں منہمک ہو گئے اور حضرات صحابہؓ کی روش پر چلنے لگے۔ اور یہ حضرات سنت نبوی اور جماعتِ صحابہ کے طریقے کو اختیار کرنے کی وجہ سے اہلِ سنت و جماعت سے موسوم ہو گئے۔

مولوی دہلوی ''صراط مستقیم'' کے پہلے باب کے آخر میں راہِ ولایت اور راہِ نبوت کی بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ:

کتاب وسنّت کا علم حاصل ہو جانے کے بعد یہ دقیق علوم بعض ذہین لوگوں کے حق میں اکسیرِ اعظم کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ یہ علوم ومعارف انہیں منصب امامت اور وراثتِ نبوت کا مقام بخشتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کتاب وسنت حد تواتر اور منتہائے شہرت پر پہنچ گئے۔ اور خاص وعام میں سے ہر ایک اپنے حصے کی مقدار بقدر میں ان سے فائز اور بہرہ ور ہو گیا۔

کتاب وسنت کو تسلیم کرنا، تسلیمِ اولیات کے رنگ میں تمام مسلمانوں کے قلوب میں جگہ پکڑ لیا تو پس یہ علوم دقیقہ، فنون عربیہ کے اساتذہ، ائمہ اجتہاد، دانش ورانِ علم کلام، اربابِ تہذیب اخلاق اور اصحابِ شریعتِ محمدیہ کی مساعی جمیلہ سے بروئے کار آئے اور یہ اکابر حضرات، ان ہی مساعی جمیلہ کی بدولت علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے زمرے میں صحیح مقام پا گئے اور ان مباحث کے پھیلانے میں اُن کے متبعین نے مساعی جمیلہ، کام میں لائے یہاں تک کہ مفصل ودقیق اور متین علوم وفنون وجود میں آ گئے۔

ان بزرگوں کا دورِ برکت نشان ختم ہونے کے بعد نام کے مقلدین کی ایک جماعت ظہور میں آئی جس کی طبیعت میں اقتدار کی طلب اور عزت کی ہوس رچی بسی تھی۔ پس

اس جماعت نے اسی بے معنی قیل وقال اور مکابرہ وجدال کو فضل وکمال سمجھ لیا۔ اور کتاب و سنت کو پسِ پشت ڈال دیا اور اپنی تمام عمر کو ان بے فائدہ امور کو حاصل کرنے میں ضائع کردیا۔ اور فلسفہ واعتزال کی راہ پر گامزن ہوگئی اور اس جہانِ فانی سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہ کیا۔ اور بالآخر اپنی تنگ قبر میں ناکامی ونامرادی اور نقصان وخسران کے سوا کچھ نہ پایا۔ اور نہ کوئی مونس نصیب ہوا۔

قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالاالاية

العیاذ باللہ! اللہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ان جاہلوں کے انجام سے بچائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۲)

# تصوف و صوفی اور ان دونوں کے متعلقات

شیخ وجیہ الدین گجراتی ''حقیقۃ محمدی'' میں سید الطائفۃ جنید بغدادی سے نقل کرتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ حق تعالیٰ تجھ کو تجھ سے ختم کردے اور تجھ کو خود سے زندہ کردے۔ غیر سے قطع نظر کرتے ہوئے۔ اس سے صوفی کا معنی ومفہوم بھی واضح ہو چکا ہے کہ وہ فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہوتا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں صوفی کا اسم متروک ہے۔ تصوف کے بیان میں صوفی سے ہماری مراد مقرب (الٰہی) ہے۔ مترسم (ظاہری رسوم کا پابند) نہیں، اصطلاحی الفاظ میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ جیسا کہ قدوۃ السالکین، عمدۃ الکاملین العالم الربانی شیخ شہاب الدین سہروردی نے ''عوارف'' کے پہلے باب میں تحریر کیا ہے:

جان لو! بے شک ہم اس کتاب میں جو بھی بزرگ وشریف حال صوفی کی جانب منسوب کریں گے وہ مقرب کا حال ہوگا اور قرآن کریم میں لفظِ صوفی نہیں ہے اور اسمِ صوفی متروک ہے اور صاحبِ تقرب کے لیے مقرب کا لفظ وضع کیا گیا ہے اور ہم اس کی تشریح وتوضیح اسی باب میں کریں گے اور بلاد اسلامیہ کے مشرقی ومغربی شہروں کے دونوں جانب بھی اہلِ قرب واصحابِ تقرب کے لیے صوفی کا لفظ معروف ومشہور نہیں ہے بلکہ یہ نام ان لوگوں کے لیے مشہور ہے جو صوف کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ کپڑے دھو کر پہنتے ہیں اور سر مونڈ ھتے ہیں۔ اور مغرب، ترکستان، ماوراء النہر کے شہروں میں بے شمار اہلِ قرب موجود ہیں۔ لیکن وہ صوفیاء کے نام سے یاد نہیں کیے جاتے۔ اس لیے کہ یہ حضرات صوفیوں کے لباس میں نہیں ہوتے اور اصطلاحی الفاظ میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

پس اسی سے یہ بات جان لینی چاہیے کہ صوفیائے مقربین سے ہماری مراد مشائخ صوفیا ہیں جن کے اسمائے گرامی ''طبقات'' اور دیگر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ سب کے سب مقربین کے طریقہ پر گامزن ہیں۔ اور ان کے علوم وعوارف، مقربین کے علوم وعوارف ہیں۔ ا ور جو شخص بھی مقربین کے مقام پر فائز ہے وہ ابرار میں سمجھا جائے گا۔ اور وہ متصوف ہوگا۔ جب تک اس کے حال کا تحقق نہ ہو اور جب اس کا حال متحقق ہو جائے تو وہ صوفی ہوگا اور ان دونوں کے علاوہ جو بھی مقربین کے لباس سے مزین ہو، اور ان کی جانب منسوب ہو تو وہ ان کے مشابہ اور مماثل ہوگیا۔ وفوق کل ذی علم علیم: انتہی

پس اس سے یہ حقیقت بھی جان لینی چاہیے کہ تصوف ایک ایسا علم ہے جن کا تعلق علوم دین بلکہ خلاصۂ علوم دین سے ہے۔ کیوں کہ وہ مجتہدان باطن کے اجتہاد واستنباط سے مستنبط ہے اور اس کو علم باطن بھی کہتے ہیں اور علمِ ظاہر کے ساتھ اس کی نسبت بالکل اسی طرح ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح کی نسبت اور پوست کے ساتھ مغز کی نسبت ہوتی ہے۔ اور

اس کی تفصیل ''فصل الخطاب'' کے مقدمہ ثانیہ میں گزر چکی ہے۔

زبدۃ العارفین شاہ کمال فرماتے ہیں:

مغز علوم وفقہ وحدیث وکتاب ہے　　یہ علم مغز فقہ و حدیث و کتاب کا

یہ بھی جان لیا جائے کہ ''صاحبِ کشف المحجوب'' نے ائمہ صوفیاء جو صحابہ کرامؓ میں، اہلِ بیت واصحاب صفہ میں، تابعین وتبع تابعین اور متاخرین میں جو اُن کے زمانہ تک وجود میں آئے۔ ان سب کے حالات قلم بند کیا ہے اور مذکورہ جمیع طبقات میں سے ہر ایک طبقہ کے بیان میں ایک ایک باب تحریر کیا ہے۔ جزاه الله عنا خير الجزاء

ائمہ صوفیاء کی تفصیل اسی کتاب میں دیکھ لی جائے۔ اور یہ کتاب تصوف میں مشہور و معروف ہے اور علماء وعرفاء کے نزدیک معتبر ومستند ہے۔

شیخ شہیر عارفِ بے نظیر علی بن عثمان ابن علی جلابی، جنہوں نے ۴۶۴ھ میں وفات پائی ''کذا فی النفحات وسفینۃ الاولیاء'' کی تصنیف ہے۔

تصوف کی ماہیت اور آدابِ صوفیاء اور دونوں کے متعلقات کے بارے میں فصل الخطاب کے دوسرے، پانچویں، آٹھویں، دسویں، گیارھویں اور بارہویں مقدمہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لہذا یہاں اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ ان موضوعات کی تفصیل فقیر کی کتاب ''جواہر السلوک'' میں دیکھ لی جائے۔

حاصلِ کلام!

جو شخص بھی اہلِ سنّت کے عقائد حقہ، سلف وائمہ سلف کے طور طریقے، صوفیاء کی اصطلاحات اور اس عالی مقام جماعت کے حالات سے واقف نہ ہو، اور امام غزالیؒ، شیخ ابن عربی، صدر الدین قونوی کی کتابیں اور شیخ سہروردی کی کتاب ''عوارف'' اور شیخ ابو بکر کی کتاب ''تعرف'' اور مولانا روم کی مثنوی اور امام ربانی کے مکتوبات کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اس کا

قدم لغزش سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور ایسے آدمی کو مذکورہ اکابرین کی کتابوں کے مطالعہ کے بغیر حقیقتِ واقعہ تک پہنچنا مشکل اور دشوار ہوگا۔

اس مقام میں بعض عوام کی افراط وتفریط بہت ہے چناں چہ کبھی علمِ باطن کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس طرح کا انکار فرقۂ حشویہ کا باطل عقیدہ ہے جیسا کہ اس کی تفصیل ''فصل الخطاب'' کے آٹھویں مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ یہ وضاحت وہاں دیکھ لی جائے۔

کفار قریش بھی قرآنِ مجید کے باطنی نکات اور پوشیدہ معانی کا انکار کرتے تھے اور قرآن کو اساطیر الاولین (گزرے ہوئے لوگوں کے قصہ وکہانیاں) کہا کرتے تھے۔

مثنوی

چوں کتاب اللہ بیاید علم براں — ایں چنیں طعنہ زد آں کافراں
جیسے قرآن آیا یونہیں اس زمان — مارتے تھے طعنے اس پر کافراں
کہ اساطیر است افسانہ نژند — نیست تعمیقی و تحقیقی بلند
کہ اساطیر اور قصے ہیں ذیل — نہ ہیں نکتے اور نہ تحقیقِ جلیل
ظاہر ست و ہر کسی پی می مرد ! — کو بیاں کہ گم شود دروے خرد
ہے وہ ظاہر کہ ہر ایک سمجھے اسے — کب ہے مشکل عقل جو اس میں گے
گفت گر آساں نماید این بتو — ایں چنیں سورہ یکے آساں بگو
بولا گر آساں تمہیں معلوم ہو — ایسی آساں ایک سورۃ تم کہو
ظاہرش دیدے ز معنی غافلی — باطنش راکن نگہ گر عاقلی

تو اس کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس کے باطن سے غافل ہے

اگر تو عاقل ہے تو اس کے باطن کو دیکھ

حرف قرآں رامداں کہ ظاہر است
زیر ظاہر باطنی بس قاہر است

حرف قرآں کو نہ بظاہر جان لو
نیچے اس ظاہر کے باطن ہے نکو

زیر آں باطن بود بطنی دگر!
ہم چنیں تابفت اے نام ور

اس کے باطن میں ایک دوسرا باطن ہے
اے نامور اس طرح ہفت بطون ہیں

زیرِ بطن ثانیش بطنِ سیوم
کہ درو گردد خرد یا جملہ گم!

نیچے اس باطن کے باطن تیسرا
ہے خرد گم اس میں از سر تاپا

بطن چہارم از نبی خود کس ندید
جز خدائے بے نظیر و بی ندید

دیکھا چوتھا بطن قرآن بیشتر
نہ کسی نے جز خدائے بے نظر

توز قرآں ای پسر ظاہر مبین!
دیو آدم رانہ بیند جز کہ طین

ظاہر امت دیکھ قرآں سے پسر
دیکھتا ہے دیو مٹی سے بشر

ظاہر قرآن چو نقش آدمی است
کہ نقوش ظاہر و باطن خفی است

آدمی نزدیک عاقل ہے خفی
کب کھلی جو غیب میں ہو وصفی

تو مبین زافسوں عیسیٰ حرف وصوت
آں بیں کزوے گریزاں است موت

دیکھ مت عیسیٰ کے دم حرف وصوت
دیکھ وہ کہ بھاگتی ہے اس سے موت

ایں سخن ہمچوں عصائے موسیٰ است
یا بمانند فسوں عیسیٰ است

آدمی مثل عصا موسیٰ کے ہے
آدمی مثلِ دم عیسیٰ کے ہے

تو مبین موسیٰ عصیٰ را سہل یافت
آں بیں کہ بحر اخضر را شگافت

دیکھ مت اب اس عصا کو سہل تو
دیکھ وہ کہ پھاڑے بحرِ نیل کو

ظاہرش چو بے ولیکن پیش او
کون یک لقمہ چو بکشاید گلو

ظاہرا لاٹھی و اس کے روبرو
یہ جہاں اک لقمہ جو کھولے گلو

علامہ قیصری مقدمہ شرح قصیدۂ تائیہ فارضیہ کے مقصد ثانی کی پہلی فصل میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب قرآن کریم کے لیے ایک ظاہر، ایک باطن، ایک حد اور ایک مطلع ہے، جیسا کہ زبانِ نبوت نے فرمایا: بے شک قرآن کے لیے ایک ظاہر ہے، ایک باطن ہے، ایک حد ہے، ایک مطلع ہے، نیز ارشاد نبوی ہے: بے شک قرآن کے لیے ایک مفہوم باطن ہے اور اس مفہوم باطن کے لیے بھی ایک باطن ہے، جس میں ساٹھ بطون ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ستر بطون ہیں۔ تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے جو مفہوم اور معنی سمجھ میں آجائے اور اس کی طرف ذہن منتقل ہو جائے۔ ظاہری معنی و مفہوم کے لیے جو مفہومات لازمہ ہیں یہ اس کا باطن ہے۔ اور جہاں عقول و فہوم کے ادراک کی انتہا ہوتی ہے یہ اس کی حد ہے۔ اور کشف و شہود کے طریقہ سے جن اشارات ربانیہ اور اسرارِ الٰہیہ کا ادراک کیا جائے یہی اس کا مطلع ہے اور مفہوم اول یعنی اس کا ظاہر عوام کے لیے ہے اور مفہومِ اول کے لیے جو مفہومات لازمہ ہیں وہ خواص کے لیے ہیں۔ اس میں عوام کا دخل نہیں اور اس کی حد، کاملین کے لیے ہے اور مطلع، اخص الخواص کے لیے ہے، جیسے اکابر اولیاء۔

اور حدیث قدسیہ اور کلمات نبویہ میں تقسیم ایسی ہی ہے۔ بلاشبہ ان احادیث میں عوام ہے، خواص اور اخص الخواص کے لیے رحمانی خبریں اور الٰہی اشارات ہیں۔ اس لحاظ سے شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔

اسی سے علم باطن کی حقیقت جان لینا چاہیے۔ علامہ میبذی ''فواتح'' کے پہلے فاتحہ میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابن عربی نے فتوحات کے ۳۷ ویں باب میں لکھا ہے کہ شیخ ابو یزید نے ابو موسیٰ سے کہا اے ابو موسیٰ! جب تم کسی شخص کو اربابِ طریقت کی باتوں پر ایمان رکھنے والا پاؤ تو اس سے دعا کی درخواست کرو۔ کیوں کہ اس کی دعا بلاشبہ مستجاب ہے۔ اسی سے بارگاہِ رب العزت میں ارباب طریقت کی قدر و منزلت اور جاہ و عزت کا اندازہ کرنا چاہیے۔

بعض علم تصوف کو فلاسفہ سے ماخوذ کہتے ہیں ۔ کیوں کہ صوفیاء فلاسفہ کی طرح ارواح وقلوب کو عقول ونفوس کہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ مسلمان عیسائیوں کی طرح دعا کی قبولیت کے مقام میں آمین کہتے ہیں۔ بلکہ آمین کہنا نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سنت گردانتے ہیں۔حالانکہ یہ چیز عیسائیوں سے نہیں لی گئی۔

اور اسی طرح مسلمان دنیا کے اکثر فرقوں کی طرح عالم کو حادث جانتے ہیں۔حالاں کہ انہوں نے یہ اعتقاد دوسرے فرقوں سے نہیں لیا۔اور اسی طرح مسلمان حالتِ احرام میں مشرکوں کی طرح برہنہ سر ہوتے ہیں اور سرزمین حرم کے نشیب وفراز میں بلند آواز سے پکارتے ہیں اور سر منڈواتے ہیں، حالاں کہ انہوں نے ان اموروا شغال کو بت پرستوں سے نہیں لیا۔

صرف ارواح وقلوب کو عقول ونفوس کے لفظ سے تعبیر کرنے کی بناء پر علم تصوف کو فلاسفہ سے ماخوذ کیوں سمجھ لیا جائے۔ بے شک یہ ایک افتراء ہے۔

پروٹسٹ عیسائیوں کے پادریوں میں سے ایک پادری اُلف ہے جس نے رسالہ میزان الحق میں مومنوں کو گمراہ کرنے اور انہیں ذہول ولغزش میں مبتلا کرنے کرنے کے لیے دینِ اسلام پر طعن کیا ہے اور ان افترا پردازوں کی طرح اس افترا میں لب کشائی کی ہے کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے کا حکم آتش پرستوں سے لیا گیا ہے۔حالاں کہ یہ وحی الٰہی کا حکم ہے جس میں باطل کی آمیزش کی گنجائش ہی نہیں۔

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ ۔ تنزیل من حکیم حمید

لوح محفوظ است اورا پیشوا — از چہ محفوظ است محفوظ از خطا
نے نجوم است ونہ رمل است ونہ خواب — وحیٔ حق واللہ اعلم بالصواب

لوح محفوظ اس کا رہنما ہے اور جو کچھ اس میں محفوظ ہے وہ خطا اور غلطی سے محفوظ ہے

اور یہ نجوم، رمل اور خواب نہیں ہے، بلکہ وحی الٰہی ہے واللہ اعلم بالصواب

بعض عوام مسئلہ وحدت الوجود کو آتش پرستوں سے ماخوذ کہتے ہیں۔ حالاں کہ اس مسئلہ کے قائل اہلِ سنت و جماعت ہیں صوفیاء وجودیہ اور ائمہ متکلمین ہیں بلکہ اہلِ قبلہ میں اکابر شیعہ مثلاً نصیر الدین طوسی، علامہ میبذی اور صدر شیرازی بھی اس مسئلہ کے قائل ہیں۔ چناں چہ طوسی کی کتاب ''اوصاف الاشراف'' میں اور میبذی کی کتاب ''فواتح'' میں اور صدر شیرازی کی کتاب ''شواہد الربوبیہ'' میں مرقوم ہے۔ اہلِ قبلہ ہی نہیں بلکہ غیر اہلِ قبلہ میں بھی بعض حکماء اس مسئلہ کے قائل ہیں۔

صاحبِ رشحات کے کلام کا ماحصل جو انہوں نے ملا عبد الغفور کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین اور متقدمین و متاخرین میں اکثر صوفیا محققین و متقین اور حکما و متکلمین میں سے چند افراد اس مسئلہ کے قائل ہیں۔ اگر آتش پرستوں میں سے کوئی دانش مند شخص حکما کی طرح اس مسئلہ کا قائل رہا ہو تو اس بات کی گنجائش ہے اور ان تمام آراء و افکار کے اندر مختلف گروہ اتفاقِ رائے رکھتے ہیں لیکن ہر رائے اپنی جگہ ایک مستقل رائے ہے نہ کہ دوسروں سے ماخوذ۔ اس اتفاق آراء کی وجہ سے مسئلہ وحدۃ الوجود کو آتش پرستوں سے ماخوذ قرار دینا کلام بے سند اور قول بے دلیل ہے۔ هناتوا برهانكم ان كنتنتم صادقين۔

اور کبھی وحدۃ الوجود کے باطل ہونے اور وحدۃ الشہود کے مبنی پر حقیقت ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔ چناں چہ ابو سعد کا رسالہ اس دعوٰی کی دلیل ہے۔ اور کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں کے باطل ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں اور ہر دونوں کو بدعتِ ضلالت کہتے ہیں۔ چنانچہ ''ترجمۂ ایضاح الحق'' اس مدعیٰ کی دلیل ہے۔ اور کبھی مسئلہ وجود میں متکلمین کے حق و صواب ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں اور حلول کو وجودیہ کی جانب منسوب کرتے یں اور ان

کو کافر و گم راہ کہتے ہیں۔ حالاں کہ وجودیہ خود حلولیہ کی تکفیر کرتے ہیں۔

اور یہ غالی اشخاص نہیں جانتے ہیں کہ وجودیہ، شہودیہ اور متکلمین یہ تینوں اہلِ سنت و جماعت میں شامل ہیں اور اہلِ سنت کے اختلافی مسائل مظنون الافادۃ یعنی ان کی افادیت ظنی ہے اور حق ان اختلافی مسائل میں ہوتا ہے۔ مجتہد ہی کو ایک جانب یقین میسر نہیں ہے تو مقلد کو کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اور کبھی مسئلہ وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، تنزلات ستہ، صادر اول، تجدد امثال کمون، بروز، اور ان کے امثال کو جو تصوف کے اہم مسائل ہیں، بدعتِ سیئہ کہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بدعت واجبہ ہے اور بعض اہلِ علم کے قول کے مطابق بدعت مندوبہ ہے جیسا کہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے نوویں مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ ہاں! اتنی بات درست اور صحیح ہے کہ ان دقیق مسائل میں تحقیق و تفتیش، عوام کے لیے مذموم اور قبیح ہے۔

سند العلماء شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سورۃ تساءل کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس سورۃ میں مقصود بیان یہ ہے کہ حقائقِ امورِ اخرویہ، مباحث ذات وصفات، مسئلہ قضا و قدر، جبر و اختیار، توحید وجودی، توحید شہودی، مشاجرات صحابہ کرام اور احکام شرعیہ کی حکمتیں جو لوگوں کی عقل و فہم سے بالاتر ہیں اور ان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہے ان مسائل کے بارے میں زیادہ سوالات کرنا نہایت قبیح ہے اور مذموم ہے۔ اس لیے کہ لوگ (ان حقائق کے دقیق معنی نہ سمجھنے کی بنا پر) انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ورنہ کم از کم (یہ مسائل و مباحث) اکثر کے ذہن میں تشکیک کا باعث ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ایمان ان چیزوں سے متعلق زیادہ تحقیق و تفتیش کرنے اور ان امور و مسائل کی کمیات و کیفیات کی تفصیلات جاننے پر، موقوف نہیں ہے اور یہی وہ خطرناک مرض ہے جو اس امت میں گم راہ فرقے بندی اور عقائد میں بگاڑ کا باعث بن کر ایک عالم کے ایمان کو برباد کر دیا ہے غرض اللہ نے مذکورہ سورت میں اس صورتِ حال

(مذکورہ الصدر مسائل وامور میں تحقیق وتفیش اور کثرتِ سوال وجواب اور بحث ومباحثہ) کی قباحت بیان کی ہے تاکہ لوگ اس قسم کے مسائل میں الجھنے سے احتراز کریں۔ اور گمراہی و ضلالت کے بھنور میں نہ پھنس جائیں۔ انتہیٰ

نیز ایک سائل کے جواب میں سندالعلماء لکھتے ہیں کہ:

مسئلہ وحدت الوجود کا تعلق اسرار سے ہے۔ شرائع وادیان اس مسئلہ کے جاننے پر موقوف نہیں ہے بلکہ عوام کو اس مسئلہ کی تعلیم دینا الحاد کا دروازہ کھولنے اور شرور وفساد کو مباح کرنے اور احکام شرعیہ کی پابندی میں بے پروائی اور مداھنت کا باعث بن جاتا ہے۔

پس اس مسئلہ کی نزاکت ودقت اور باریکی کی وجہ سے اس کا اظہار وبیان ممنوع ہے اور اس باب میں سکوت وخاموشی کو واجب جانتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو خاموش رہو اور جب میرے اصحاب کا ذکر ہو تو خاموش رہو اور جب نجوم کا ذکر ہو تو خاموش رہو۔

معلوم ہوا کہ ایسے دقیق مسائل میں تحقیق وتفصیل بحث ومباحثہ کے درپے ہونا خود گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔ یہی متکلمین محققین کا موقف ہے۔ اس احتیاط کے ساتھ ساتھ اس جماعت نے اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ جیسے امام غزالی، امام رازی اور ان کے علاوہ اس فن کے دیگر ائمہ کرام۔ اگر اس مسئلہ کی تفصیل اور توضیح مطلوب ہو تو کتاب ''تنبیہ المجوبین'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انتہیٰ

اور اسی کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ گمراہ فرقوں میں خوارج اور روافض کا افتراق، مشاجراتِ صحابہ کی وجہ سے ہے۔ اور قدریہ اور جبریہ کا مسئلہ قضا وقدر کی وجہ سے ہے۔ اور منکرین وملحدین کا مسئلہ وحدۃ الوجود کی وجہ سے ہے اور باقی فرقوں کو اسی پر قیاس کرلیا جائے۔

اور کبھی عوام قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور ان کے مثل دوسرے سلاسل کے اشغال اور

اعمال کو بدعتِ ضلالت کہتے ہیں۔حالاں کہ مولوی خورم علی نے ''شفاء العلیل'' ترجمہ ''قول الجمیل'' میں ان خیالات کی تردید کی ہے۔

مترجم (مولوی خرم علی) کہتا ہے حضرت مصنف محقق (شاہ ولی اللہ) نے کلام دلپذیر اور تحقیق عدیم النظیر سے شبہاتِ ناقص کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔بعضے نادان کہتے ہیں کہ قادریہ اور چشتیہ اور نقشبندیہ کے مخصوص اشغال صحابہ اور تابعین کے زمانے میں نہ تھے،لہٰذا یہ سب بدعت سیئہ ہوے۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جس امر کے واسطے اولیاء طریقت رضی اللہ عنہم یہ اشغال مقرر کئے ہیں وہ امر،زمانِ رسالت سے اب تک برابر چلا آرہا ہے گو طرق اس کی تحصیل کے مختلف ہیں تو فی الواقع اولیاء طریقت،مجتہدین شریعت کے مانند ہوے مجتہدین شریعت نے استنباطِ احکام ظاہر شریعت کے اصول ٹھہرائے اور اولیاء طریقت نے باطن شریعت کی تحصیل کی جس کو طریقت کہتے ہیں۔قواعد اور اصول مقرر فرمائے تو یہاں بدعت سیئہ کا گمان سراسر غلط ہے۔ہاں البتہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کو بہ سبب صفائی طبیعت اور حضور خورشید رسالت سے تحصیل نسبت اور اکتساب فیض کی وجہ سے ایسے اشغال کی حاجت نہ تھی بخلاف متاخرین کے کہ ان کو بسببِ بعد زمانِ رسالت کہ البتہ اشغال مذکور کی حاجت ہوی جیسے صحابۂ کرام کو قرآن وحدیث کی فہم میں صرف ونحو اور دیگر فنون وقواعد کی دریافت کی حاجت نہ تھی اور اہلِ عجم اور بالفعل کے عرب اس کے محتاج ہیں'' انتہیٰ

اگر یہ ساری چیزیں بدعتِ ضلالت ہیں تو پھر یہ بات قابلِ غور ہے۔کیوں کہ صوفیاء کی کتابیں اور منکر و طاعن اشخاص کے مشائخ و بزرگوں کی کتابیں خصوصاً مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب ''قول الجمیل'' اور شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب ''صراط مستقیم'' باب سوم مختلف سلاسل کے اشغال سے بھری پڑی ہیں۔

اور عوام کبھی مقاماتِ عالیہ، وارداتِ قلبیہ اور حالاتِ اقدسیہ کو امور سیئہ خیال کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سب امور دینیہ میں سے ہیں۔ چناں چہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے دوسرے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔

اور کبھی ولایت کو پانچویں صدی ہجری سے منقطع قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ ولایت کا سلسہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ مولانا شاہ اسماعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کی تالیف کے اسباب میں کتاب کے آخر میں ذکر کرتے ہیں کہ:

اہلِ زمانہ کی جاہلانہ معتقدات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ولایت کو ممتنعات عقلیہ میں شمار کرتے ہیں اور اس چیز کو امت کے اولین افراد میں منحصر گردانتے ہیں۔ اور ختمِ نبوت کی طرح ختم ولایت کے قائل ہیں۔

ہر چہ دارد از ثریا تاثر ے ! می سپاردزین یکے با دیگرے
پس بہرو وری ولی قائم است تا قیامت آزمایش دائم است

ثریا سے تحت الثری تک جو کچھ موجود ہے وہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔
پس ہر دور میں ایک ولی ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ دائم ہے۔

اور کبھی اولیاء کرام کی بے خودی اور سکر کا انکار کرتے ہیں اور تمسخر واستہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ سکر خانہ خراب، مجموعات اور دفاتر کی تصنیف وتالیف اور کتابوں کے ابواب و فصول کی ترتیب میں مانع کیوں نہیں ہے۔ حالاں کہ امام ربانی مکتوبات کی جلد سوم میں ایک سوستر ویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ فقیر یہ دفاتر و مجموعات اس عالی قدر جماعت (صوفیاء) کے علوم واسرار میں تحریر کیا ہے، ظاہراً تمہارے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ سب سکر و بے خودی کی آمیزش کے بغیر صحو خالص کے عالم میں تحریر کیا ہے۔ یہ بات اس طرح ہرگز نہیں ہے کیوں کہ وہ حرام

اور منکر ہے اور دروغ وسخن بافی ہے۔ سخن باف اشخاص جو صحوِ خالص سے متصف ہیں بالضرور اس قسم کی باتیں گھڑتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں کو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر دیتے ہیں۔

آخر حافظ کی یہ ساری فریاد، بے ہودگی اور غلط بیانی نہیں ہے۔ یہ تو قصۂ غریب اور حدیث عجیب ہے۔"

یہ تمام غلو اس بات سے آگاہ کر رہا ہے کہ غالی اشخاص صوفیاء کرام کے علوم و معارف سے بالکلیہ واقف ہی نہیں ہیں۔ صوفیانہ علوم وعوارف سے لاعلمی و بے خبری جس قدر بھی ہو، ایک بری بات ہے۔ لیکن ان کا انکار کرنا تو ایک بہت بری بات اور بہت بڑی بلا ہے۔ اور یہ ایک عظیم وبال ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل فصل الخطاب کے تیرھویں اور سولہویں مقدمہ میں دیکھ لی جائے۔

امام ربانی کے مکتوبات کی دوسری جلد کے ۵۵ ویں مکتوب میں اس طرح کے غالی اشخاص کے بارے میں فرماتے ہیں:

کوتاہ نظر اور ناقص افراد چند حدیثوں کو یاد کر کے احکامِ شرعیہ کو ان ہی میں منحصر قرار دیتے ہیں اور اپنی معلومات کے ماسوا اور ماورٰی کی نفی کرتے ہیں اور جو بھی چیز ان کے نزدیک ثابت نہ ہو اس کی نفی کرتے ہیں۔

وہ کیڑا جو کسی پتھر میں پوشیدہ ہوتا ہے | اسی چٹان کو اپنی زمین و آسماں خیال کرتا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۳)

# صوفیاء کے ساتھ مولانا شاہ ولی اللہ کے اختلافات

مولانا دہلوی رسالہ ''مقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ'' میں الوصیۃ الرابع میں فرماتے ہیں: جان لینا چاہیے کہ ہمارے اور اس دور کے مشائخ کے درمیان بعض اختلاف ہیں۔ صوفی منش حضرات کہتے ہیں کہ فنا و بقا اور استہلاک و انسلاخ ہی اصل مقصود اور مطلوب ہے۔

اور کسب و معاش کی مراعات اور طاعات بدنیہ کو بجا لانے سے متعلق جو بھی شرعی احکام وارد ہیں وہ اس واسطے ہے کہ تمام اشخاص اصل مطلوب اور مقصود کو پا نہیں سکتے۔ ہر وہ چیز جس کو پوری طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو پوری طرح سے ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

متکلمین کہتے ہیں کہ شریعت کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ شئی، مطلوب اور مقصود نہیں ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے مقصود و مطلوب، شریعت کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یعنی شریعت ہی اصل ہے اور شارع علیہ السلام نے اس اصل مطلوب کا بیان خواص و عوام دونوں کے لیے کر دیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسان کی تخلیق اس طرح عمل میں آئی ہے کہ وہ قوت ملکیہ اور بہمیہ دونوں کی جامع ہے اور انسان کی سعادت و نیک بختی، قوتِ ملکیہ کو طاقت پہنچانے میں ہے اور اس کی شقاوت و بدبختی، قوتِ بہیمیہ کو طاقت پہنچانے میں ہے۔

نوعِ انسانی کی تخلیق ایک ایسے طریقے پر ہوئی ہے کہ اس کا نفس، اعمال و اخلاق کی رنگا رنگی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اپنی طبیعت میں شامل کر لیتا ہے اور موت کے بعد ان اعمال کو اپنا مصاحب اور ساتھی بنا لیتا ہے یعنی ساتھ لے جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس

کا بدن غذا کی کیفیات سے تمتع حاصل کرتا ہے۔اور اپنا ساتھی اور مصاحب بنا لیتا ہے اور اس سے بدہضمی اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور نوع انسان کی تخلیق ایک ایسے طریقہ پر واقع ہوئی ہے کہ حظیرۂ قدس کے ساتھ اس کا الحاق اور حظیرہ قدس سے اس کا الہامات حاصل ہونا ممکن ہے اور ان اشیاء کا حصول بھی ممکن ہے جو الہام کے حکم میں داخل ہے۔یعنی انسان کا سرور و بہجت حاصل کرنا اگر اس کو ملائکہ سے مناسبت ہو، تنگی اور وحشت سے دوچار ہونا اگر اس کو ملائکہ سے منافرت ہو۔

حاصل کلام! نوعِ انسان اس طرح واقع ہوئی تھی کہ اگر انسانوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو امراضِ نفسانیہ، اکثر افراد کو الم و تکلیف پہنچاتے۔حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کی کارسازی فرمایا ہے۔اور ان کے واسطے نجات کی راہ متعین کیا ہے۔اور ترجمانِ لسان غیب حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی کی جنس سے پیدا فرما کر ان کی جانب بھیجا تاکہ نعمت مکمل ہو۔اور ربوبیت الٰہیہ جو پہلی مرتبہ ان کے ایجاد کی مقتضی تھی۔دوسری بار ان کا ہاتھ تھامے رہے۔

پس صورتِ نوعیہ نے زبانِ حال سے شریعتِ مطہرہ کو مبدأ فیاض سے بھیک مانگ لیا ہے۔اور نوعِ انسانی کے جمیع افراد کو شریعت کا حکم ماننا، ان میں صورت نوعیہ کے گھل مل جانے کی وجہ سے لازم اور ضروری ہے۔اور اس مقام میں افراد کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں ہے، اور فنا و بقا اور استہلاک وغیرہ باعتبار خصوصیت افراد مطلوب اور مقصود ہیں۔کیوں کہ بعض نفوس انتہائی علو و تجرد کے مرتبے میں مخلوق ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے اونچے درجہ کے موافق ان کی رہنمائی کرتا ہے اور فنا بقا وغیرہ احکام الٰہیہ میں سے نہیں ہیں بلکہ اس فرد کی زبانِ حال نے اس کی انفرادیت کی خصوصیت کی وجہ سے اس کا تقاضا کیا ہے۔اور اس پر شارع علیہ السلام کا کلام ہرگز محمول نہیں ہے نہ صراحتاً اور نہ اشارۃً۔

ہاں! ایک قوم نے ان مطالب کو شارع علیہ السلام کے کلام سے سمجھا ہے جیسے اس کی مثال ایسے ہی ہے ایک شخص لیلیٰ مجنون کا قصہ سنے اور اس قصہ کی ہر بات کو اپنی سرگزشت پر محمول کرے۔ اس کو ان کے عرف میں اعتبار کہتے ہیں۔

حاصل کلام! استہلاک اور انسلاخ کے مقدمات میں افراط وزیادتی اور ان میں ہر کس و ناکس کا مشغول ہونا، دین کے اندر ایک دردناک مرض ہے۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جو مذکورہ مقدمات کو چھپا دینے کے لیے اپنی سعی اور کوشش کو کام میں لائے۔ بھلے سے وہ اپنے اندر بعض اصلی استعدادات ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

ہر چند کہ میری یہ بات اس دور کے صوفیا کے لیے بڑی دشوار اور ناگوار سی ہوگی، لیکن مجھے ایک کام کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسی کے مطابق کلام کروں گا۔ زید اور عمر سے کوئی سروکار نہیں۔

الطاف القدس میں فرماتے ہیں:

اس مقام پر عوام صوفیا کو ایک عظیم اشتباہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اعتبار کو معنی مدلول کے ساتھ مشتبہ بنا لیتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز کر نہیں پا رہے ہیں۔

اعتبار یہ ہے کہ عارف ایک آیت یا حدیث کو سن لیتا ہے تو اس کا ذہن ایک ایسی معرفت کی جانب منتقل ہوتا ہے جو دلالتِ وضعی کے علاوہ ہے۔ دلالت وضعی جو عبارت نص، اشاراتِ نص اور ان کے شعبوں سے استدلال کا نام ہے۔ بلکہ اس راہ میں (یعنی دلالت وضعی کے سوا) حدیث نفس میں دل میں آنے والی ایک بات دوسری بات کو کھینچ لاتی ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز یاد آتی ہے۔ چناں چہ نیند اور بیداری کی حالت میں دل میں آنے والی باتوں کے انتقالات اسی نوع کے ہوتے ہیں جیسا کہ یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ بجز اس کے

کہ باقی انتقالات کبھی حدیث نفس ہوتے ہیں اور کبھی وسوسۂ شیطان اور کبھی خاطر عقل ہوتے ہیں۔اور عارف کے حق میں ایسا الہام ہوگا جو مبنی برحق ہے اور ایسی تعلیم ہوگی جو مبنی برصواب ہے۔اور اعتبار عارف کے مقام اور اس کے کلمے کی سماعت کرنے کے درمیان متولد ہوتا ہے۔چناں چہ آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ قوال لیلیٰ ومجنوں کا قصہ پڑھتا ہے تو ایک عاشق کو اپنا درد بھرا قصۂ عشق اور اپنے محبوب کا اعراض کرنا، یا اس کا اقبال، یہ ساری باتیں دل میں گزرتی ہیں اور اس کی یادوں کی جلو میں آجاتی ہیں اور اسی راہ سے عاشق کی لذتیں ابھرتی ہیں اور اس کی سوزش دل اور اس کے جوش وجذبے ابل پڑتے ہیں۔حالاں کہ یہ قصہ خود کوئی مثل نہیں ہے اور نہ ہی اس قصے سے مستنبط ہے بلکہ اس قصہ کے کلمات سننے اور ان کی سماعت سے نزدیکی کے باعث خود مستمع کے مقام سے اس کے محبوب کی یاد متولد ہوتی ہے۔لہذا اس سے یہ بات واضح ہے کہ اعتبار کے اندر اصل شئے انتقالِ ذہن ہے نہ کہ دلالت کے طریقے۔

واضح ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتبار کی صنعت کو تدبر قرآن کے وقت نگاہِ مبارک میں رکھا ہے اور اسی کے موافق قرآنِ پاک کے دریا کو سر کیا ہے۔اور علمِ اعتبار ہماری اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

حاصل کلام! یہ کہ اعتبار ایک عجیب وغریب اور قدر و قیمت والا فن ہے۔تفسیر عرائس، حقائق سلمی اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی اور شیخ سہروردی کا بہت سارا کلام اسی فن اعتبار سے متعلق ہے۔ انتہیٰ

فوز الکبیر میں مرقوم ہے کہ صوفیاء کے اشارات اور ان کے اعتبارات در حقیقت فن تفسیر سے تعلق رکھنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ استماع قرآن کے وقت سالک کے قلب پر بہت سی، چیزیں ظاہر اور منکشف ہوتی ہیں۔

اور نظم قرآن کے درمیان اور اس حالت کے درمیان متولد اور منکشف ہوتی ہیں جو

کہ سالک رکھتا ہے یا جو معرفت کہ اس کو حاصل ہے، اس سے متولد ہوتی ہیں جیسا کہ ایک شخص لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سنتا ہے اور اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے، اور جو معاملہ کہ اسکے اور اسکی محبوبہ کے درمیان گزرا ہوتا ہے وہ اس کے ذہن پر مستحضر ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک اہم فائدہ جان لینا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فن اعتبار کو مستند قرار دیا ہے اور اس راہ میں آپؐ نے سلوک فرمایا ہے تاکہ علمائے امّت کے لیے سنت قرار پائے اور ان کے لیے علومِ وہبی کا ایک دروازہ کھل سکے۔ انتہیٰ

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی اس مقدمہ میں صوفیاء کے ساتھ مخالفت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہم عصر مشائخ ان کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے حتیٰ کہ ان کے شاگرد رشید قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی ان کی مخالفت کرتے ہوئے، ان پر جرح کی ہے۔

چناں چہ وصیۃ رابعہ کی شرح میں اپنے استاد کے قول کی تردید میں اس طرح رقم طراز ہیں:

فقیر محمد ثناء اللہ کہتا ہے کہ شیخ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صوفیاء فنا و بقا کو اصل مطلب اور مقصود جانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے فنا و بقا کو صرف خواص کے لیے مقرر کیا ہے اور عوام پر صرف ظاہر شرع کی پابندی لازم ہے اور متکلمین کہتے ہیں کہ شریعت کے ماسوا جو چیز بھی ہے وہ مطلوب و مقصود نہیں اور حضرت شیخ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

ظاہر شرع کے تعلق سے متکلمین جس بات کے قائل ہیں وہ نوعِ انسان کی صورت کا مقتضیٰ ہے اور نوعِ انسان کے جمیع افراد، نوع کو شریعت کا حکم ماننا ان میں صورتِ نوعیہ کے گھل مل جانے کی وجہ سے لازمی ہے۔ اور افراد کی خصوصیت کو اس مقام میں کوئی دخل نہیں ہے اور فنا و بقا اور استہلاک وغیرہ جن کو اصل مطلوب کہتے ہیں وہ بعض افراد کی خصوصیت کے اعتبار سے مطلوب اور مقصود ہے۔ اور یہ احکام الٰہی میں سے نہیں ہے یعنی اس کے تعلق سے شریعت خاموش ہے بلکہ فردیت کی خصوصیت کی جہت سے زبانِ حال اس کا تقاضا کی ہے۔

اوراس پر شارع کے کلام کو ہرگز محمول نہیں کیا جا سکتا نہ صراحتاً اور نہ اشارۃً لیکن کوئی بھی شخص اعتبار کے طریقہ سے سمجھ سکتا ہے۔

اس کلام کا خلاصہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شریعت ایک چیز ہے اور فنا و بقا وغیرہ مطالبِ صوفیاء کی دوسری علاحدہ چیز ہے۔ جو شریعت سے ماخوذ اور مستفاد نہیں ہے بلکہ اعتبار کے طریق سے مستفاد اور ماخوذ ہے۔

اور فقیر کے نزدیک حق یہ ہے کہ فنا و بقا وغیرہ مطالب صوفیا، شریعت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہیں۔ چناں چہ قابل اعتماد صوفیا کے مطالب چند یہ ہیں:

(۱) ماسوا اللہ کے تعلق سے قلب کو پاک و صاف کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اس درجہ اس حد تک استہلاک کہ اپنے نفس بلکہ ذکر کو بھی فراموش کر دے۔ اس حالت اور مقام کو تصوف کی زبان میں یادداشت دوام حضور قلب اور فنا قلب کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو بلا شک وشبہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

مولانا روم اس حالت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

صوفی کا مطلوب و مقصود ایک ہی حرف ہے۔ برف کی طرح پاک اور صاف وسفید دل کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس مقام سے متعلق سرورِ پیغمبرانِ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: آگاہ رہو، بے شک انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ درست رہا تو سارا بدن درست رہے گا اور اگر وہ خراب ہو گیا تو سارا بدن خراب ہو گا۔ آگاہ رہو کہ گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے۔

اور یہ بات جو حدیث میں وارد ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر

ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہو جاتی ہے۔اس کی ضد یہی قلب کی درستگی اور اصلاح ہے۔

(۲) دوسرا تزکیہ نفس ہے۔یعنی نفس کو رذیل اخلاق سے پاک وصاف کرنا اور اس کو اوصاف حمیدہ سے آراستہ کرنا۔اس کو تصوف کی زبان میں فناء نفس اور بقاء نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔اخلاق رذیلہ کے حرام ہونے سے متعلق اور اخلاقِ حمیدہ کے واجب ہونے سے متعلق شریعتِ مطہرہ اس حد تک بآواز بلند ناطق ہے کہ اس کی نظر میں اخلاقِ حمیدہ کے بغیر اعمال حوارج کی کوئی وقعت نہیں ہے۔نماز اور اس کے مانند اعمال ریا کے ساتھ اخلاص کے بغیر لہو ہے اور اکثر مباح اعمال نیت نیک کے ساتھ اجر وثواب کے مستحق ہیں اور قربِ الٰہی کے ان مقامات میں شامل ہو جاتے ہیں۔خدا رسیدہ صوفیاء جن کی تحصیل کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے تنصیص فرمائی ہے کہ (لا یزال عبدی یتقرب ۔الحدیث) میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ میں اس کو دوست بنالیتا ہوں۔پس جب اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

اس حدیث کو اربابِ وحدۃ الوجود اور اصحابِ وحدۃ الشہود ہر ایک نے اپنے اپنے فہم وذوق کے مطابق معانی پر حمل کیا ہے اور لا یزال کا کلمہ قرب کے درجات ومراتب کی عدم انتہا پر دلالت کرتا ہے۔پس صوفیاء کے یہ مطالب ،شریعت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں نہ کہ اعتبار کی راہ سے۔

پس متکلمین نے یہ جو بات کہی ہے کہ شریعت کے علاوہ جو بھی ہے وہ کوئی مطلوب

اور مقصود شئے نہیں ہے، صحیح ہے۔ کیوں کہ بعض متکلمین نے بعض ایسی چیزوں پر عمل نہیں کیا ہے جن کے متعلق شرعی احکام وارد ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو حج میسر نہیں ہوا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو فناء نفس وفناء قلب میسر نہ ہوسکا۔

اور صوفیاء نے یہ بات جو کہی ہے کہ اصل مطلوب فنا و بقاء اور استہلاک ہے اور دیگر احکام جن کے متعلق شریعت ناطق ہے وہ اعتبار کے پہلو میں نہیں ہے۔ یہ بھی حق اور صواب ہے۔ کیوں کہ نماز اور روزہ اخلاص کے بغیر کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے اور اسلام کے مراتب میں اصحاب کا مرتبہ شریعت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے صورت نوعیہ انسان جو زبانِ حال سے شریعت کو مبدأ فیاض یعنی اللہ تعالیٰ سے التماس کی تو سب سے پہلے فناء نفس وفناء قلب ہی کو طلب کیا۔

گو کہ ظاہر میں بعض افراد کو یہ دولت میسر نہ ہوی جیسا کہ بعض دوسرے افراد کو اعمالِ ظاہری بلکہ ایمان بھی میسر نہ ہوا۔

لقد خلقنا الانسان الایة یعنی انسان کی استعداد بلند و برتر ہے۔ شریعت تقاضہ کرتی ہے۔ فی احسن تقویم اسی سے کنایہ ہے۔ اور جب بعض افراد نے اس استعداد کو ضائع کر دیا تو اسفل السافلین میں بے عزتی کے ساتھ ڈھکیل دیے گئے۔

حاصلِ کلام! شیخ نے یہ بات کہی ہے کہ انسلاخ اور استہلاک کے مقدمات میں افراط اور ان میں ہر کس و ناکس کا مشغول ہونا، دین میں ایک مہلک اور سخت بیماری ہے۔ یہ بات فقیر کی فہم ناقص میں نہیں آرہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو یہاں تک کہ لوگ تم کو مجنون کہیں اور یہ حکم جمیع افراد انسان کے لیے عام ہے۔ انتہیٰ

مذکورہ توضیحات سے یہ حقیقت واضح ہوی کہ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک

شریعت ایک چیز ہے اور فناء و بقاء وغیرہ مطالبِ صوفیاء ایک دوسری چیز ہے۔ جیسا کہ بعض متکلمین کا بھی یہی موقف ہے۔

اور قاضی صاحب کے نزدیک جس طرح متکلمین کے مطالب شریعت سے ماخوذ اور مستفاذ ہیں اسی طرح صوفیاء کے مطالب بھی شریعت سے ماخوذ اور مستفاذ ہیں یہی ہے۔ چنانچہ صوفیہ کرام کا موقوف یہی ہے۔ اس لیے اکابر اولیاء اللہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے ''فتوح الغیب'' اور ''ملفوظات'' میں اور سند العلماء مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ''تفسیر عزیزیہ'' میں اور مولانا اسماعیل دہلوی نے ''صراط مستقیم'' کے ابتدا میں مطالبِ صوفیہ کو باطن شریعت سے تعبیر کیا ہے۔

نیز مولانا دہلوی کے نزدیک مطالبِ صوفیہ شریعت سے صراحتاً ہیں نہ اشارۃً بلکہ اعتبار کے طریق سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور قاضی صاحب کے نزدیک مطالبِ صوفیاء، شریعت سے صراحت اور اشارۃ دونوں طرح سے ماخوذ ہیں۔ نیز مولانا دہلوی کے نزدیک افراد کی خصوصیت کو اصل اقتضاء میں دخل ہے۔ اور قاضی صاحب کے نزدیک کمالات کی تحصیل میں افراد کو اصل اقتضاء ہی میں شرکت ہے۔ نیز مولانا دہلوی مطالب صوفیاء کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے قائل ہیں، لیکن قاضی صاحب ان کو آشکار کرنے کے قائل ہیں۔

اس لیے مختلف سلاسل کے مشائخ کبار و اولیاء کرام اور شیخ بہاء الدین زکریا، نظام الدین بداونی، نصیر الدین چراغ دہلوی، سید گیسو دراز بلکہ سید احمد مجاہد اور ان کے خلفاء وغیرہ نے بھی مطالبِ صوفیاء کو آشکار کرنے کا حکم دیا ہے اور عموماً لاکھوں کروڑوں اشخاص صوفیاء کے طریقہ میں بیعت کئے ہوئے ہیں اور ان حضرات کرام نے بھی افراد کی خصوصیت کا لحاظ کئے بغیر سارے لوگوں کو دعوت الی اللہ دی اور مطالبِ صوفیا کے سلوک میں مشغول کیا۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان صوفیاء نے كلموا الناس على قدر عقولهم

(الحدٰث) لوگوں کے ساتھ ان کے عقل وفہم کے مطابق کلام کرو، کے مصداق استفادہ کرنے والوں کوان کی عقل وفہم کے مطابق مسائل کو سمجھایا۔

حاصلِ کلام! یہ دونوں بزرگ مولانا دہلوی اور قاضی صاحب اگر چہ کہ ان امور میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن مطالب صوفیاء کی حقانیت اوران کی صحت ودرستگی سے متعلق دونوں متفق ہیں۔ اوراس بلند وبرتر جماعت کے عالی مرتبت ہونے پراوراس کی بزرگی وشرافت پر بھی متفق ہیں۔

اس مقام میں بعض عوام افراط وتفریط کا شکار ہیں اور عجیب وغریب راگ الاپ رہے ہیں کبھی مطالب صوفیاء کو دین سے علاحدہ کرتے ہیں اوران حضرات کو بھی گمراہ کہہ دیتے ہیں جوان مطالب کے قائل ہیں۔ اور کبھی لفظِ اعتبار سے مراد معتبر کا اعتبار کہتے ہیں، جو مولانا دہلوی کے کلام میں واقع ہے اور کبھی مطالبِ صوفیاء کو غیر واقع اور بے حقیقت خیال کرتے ہیں، مزید اس پر طرفہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس طرح کی راگ راگنی کے باوجود صوفیاء کے طریقہ میں بیعت کرتے بھی ہیں اور بیعت کراتے بھی ہیں۔ ان ھذالشئ عجاب: بے شک یہ بڑی عجیب بات ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۴)

# نبوت اور ولایت کی نوعیت کے خواص و احکام

# اور

# ادعیہ، اوراد، اذکار اور اعداد کی تعئین کا حکم!

شیخ کبیر شیخ صدرالدین قونیوی ''مصباح دوم'' کے لامع دوم میں نوعیت نبوت کے خواص اور احکام کے بیان میں تبصرہ فرماتے ہیں کہ ضابطۂ کلی (جس سے عالم ارض کا نظام منسلک رہتا ہے اور اس کو علم حدود اور احکام بھی کہتے ہیں مترجم) کا علم نبی کو کسی فردِ بشر کی تعلیم کے واسطے کے بغیر جبرئیل کی تائید اور تعلیم کے ذریعہ حاصل رہتا ہے۔

اور اسی طرح نبی کو وہ قدرت بھی حاصل ہوتی ہے جو امر الٰہی کے تحت اجسامِ عالم میں تصرف کرتی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریائے احمر میں راستہ بنایا اور عصا کو اژدھا بنا دیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کیا۔ اور اسی طرح جو قوت عوام کو خواب کی حالت میں مغیبات کے علم و ادراک کی حاصل رہتی ہے نبی کو بیداری کی حالت میں حاصل رہتی ہے۔

اور یہ تین خاصیتیں ہیں کہ علماء کے لیے ان کے علم و ادراک کی راہ کھلی ہوئی ہے۔

لیکن نوعیتِ نبوت کے خواص دوسرے ہیں۔ اور جو اصحابِ مکاشفات ہیں ان خواص کو وہ خوب جانتے ہیں۔ ان خواص میں سے افعال و اخلاق کے تشخص کی کیفیت، اعمال کے نتائج اور شرائع و احکام کے اسرار ہیں۔

جیسا کہ صاحبِ شریعت حضور اکرم صلوات اللہ علیہ جانتے ہیں کہ دو رکعت نماز پر اجر و ثواب کی مقدار کیا ہوگی اور ایک روزہ ثمرہ کیا مل سکتا ہے اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ

العلی العظیم جنت کے خزانوں میں ایک خزانہ کیوں کر ہے۔اور جو شخص ایک سو بار سبحان الله و بحمده پڑھ لے تو اس کے گناہ کیوں کر زائل ہوتے ہیں۔اور شب و روز میں پانچ نماز فرض ہونے کی علت کیا ہے؟ اور جب کسی شخص سے فرض نماز فوت ہوجائے تو وہ کس قدر عقوبت وسزا کا مستحق ہوگا۔اور سال بھر میں ایک ہی ماہ کے روزے کیوں رکھنا چاہیےاور زکوۃ میں ایک سال مکمل گزرنے پر بیس دینار پر آدھا دینار مستحق افراد پر کیوں صرف کرنا چاہیےاور مستحق لوگ کون ہیں اور وہ آٹھ ہی اقسام میں منحصر کیوں ہیں۔اور شب قدر کس لیے ہزار مہینوں سے افضل قرار پائی ہے۔اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ کیوں کر ہوگا اور ان مختلف مقداروں اور وقتوں کے تعیین میں کیا حکمت ہے اور ان مخصوص احوال و اعمال کو آخرت کی سعادت کے ساتھ کیا مناسبت ہے اور ہر ایک نیک و بد عمل کا نتیجہ کیا ہے اور وہ کیوں کر متعین ہوتا ہے۔

نیز اسی کتاب میں قونوی لکھتے ہیں:

امّت محمدیہ کی کامل ترین جماعت اولیاء کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اذواق، اطوار اور وضع وچلن کا ایک وافر حصہ حاصل ہے اور ان حضرات کو ورثۃ الانبیاء اور اولیاء کہتے ہیں اور درحقیقت یہی بزرگانِ دین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی، وارث اور جانشین ہیں۔زبانِ نبوت کا یہ اشارہ واشوقا الی القاء اخوانی من بعدی (میرے بعد آنے والے میرے بھائیوں سے ہائے میری ملاقات کا شوق) بھی اس مخصوص جماعت کی جانب ہے۔اور یہی انفاس قدسیہ علماء امتی کانبیاء سائر الامم (میری امت کے علماء ساری امتوں کے انبیاء کرام کی طرح ہیں۔) کے مصداق ہیں۔وممن خلفنا امة یھدون بالحق وبه یعدلون (اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتی ہیں اور اسی کے موافق انصاف بھی کرتی ہیں۔) یہ حضرات جب بلندی کی طرف

پرواز کرتے ہیں تو فائدہ حاصل کرتے ہیں اور نزول فرماتے ہیں تو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

نیز اسی کتاب میں رقم طراز ہیں:

نبوت تشریع جو ختم نبوت کی وجہ سے ان حضرات کے درمیان نہ رہی اس کے سوا انبیائے کرام کے دیگر تمام اذواق اور مکاشفات سے یہ حضرات بہرہ ور ہیں۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یا ابابکر لیس بینی و بینک فرق (اے ابوبکرؓ میرے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ مجھے نبوت عطا کی گئی۔) یا عمر لو لم ابعث لبعثت (اے عمرؓ! اگر میں نبی نہ ہوتا تو تم نبی بنادئے گئے ہوتے۔)

اور مولوی دہلوی یعنی مولانا شاہ اسماعیل دہلوی صراطِ مستقیم کے پہلے باب کی دوسری فصل میں لکھتے ہیں: اور شرعی حدود اور مظان حکم اور ان کے اشباح کو خود ان کی جگہ قائم کرنے اور عموماً نوع انسانی کی تربیت کے ارکان و آداب اور شرائط و مفسدات کے تعین و تقرر کرنے میں نیابت عن اللہ کا مقام اس مقام سے اعلیٰ و ارفع ہے اور یہ مقام مستقل طور پر تو انبیاء و مرسلین میں سے اصحابِ شریعت کا مقام ہے اور ان کی متابعت سے ظلی طور پر انبیائے کرام کے فرماں برداروں میں سے بعض بزرگوں کو بھی اس مقام سے کچھ حصہ ملتا ہے جن کو صوفیہ کی اصطلاح میں مفہمین کہتے ہیں۔ اور مقام کو ارباب تعلیم کے پیشوا اور اصحاب تفہیم کے مقتدا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اصطلاح میں قرب الفرائض کے مقام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انتہیٰ

شاہ اسمٰعیل صاحب ''صراطِ مستقیم'' کے خاتمہ میں لکھتے ہیں:

راہِ ولایت کے کمالات سے استفادہ حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقہ میں مجاہدات، ریاضات، اذکار، اشغال اور مراقبات متعین اور مقرر کئے گئے ہیں اور ان امور میں سے ہر ایک امر طالب کے نفس میں ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے اور ان اشغال کے ثمرات و نتائج برآمد ہونے کی وجہ سے ایک امرِ مستقر

طالب کے نفس میں پیدا ہوتا ہے اور وہ طالب اسی امر کے باعث عالم قدس سے تعلق اور ارتباط رکھتا ہے اور اس طالب کا اللہ تعالیٰ سے ارتباط کا سبب یہی امر ہے اور یہ امر ہمیشہ طالب کے نفس میں موجود رہتا ہے۔ خواہ طالب اس امر کی جانب توجہ کرے یا نہ کرے۔ ہاں! اس امر کی جانب توجہ اور ملاحظہ کرنے کی صورت میں اس کے آثار وعلامات منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ورنہ طالب کے جوہر نفس میں پوشیدہ رہتا ہے۔ اور صوفیاء کی اصلاحِ میں اس امر کو نسبت کہتے ہیں۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص حکمت کی کتابوں کے مطالعہ پر مداومت اختیار کر لے یا دیگر صنعت وحرفت مثلاً موسیقی، آہن گری اور صباغت (رنگنا) کے پیشے پر مداومت اختیار کر لے تو اس شخص کے نفس میں ضرور ایک مدت کے بعد ایک امر مستقر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کو صنعت کا کمال اور ملکہ کہتے ہیں اور یہ ملکہ ہمیشہ اس شخص کے نفس میں قائم رہتا ہے۔ خواہ وہ اس کی جانب وہ التفات کرے یا نہ کرے۔ جب یہ شخص اس ملکہ کی جانب التفات کرتا ہے اور اس کو بروئے کار لے آتا ہے تو اس کے آثار خارج میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ورنہ پردۂ خفا میں پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ انتہیٰ

نیز شاہ اسماعیل صاحب خاتمہ میں لکھتے ہیں:

اشغال، اذکار، مجاہدات اور مراقبات کی تعین وتحدید دراصل شریعت کا ظل ہے اور جو صاحب قرب الفرائض کے مرتبہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ بزرگ انبیاء کی قسم سے ہوں گے تو وہ ضرور جدید شریعت کے مالک ہوتے ہیں ورنہ ان کی اصل طبیعت سے وصول الی اللہ کے طریقوں کی ساخت اور تعین کا ملکہ فوارہ کے مانند ابل پڑتا ہے اور ایسی صورت میں تعلیم وتعلم کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ انتہی

مولانا شاہ ولی اللہ ''ہمعات'' میں تحریر فرماتے ہیں:

ہر طریقہ کو اوراد اور نوافل طاعات کے ذریعہ اوقات کے معمور رکھنے میں ایک خاص اور مخصوص وضع ہے۔ حضرت غوث الاعظم قدس سرہ نے ''غنیۃ الطالبین'' میں ایک وضع کا تعین کیا ہے۔ نیز مشائخ چشتیہ نے بھی ایک طریقہ مقرر کیا ہے۔ اور شیخ ابوالحسن شاذلی تو ایک حزب رکھتے ہیں اور میر سید علی ہمدانی اور ان کے شیخ الشیوخ کے اوراد و وظائف مشہور ہیں ۔اور امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں ایک کیفیت بیان کی ہے۔

نیز اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

یہ تمام طریقے اور اوضاع، محبوب، حسن اور احسن ہیں لیکن سب سے زیادہ محبوب طریقے وہ ہیں جو صحیح احادیث کے موافق ہوں۔

ان اسناد و دلائل سے مجاہدات، مراقبات، اذکار، ضربات، اوراد، معین اور غیر معین ہیئات کا محبوب ہونا اور ان کا خوب ہونا، مدلل ہو چکا ہے۔ ان امور کو صوفیاء اور اولیاء نے سلوک اور اوراد کی کتابوں میں بیان کیا ہے اور مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے ''الانتباہ'' میں اور ''قول الجمیل'' میں بیان کیا ہے اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے ''صراط مستقیم'' کے تیسرے باب میں ان امور کو بیان کیا ہے۔

لیکن یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ غالی اشخاص شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی پیروی کرنے کے دعوے کے باوجود مذکورہ امور کو بدعتِ ضلالت کہتے ہیں اور راہِ حق کے سلوک کے لیے رکاوٹ بن رہے ہیں۔ معاذ اللہ من ذالک

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۵)

## منتر و فسوں اور اوراد نامعلوم معنی کا حکم

شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج'' کی جلد اول کے چھٹے باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم شریف کی حدیث ہے۔عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں منتر وفسوں کا عمل کیا کرتے تھے۔ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ اس کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: تم اپنے منتر اور فسوں کے عمل کو میرے سامنے پیش کرو۔اس میں کسی طرح کا شرک نہ ہوتو، کرو کوئی حرج نہیں۔

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منتر وفسوں کے عمل سے منع فرمایا تو بعض صحابۂ کرام بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے نزدیک ایک عمل ہے جس کو ہم بچھو کا زہر دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔اس کے بعد اس عمل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھ رہا ہوں پھر فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے بھائی کو نفع پہنچائے تو اس کو چاہیے کہ ضرور نفع پہنچائے۔

علمائے کرام کی ایک جماعت نے اس عموم سے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ منتر و فسوں کا ہر وہ عمل جس کی منفعت وافادیت کا تجربہ کیا گیا ہو، اس کا کرنا جائز ہے۔اگر چہ کہ اس کے مطالب اور معانی معلوم نہ ہوں۔لیکن احتیاط ایسا عمل نہ کرنے میں ہے جس کے معانی ومطالب معلوم نہ ہوں، مبادا کہ اس میں کسی طرح کا شرک شامل ہو اور احتیاط کی یہ قید غیر ماثور الفاظ کے بارے میں ہے۔ورنہ الفاظ ماثورہ جن کے مطالب اور معانی معلوم نہ بھی ہوں تو بلا شبہ جائز ہے۔جیسا کہ بچھو کے زہر کو زائل کرنے کا یہ عمل: بسم اللہ شجۃ قرنیۃ ملحۃ

بحر قفطا۔ (اس کے معنی معلوم ہی نہیں ہیں) عوف بن مالکؓ کی حدیث سے تحقیق کے ساتھ یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہر وہ عمل جس میں شرک کی آمیزش ہو وہ تو ناجائز ہے اور اسی طرح سریانی اور عبرانی زبان میں اسمائے الٰہی کی دعائیں جن کے مطالب و معانی معلوم نہ ہوں تو ان کو نہیں پڑھنا چاہیے۔

اور مشائخ کرام کی حکایتوں میں آیا ہوا ہے کہ ایک شخص ایک دعا پڑھ رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص وہاں موجود تھا۔ کہنے لگا۔ اس کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کو گالیاں دے رہا ہے اتفاقاً دعا کے کلمات کا مضمون ایسا ہی تھا اور وہ شخص نادانستہ پڑھ رہا تھا۔

لیکن بعض وہ کلمات اور دعائیں جو ثقہ اہلِ علم سے معلوم ہیں جیسے ''حرز یمانی'' جس کا نام سیفی بھی ہے اور اس کے مانند دیگر اوراد اور وظائف کا پڑھنا مشائخ سے متوارثاً چلا آرہا ہے۔ (ان کے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔) واللہ اعلم

ان اسناد اور دلائل سے یہ بات واضح ہے کہ منتر وفسوں کے عمل میں، اور اوراد و وظائف میں شرک ہو تو وہ ممنوع ہے اور ماثورات (وہ دعائیں جو منقول اور ماثور ہیں) جن کے معانی اور مطالب معلوم نہیں ہیں ان کا پڑھنا بلاشبہ جائز ہے

اور غیر ماثورہ دعائیں جو معتمد اور ثقہ بزرگوں سے متوارث آرہی ہیں معانی کے لحاظ سے بغیر ان کا پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ منتر وفسوں اور اوراد و وظائف کے باب میں جو بات معتبر ہے وہ ہمت وارادہ اور دل کی توجہ ہے۔

اگر الفاظ کی معانی و مطالب، ہمت وارادہ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں تو یہ بات افضل اور احسن ہے۔ ورنہ الفاظ کے معانی و مطالب کا لحاظ شرط نہیں ہے۔ اگر معانی مشروط ہوتے تو عوام کو معانی کی فہم پر قدرت ہی نہیں ہے تو کیا نماز میں اور غیر نماز میں تلاوتِ قرآن کریم اور ماثورات مثلاً التحیات، دعائے قنوت، دعائے ماثورہ، مسبعات عشر وغیرہ پر ثواب

حاصل نہ ہوگا؟ اور بچھو کے زہر کو زائل کرنے کا عمل جس کا معنی ہی معلوم نہیں ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کرنے کا حکم نہ دیتے اور علماء کی ایک جماعت ایسے کلمات جن کے مطالب معلوم نہیں ہیں، ان کے پڑھنے کا حکم نہ دیتے۔

اس مسئلہ میں عوام بری طرح افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ چناں چہ حزب البحر، حزب البر، حزب النصر اور دیگر اوراد وظائف اور غیر ماثور دعائیں جو امام نووی، شیخ ابوالحسن شاذلی اور دیگر مستند علماء اور معتمد مشائخ سے متوارث چلی آرہی ہیں اور اکابر علماء اور صوفیاء میں بلا کسی رد وانکار کے سارے شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سب کو معانی کا لحاظ کئے بغیر پڑھنے کو ناجائز کہہ رہے ہیں اور غیر ماثور دعاؤں اور وظیفوں کو جو اکابر اور علماء اور صوفیاء سے منقول ہیں قربِ الٰہی اور ثوابِ اخروی کا ذریعہ نہیں سمجھ رہے ہیں، اور قربِ الٰہی اور ثوابِ آخرت کے اعتقاد سے اُن کے پڑھنے کو قباحات میں قبیح ترین کہہ رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۶)

# عاجزی و انکساری کی خوبی نفس کی تصغیر اور تکبر و خود پرستی کی برائی کے بیان میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من تواضع لله رفعة للّٰه: جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی وانکساری اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی عطا کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| آب بس بالا سے پستی کو پھرے | کیوں کہ پستی سے وہ بالا کو اڑے |
| گیہوں بالا سے گئے جو خاک میں | بعد وہ خوشۂ چالاک میں |
| تخم ہر میوہ زمیں میں آئے ہے | پھر زمیں سے سر کو باہر لائے ہیں |
| آسماں سے اصل نعمت تا بخاک | ہوگئی آکر غذائے جان پاک |
| چرخ سے از رہ تواضع آئے زیر | جزو انساں کے ہوئے زندہ دلیر |
| ہوگیا بس وصف مردم وہ جماد | اور اڑا وہ عرش کے میدان میں شاد |

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری نویں باب میں لکھتے ہیں:

اے برادر! جماعتِ صوفیاء کی روش یہ ہے یہ دوسروں کے بارے میں مکمل نیک گمان رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں مطلق نیک گمان نہیں رکھتے اور اپنے آپ کو کسی چیز کا مستحق اور سزاوار خیال نہیں کرتے نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اسی مکتوب میں رقم طراز ہیں:

اہلِ طریق کا اجماع ہے کہ جو شخص خود کو فرعون سے ذرہ برابر بھی بہتر خیال کرے وہ فرعون سے بدتر ہے۔ ایسا شخص اس طائفہ کی نظروں میں ہنوز متکبر ہے کیوں کہ اس کے اندر خود پرستی کے جذبات موجود ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: فلا تزکوا انفسکم: اپنے نفوس و ذوات کی تعریف اور ستائش نہ کرو۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا احب اللہ عبدا بصرہ فی عیوب نفسہ ۔جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنا محبوب بنالیتا ہے تو اس کی نظریں صرف اپنے نفس کے عیوب پر مرکوز رہتی ہیں۔ نیز آپؐ نے فرمایا طوبیٰ لمن شغلہ عیبہ عن عیوب الناس: خوش خبری ہے اس شخص کے لیے جس کو اس کے عیوب نے دوسروں کی عیب چینی سے باز رکھا۔

لہذا کسی شخص کا اپنے عیوب کی طرف نظر رکھنا، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور دوستی کی علامت ہے۔ اور دوسروں کے عیوب کی طرف نہ دیکھنا، یہ نیک نفسی اور اخلاقی خوبی کی علامت ہے۔ نفس کی اسی کیفیت کے باعث بزرگانِ کرام نے خود کو کتے اور پتھر بلکہ کافر فرنگ سے بھی بدتر خیال کیا اور فرشتوں پر سبقت لے گئے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

تواضع کند ہوش مندے گزیں نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں
ازاں بر ملایک شرف داشتند کہ خود را بہ از سگ نہ پند اشتند

عقل مند شخص عاجزی وانکساری اختیار کرتا ہے اور شاخِ پر میوہ ہی زمین پر جھکی رہتی ہے۔ اسی عاجزی اور فروتنی کے باعث اربابِ بصیرت فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو ایک کتے سے بھی بہتر خیال نہیں کرتے۔

اسی سے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ غرور و پندار اور خود بینی و خود پرستی ایک مذموم خصلت ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے آدمی اپنے آپ کو بہتر اور خود کو دوسروں پر مقدم و برتر

خیال کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کیفیت کا نام تکبر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اعوذبک من نفحة الکبر: اے اللہ! میں تجھ سے غرور و تکبر اور خود بینی و خود پرستی سے پناہ طلب کرتا ہوں۔ کیوں کہ جب یہ چیز کسی آدمی میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دوسروں کو اپنے سے کم تر اور حقیر خیال کرنے لگتا ہے۔

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا، جس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی غرور و تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا: ایک ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو بزرگی اور برتری اور اپنی عظمت و بڑائی کو اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نام بھی ظالم و جابر اشخاص کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اور وہ سارے عذاب جو ظالموں اور جباروں کو پہنچنے والے ہیں، اس کو بھی پہنچیں گے۔

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا: متکبر اور مغرور انسانوں کو قیامت کے روز چیونٹی کی شکل و صورت میں اٹھایا جائے گا۔ تاکہ یہ لوگوں کے پیروں تلے دبے پڑے رہیں۔ اور ان پر یہ حقیقت آشکار ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی ذلت و خواری کا کیا عالم ہے۔

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص عاجزی اور انکساری نہیں اختیار کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی عطا نہیں کرتا۔

نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا: ہر شخص کے سر کے پیچھے ایک لگام ہوتی ہے جس کو دو فرشتے تھامے رہتے ہیں۔ اگر وہ شخص عاجزی و انکساری اختیار کرتا ہے تو فرشتے لگام کو اوپر کی طرف کھینچتے ہیں اور دعا کرتے ہیں: اے خداوند! اس کو رفعت و سربلندی عطا فرما اور اگر وہ شخص غرور و تکبر اختیار کرتا ہے تو لگام کو نیچے کی طرف کھینچتے ہیں اور دعا کرتے ہیں: اے خداوند! اس کو ذلت و پستی عطا کر۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: کبر کیا ہے؟ فرمایا حق کے سامنے گردن نہ جھکانا اور لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ یہی دو خصلتیں ہیں جو ایک بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں اور ان ہی دو خصلتوں کی کوکھ سے تمام برے اخلاق جنم لیتے ہیں اور آدمی تمام اخلاقِ حسنہ سے دور ہو جاتا ہے کیوں کہ جس شخص پر اپنے برتر ہونے اور اپنے نفس کے نیک ہونے اور اپنی شخصیت کے بزرگ ہونے کا مزاج غالب ہو جائے اور جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہ دوسروں کے لیے ناپسند کرے تو یہ بات اہلِ ایمان کے موافق نہیں ہے اور کسی شخص کے ساتھ تواضع کے ساتھ نہ پیش آئے تو یہ اہلِ تقوٰی کی صفت نہیں ہے۔ ایسا آدمی بغض وحسد اور دشمنی سے بچ نہیں سکتا اور غصہ پر قابو نہیں پا سکتا اور زبان کو غیبت سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اور جو کوئی اس کے ساتھ تعظیم وتکریم سے نہ پیش آئے تو دل میں کدورت قائم کر لیتا ہے اور وہ شخص اس کی نظر میں حقیر ہو جاتا ہے۔ یہ تمام برائیاں اس لیے جنم لیتی ہیں کہ متکبر شخص ہمیشہ اپنے آپ میں مست اور اپنی پرستش میں منہمک اور اپنے کاموں کی عظمت ظاہر کرنے میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عظمت اور بڑائی اور اپنے کاموں کی شان وشوکت قائم رکھنے کے لیے مکر وفریب، نفاق وشقاق اور دروغ گوئی کے دلدل میں پھنسا رہتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک ایمان کی بو نہیں سونگھ سکتا جب تک کہ وہ خود کو فراموش نہ کرے بلکہ وہ دنیاوی راحت کی بو بھی نہیں سونگھ سکتا۔

تکبر کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص علم نافع مثلاً تفسیر قرآن، احادیث، سلفِ صالحین کی سیرت اور ان علوم کی اقسام جو کیمیاء اور احیاء میں مذکور ہیں، پڑھ لے تو متکبر ہو جاتا ہے اس شخص کا تکبر میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دراصل اس کا باطن خبیث اور گندہ ہوگا اور بداخلاق اور بدکردار ہوگا اور تعلیم سے اس کا مقصد بولنا (لکچر دینا) اور

اس کے ذریعہ خود کو آراستہ و پیراستہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ گناہوں سے پرہیز کرنا۔ پس جب علم اس کے باطن میں پہنچتا ہے تو اس کے باطن کی صفت اختیار کر لیتا ہے جیسے جب دوا معدہ میں پہنچتی ہے تو پرہیز سے پیشتر معدہ کے اخلاط کی صفت اختیار کر لیتی ہے جیسا کہ آسمان سے نازل ہونے والا شفاف پانی ایک ہی صفت کا حامل رہتا ہے لیکن جب وہ کسی پودے کے اوپر گرتا ہے تو اس کی صفت کو بڑھا دیتا ہے۔ اگر وہ پودا تلخ صفت کا حامل ہے تو اس کی تلخی میں اضافہ کر دیتا ہے اور اگر وہ پودا شیریں صفت ہو تو اس کی شیرینی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک قوم ہوگی جو قرآن پڑھے گی لیکن قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، مگر پھر بھی کہیں گے وہ کون ہے جو ہماری طرح قرآن پڑھ سکے اور وہ کون ہے جو اتنے معلومات رکھتا ہو، جتنے ہم رکھتے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی طرف نظر کی اور فرمایا: وہ لوگ تم میں سے ہوں گے یعنی میری امت میں سے ہی ہوں گے۔ مگر وہ تمام دوزخ کا چارہ ہونگے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مغرور اور متکبر علماء نہ بنو۔ کیوں کہ اس وقت تمہارا علم تمہارے جہل کے ساتھ وفا نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجزی اور فروتنی اختیار کرنے کے لیے کہا ہے۔ واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین۔

اور یہ حکم ربانی عالم کے لیے عظیم ترین حجت ہے اور اس کی آزمائش بھی زیادہ ہے کیوں کہ ایک بے علم کی لغزش نظر انداز کی جاتی ہے لیکن ایک عالم کی لغزش قابل فروگذاشت نہیں ہوتی۔ لہذا ایک عالم کی معمولی غلطی بھی عظیم ترین غلطی شمار ہوگی۔

ایک عالم کی ذمہ داریوں اور خطرات سے متعلق حدیثوں میں جو باتیں آئی ہوئی ہیں ان پر غور و تامل کرنا چاہیے۔ اللہ نے قرآن کریم میں ایک عالم کو جو اپنے علم پر کوتاہی اور تقصیر کرنے والا ہو ایک گدھے کے مانند قرار دیا ہے جو اپنی پشت پر کتابوں کا بوجھ اٹھائے

ہوئے ہے: کمثل الحمار یحمل اسفارا: اور ایک کتے کے مانند قرار دیا ہے:

کمثل الکلب ان تحمل علیه یلهث او تترکه یلهث۔ یعنی اگر جانتا ہو اور اگر نہ جانتا ہو دونوں حالتوں میں اپنی فطرت اور طبیعت سے علاحدہ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کتے اور گدھے سے زیادہ خسیس اور نالائق کون ہو سکتا ہے؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر وہ آخرت میں نجات نہیں پا سکتا تو جمادات اس سے افضل قرار پائیں گے۔ بلکہ ایسی صورت میں وہ حیوانات کے مرتبہ کو بھی کیا پہنچ سکتا ہے۔

یہی وہ منزل ہے جس کے باعث صحابۂ کرامؓ میں سے ایک صحابیؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: کاش! میں ایک مرغ بن گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ اور ایک دوسرے صحابیؓ فرماتے ہیں: کاش! میں ایک بکری ہو گیا ہوتا تو بہتر تھا تاکہ ذبح کیا جاتا اور کھایا جاتا۔ اور ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کاش! میں ایک گھاس ہو گیا ہوتا تو بہتر تھا (تاکہ میں حساب و کتاب کی آزمائش اور عقاب و نجات سے آزاد رہ سکتا۔)

غرض جس شخص کے پیشِ نظر آخرت کے خطرات اور آزمائشیں ہوں وہ کبھی غرور و پندار میں مبتلا نہیں رہ سکتا بلکہ اس کی قلبی کیفیت یہ ہوگی کہ اگر کسی شخص کو اپنے سے کم علم اور جاہل و نادان دیکھے تو کہے گا کہ یہ شخص جانتا نہیں ہے لہذا گناہ و معصیت کے معاملہ میں معذور قرار پائے گا اور یہ مجھ سے بہتر ہے اور اگر کسی شخص کو اپنے سے بڑھ کر علم و فضل والا دیکھے تو کہے گا کہ یہ تو ایسی چیزوں کا علم رکھتا ہے جن کو میں نہیں جانتا اور یہ مجھ سے افضل ہے۔

اور اگر کسی معمر بوڑھے آدمی کو دیکھے تو کہے گا کہ اس شخص نے مجھ سے زیادہ اللہ کی اطاعت و بندگی کی ہے اور یہ مجھ سے افضل ہے اور اگر کسی بچے کو دیکھے تو کہے گا میں تو بے شمار گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہوں اور اس کا دامن گناہوں کی آلودگی سے پاک و صاف ہے اور یہ مجھ سے افضل ہے۔ حتی کہ اگر کسی کافر کو بھی دیکھے تو غرور و تکبر نہیں کرے گا اور یہ کہے گا کہ

ہوسکتا ہے یہ مسلمان ہوجائے اوراس کی عاقبت سنور جائے اور میرا خاتمہ کفر پر ہوجائے کیوں کہ بہت سارے لوگوں نے حضرت عمرؓ کو اسلام قبول کرنے سے پہلے دیکھا اوران پر تکبر کیا اور یہ تکبر اللہ کے علم میں ایک غلطی تھی۔

پس جب بزرگی اور عظمت آخرت کی نجات میں مضمر ہے اور یہ غیب کی چیز ہے تو ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی اپنی آخرت کی فکر میں مشغول رہے۔ تا کہ اس کے اندر کبر ونخوت پروان نہ چڑھ سکے۔ کذا فی الکیمیاء

حاصل کلام! نیستی، آئینۂ ہستی ہے۔ یعنی اپنے آپ کو فنا کرنا ہی بقاء کا پیش خیمہ ہے۔

## مثنوی

بولا تحفہ ڈھونڈا بس تیرے لیے — تیرے لائق نے ملا، تحفہ مجھے
آئینہ دیکھا کہ لائق اس کے ہے — مثلِ نور سینہ لایا ہوں اسے
دیکھے تا اس میں تو روئے خوب کو! — شمع گردوں مثلِ خورشید جو ہے تو
آئینہ ہستی کا کیا ہے نیستی — نیستی لے گر نہ رکھے احمقی!
جس نے نقصانوں کو اپنے پالیا — وہ کمال اپنے کا بس طالب ہوا
اس لیے نے جائے سوئے ذوالجلال — ہے گماں اس کو کہ حاصل ہے کمال
کچھ مرض بدتر زپند ار کمال — نشیں ہے تیری جاں میں اے بدخصال
دیدہ و دل سے تیری خوں ہو رواں — تب یہ نخوت تجھ سے ہو محو و نہاں
علتِ ابلیس انا خیر سے ہے — یہ مرض ہر نفس میں ہے خلق کے
گرچہ دیکھے ہے شکستہ آپ کو — آبِ صافی اور گوبر زیر جو
فلسفی جو منکرِ حنانہ ہے — انبیاء کے جس سے وہ بیگانہ ہے
فلسفی جو منکر جو ہے شیطان سے — اس گھڑی شیطان حاوی اس پہ ہے
گر نہ شیطان دیکھا خود کو دیکھ لے — بے جنون پیشانی کب نیکی ملی

اس لیے ہنستا ہے تو شیطان پر — کہ تو جانے آپ کو عمدہ بشر

ناز نیں تو ہے پر اپنی حد میں ہے — اللہ اللہ مت بڑھے مقدار سے

مار حیوانوں کو انساں کے لیے — مار انسان ہوش جاں کے واسطے

اس لئے کفار کا خون ہے روا — خون وحشی طیر کا جوں ہے روا

ان کے زن فرزند جملہ سبیل! — کیوں کہ ہیں بے عقل گمراہ و ذلیل

آندھی نخلوں کو ادھیڑے اصل سے — اور عاجز گھانس پر احساں کرے

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ عبد کا لفظ اپنے اندر بہت معانی اور مطالب رکھتا ہے۔ کبھی اس کا استعمال انسان کے معنی میں ہوتا ہے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وانه لما قام عبدالله اور کبھی بندہ (مملوک) کے معنی میں آتا ہے چناں چہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم و امائکم اور کبھی مجازاً خادم اور فرماں بردار کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک التلمیذ عبد لا یعتق الا بالموت اور حافظ دمیری صاحب حیٰوۃ الحیوان، نے لفظ اِوَزّ (بط۔ مرغابی) کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کنت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فكنت عبده و خادمه

قرآن و حدیث اور سلف و خلف کے محاورہ میں مجاز کا استعمال عام طور پر موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واذا تليت عليهم آياته زادتهم ايمانا (۲) يذبح ابنائهم (۳) ينزع عنهما لباسهما (۴) يوما يجعل الولدان شيبا (۵) واخرجت الارض اثقالها اور مومن کا یہ کہنا انبت الربيع البقل ۔ جیسا کہ اس کی تفصیل معانی کی کتابوں، تلخیص، مختصر اور مطول وغیرہ میں موجود ہے

اور یہ بات جو مشکوٰۃ کی حدیث میں آئی ہے: لا يقولن احدكم عبدى و امتى :

تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ یہ میرا غلام ہے اور یہ میری کنیز ہے۔عبد کے اطلاق کی یہ ممانعت برسبیل تحقیر ہے یعنی کسی کو حقیر جانتے ہوئے غلام اور باندی نہ کہا جائے۔ چناں چہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

غلام اور کنیز کا لفظ استعمال کرنے کی ممانعت ایک تقدیر پر ہے کیوں کہ اس کا استعمال غرور وتکبر، تحقیر وتذلیل اور تصغیر کے ساتھ ہوگا ورنہ غلام اور کنیز کے لفظ کا مطلق استعمال قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں موجود ہے۔

امام ربانی نے اپنے بعض مکتوبات میں خود کو اپنے شیخ خواجہ عبدالباقی کا غلام اور بندہ لکھا ہے۔ یہ خادم اور فرماں بردار کے معنے میں ہے اور لفظ عبد عاجزی اور فروتنی کو ظاہر کرنے ولا ہے۔اس طرح امام موصوف نے اپنے بعض مکتوبات میں خود کو کافر فرنگ سے بھی بدتر تحریر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کلمات اور الفاظ کے ذریعہ عاجزی وانکساری اور تواضع کا اظہار مقصود ہے۔اس مقام پر مولانا روم کی یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے جو انھوں نے اپنی مثنوی میں بیان کی ہے:

''میں اس کے سوز وعشق کے سبب دیوانہ ہوں اور اس کے خیالات سے سوفسطائی کے مانند ہوں اس کو ہمنوا بنانے میں سرگرداں ہوں اور میں اس کے سوز کے باعث حیراں ہوں''

مولانا بحرالعلوم پہلے بیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب مسببات کو بغیر اسباب کے پیدا فرماتا ہے جو مسببات کے ان اسباب کے ساتھ مربوط رہتے ہیں اور میں جب ان اسباب کو درمیان میں نہیں دیکھ پاتا تو سودائی ہوجاتا ہوں۔ کیوں کہ وہ حقائق کو خیال تصور کرتا ہے۔انتہٰی۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ حیرانی وسرگردانی کے بیان میں مولانا روم کا یہ قول عاجزی کو ظاہر کرتا ہے۔

نیز یہ بات بھی واضح ہو کہ مولانا باقر آ گاہ نے اپنی تصنیف ''تحفۂ احسن'' میں اپنے مرشد حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی کو جو قبلہ اور کعبہ لکھا ہے اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے ''صراط مستقیم'' میں اپنے مشائخ کو مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو جو مرجع عالم لکھا ہے یہ سب مجاز کے طور پر ہے نہ کہ حقیقی معنی میں اور مجاز کا استعمال کتاب وسنت اور علماء وعرفاء کے محاورہ میں شائع اور ذائع ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اس طرح کے القاب اور کلمات کا استعمال بھی عاجزی وفروتنی اور تواضع کو ظاہر کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ بھی جان لیا جائے کہ بعض فقہی روایات میں لاباس بوضع الخدین آیا ہوا ہے چناں چہ ''شمائل الاتقیاء'' کے مصنف جامع الصغیر غیاثی کی روایت سے نقل کرتے ہیں: لا باس بوضع الخدین بین یدی المشائخ۔ مشائخ کرام کے سامنے جبہ سائی میں کوئی حرج نہیں۔ صاحب ''النہایہ'' نے لکھا ہے کہ امام رملی نے جواز کا فتوی دیا ہے کہ اولیاء اللہ کے آستانوں کو تبرک کے خیال سے بغیر کسی کراہت کے بوسہ دے سکتے ہیں۔ صاحب ''مصباح الانام'' فرماتے ہیں۔ علامہ سبکی شافعی اپنی وسعتِ علم اور مقام کی عظمت کے باوجود دارالحدیث میں اپنے رخساروں کو گھستے تھے۔ شاید کہ امام نوویؒ کے پڑے ہوئے قدموں کی جگہ ان کے رخسار مَس ہوسکیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔ لعلی ان امس بجروجھی : مکانا مسه قدم النووی

غرض مولانا شاہ ولی اللہ محدث نے ''الانتباہ'' میں کشفِ قبر کے بیان میں رخسار رکھنے کا جو حکم صادر فرمایا ہے وہ اسی روایت کی بنیاد پر ہے۔ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنے رقعات میں لکھا ہے کہ مولانا عبیداللہ احرار کی خدمت میں زمین بوسی عرض ہے اور شاہ اسماعیل دہلوی نے ''خاتمہ صراط مستقیم'' میں خود کو سید احمد مجاہد کے آستانہ کو چومنے والوں میں شمار کیا ہے۔ ان تمام اقوال کی بنیاد بھی اسی روایت پر ہوگی اور یہ سارے خیالات ،ورکلمات

عاجزی وفروتنی اورتواضع کوظاہر کرنے والے ہیں۔

دونوں جماعتوں کے طاعن اشخاص ان امور و مسائل میں ایک دوسرے کے بزرگوں کی تکفیر و تضلیل کر رہے ہیں اور داد فساد و عناد دے رہے ہیں اور اس سارے افراط و تفریط کا منشاء خود بینی اور خود پرستی ہے اور اپنی شخصیت کے بہتر ہونے کا دعوٰی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ عاجزی وفروتنی اور تواضع کی راہ پر گامزن رہ سکیں۔ اور غرور و تکبر اور خود پرستی کے دعوؤں سے احتراز کر سکیں۔ انه قریب مجیب۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۲۷

# در باب عشق

واضح رہے کہ عشق بہیمی مذموم ہوتا ہے اور وہ رذایل کی فہرست میں ہے اور عشق نفسانی محمود ہوتا ہے اور وہ فنون و فضائل میں سے ہے۔ ملا جلال الدین دوانی ''لوامع الاشراق'' میں فرماتے ہیں:

یہ بحث بہیمی سے متعلق ہے، جس کا منشا شہوت کی انتہا اور افراط ہوگا۔ لیکن عشقِ نفسانی جس کے آغاز کا مقام تناسب روحانی ہے، رذائل کی فہرست میں نہیں ہے بلکہ یہ فضائل میں شامل ہے۔

نیز اسی میں رقم طراز ہیں کہ نفسانی اور بہیمی عشق کے درمیان فرق و امتیاز کرنا مشکل ہے اور ہر شخص کے اندر طبیعت کے دواعی اور شہوت کی قوتوں کے غلبہ پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ ہر ہوسنا کے چہ داند جام دسندان باختن۔ ہوا و ہوس کا شکار آدمی کھرے کھوٹے اور جام و سبو کی حقیقت کیا جان سکتا ہے۔

ارباب طریقت جوراہِ عشق کو نامرادی کے اقدام سے روندنے کی طاقت رکھتے ہیں اور موتِ ارادی کے ذریعہ جسمانی رغبتوں اور شہوانی لذتوں کو ختم کرسکتے ہیں، کبریت احمر واکسیر سے بھی زیادہ عزیز تر ہیں۔ اور اکثر اشخاص ہوائے نفسانی کے چنگل میں گرفتار ہیں اور طبیعت کی غلامی سے آزاد نہیں، وہ فسق کو عشق کا نام دے رہے ہیں اور بہیمی صفات سے متصف رہ کر کمالِ انسانی کا دعوٰی کر رہے ہیں اور شہوت کی غلامی میں مبتلا رہ کر آزادگان کے مقام کی خواہش رکھتے ہیں۔

نیز اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

وہ علامت جس کے ذریعہ نفسانی اور بہیمی عشق کے درمیان فرق وامتیاز کیا جاسکتا ہے جیسا کہ امام غزالی نے اپنی بعض تصانیف میں پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حسن و جمال سے اس طرح کی لذت پائے جس طرح کہ سبزہ زاروں اور آبِ رواں کے دیکھنے اور ان کے نظارہ سے پاتا ہے تو یہ شہوت کے سرد ہونے کی نشانی ہے ایسی صورت میں اس شخص کے لیے نظر کرنا جائز ہے۔ اور اگر ایسی لذت پائے جو شہوت کی تحریک کی شروعات کرسکتی ہے تو یہ شہوت بہیمی کی جنبش ہے۔ لہذا ایسے شخص کے لیے نظر کرنا حرام ہے۔

امام غزالی کے علاوہ دیگر حکماء نے کہا ہے عشق نفسانی میں میلان اور خواہش، حرکات وسکنات اور گفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔ اعضاء اور تناسب اعضاء کی بہ نسبت، کیوں کہ نفس کا رجحان اور میلان جسمانیات کے مقابلہ میں روحانیات کے ذریعہ زیادہ ہوتا ہے اور عشق کے باب میں بحث اس قبیل کی نہیں ہے کہ عشق پر ادھر ادھر سے چند چیزیں جمع کر کے فریبِ عمل کی ادائیگی حق کی داد دی جاسکے۔ اس لیے اتنی سی بحث پر اکتفا کرتے ہوئے اصل موضوع کی جانب رجوع کیا گیا۔ راستیٔ گفتار و کردار اور عصمت کا مالک اللہ ہی ہے۔

مولانا عبدالرزاق کاشی ''شرح منازل السائرین'' میں فرماتے ہیں کہ:

پاکیزہ عشق، عشقِ حقیقی کی تیاری میں اور راز کی بات کو لطیف بنانے میں قوی ترین سبب ہے۔ کیوں کہ وہ سارے غموں کو ایک ہی غم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور قلب کے انتشار و پراگندگی کو ختم کر دیتا ہے اور محبوب کی خدمت کو لذیذ بنا دیتا ہے اور اس کے حکم کی تعمیل اور اس کی فرماں برداری میں تعب و مشقت کو سہل بنا دیتا ہے برخلاف اس عشق کے جو سلطانِ شہوت کے غلبہ کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہو اور بلاشبہ یہ وسواس ہے، جو بعض صورتوں کے شمائل کو استحسان میں غور و فکر کے غالب ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بے شک یہ تحصیل لذت نفس میں نفس کی عبادت کرنا ہے۔

اور بعض علماء، عرفاء اور حکماء کے کلام میں ان ہی دو قسموں پر عشق ظاہری و مجازی کی مدح و ذم کا انحصار ہے۔

مولانا سید عبداللہ دہلوی المعروف بہ شاہ غلام علی نقشبندی مجددی خلیفۂ مرزا مظہر جان جاناں اپنے شیخ کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

عشقِ مجازی افسردہ دلوں میں حرارت پیدا کرنے کے لیے آتشِ الٰہی ہے بشرطیکہ عاشق و معشوق کے درمیان ملاقات نہ ہوئی ہو تاکہ آبِ وصال، دل کی حرارت کو سرد نہ کر سکے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی مناسبت سے کہا گیا جس شخص کے اندر جنون انگیز عشق نہ ہو اس پر طریقت حرام ہے۔ انتہی

حاصل کلام! عشق اگرچہ کہ مجازی ہو، وہ بھی ایک انمول گوہر ہے۔ ایک ایسے دل کو جو سو ٹکڑوں میں منقسم ہو اور ہر ٹکڑا ایک آوارہ مقصد کے درپے ہو ایسے پراگندہ دل کو ایک ہی جہت میں جمع کرتا ہے اور اس کو عشقِ حقیقی تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی لیے اکابر صوفیاء عشقِ مجازی کی توصیف میں رطب اللسان ہیں اور کہا ہے کہ مجاز، حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں:

عشق سے چہرہ نہ پھیرا گرچہ کہ مجازی ہی کیوں نہ ہو۔اس لیے کہ وہ بھی عشقِ حقیقی کے لیے معاون ومددگار ہے اور عشق ایک ایسی بے بہا دولت ہے کہ اس کا مالک معشوق کے دیدار ہی کو سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے۔جس شخص کے دل میں کسی محبوب کا غم نہ ہوتو وہ دل سینہ میں ایک باغ ہے جس کے دل میں کسی کام کا غم ہوتو وہ دل سینہ کے اندر ایک بیمار ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر مولانا شاہ اسماعیلؒ دہلوی نے صراطِ مستقیم کے پہلے باب میں حب عشقی، جس کو حب نفسانی بھی کہتے ہیں راہ ولایت کا سرمایہ اور پونجی کہا ہے۔اسی سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ عشق انسانوں کے خواص میں سے ہے کیوں کہ اس آیتِ طیبہ یحبونہم و یحبونہ کے مخاطب انساں ہیں اور اس دولت (عشق) سے حیوان محروم ہیں اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ جس شخص میں عشق کی حرارت نہ ہو وہ ایک ناسمجھ بیل ہے۔اس دولت (عشق) سے فرشتے بھی محروم ہیں اسی لیے حدیث شریف میں ہے: کہ اللہ تعالیٰ کے اسم ''الودود'' سے فرشتے بے خبر ہیں۔

حاصلِ کلام! عشق خواہ دنیاوی ہو یا الٰہی، انسان کے خواص میں سے ہیں لیکن عشقِ الٰہی انسانِ کامل کا خاصہ ہے۔

عشق کسی بھی مخلوق کے اندر نہ ہوگا عاشقِ خدا، خدا رسیدہ شخص کے سوا کسی میں نہ ہوگی

نیز جاننا چاہئے کہ عشق کی لذت کو غیر عاشق نہیں جان سکتا من لم یذق لم یعرف جو شخص جس چیز کا ذائقہ نہیں چکھتا وہ اس کی حقیقت کو بھی نہیں جان سکتا۔'' اور محبوب کے دیدار کی لذت کو ایک عاشق اپنی زبان پر نہیں لا سکتا اگر کوئی شخص اللہ کو پہچان لے تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔''

ہزاروں اشخاص نے اپنی آنکھوں سے لیلیٰ کا دیدار کیا۔لیکن دیدار کی جو لذت

مجنوں کونصیب ہوئی وہ کسی اور شخص کو میسر نہ ہوسکی۔ کہا! اس کے رخسار تو نے کہاں دیکھا ہے۔ اس کے دیدار کے لیے تو مجنوں کی آنکھیں چاہیے، جب تک تیرے اندر مجنوں جیسا عشق نہ ہوتو صحیح معنوں میں اس کا دیدار نہیں کر پاتا۔ اگر تو میری آنکھوں سے اس کا دیدار کرتا تو اس کی گلی کی خاک کو بھی سرمہ بنالیتا۔

عشق محمود کے باب میں دونوں جماعتوں کے طاعن اشخاص میں سے ایک گروہ شیخ سعدی اور علامہ جامی کو بے ہودہ گو خیال کرر ہا ہے تو دوسرا گروہ مولانا شاہ اسماعیل دہلوی کو بے ہودہ گو قرار دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ طاعن اشخاص عشق محمود اور عشق مذموم کے درمیان فرق نہیں سمجھ پار ہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۲۸)

# مرشد کے ساتھ قلبی ارتباط کا مراقبہ یا تصور شیخ

یہ بحث مرشد کے ساتھ ذہنی تعلق اور قلبی ارتباط کے مراقبہ میں ہے جس کو صوفیاء کی زبان میں شغل برزخ کہتے ہیں۔ صاحب کتاب الوصایا شیخ معروف مولانا زین الدین خوافی نے سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کے حوالہ سے یہ آٹھ شرطیں بیان کی ہیں جو ترکِ دنیا اور وجدان کی صحت اور خلوت کے فائدے سے متعلق ہیں :

(۱) ہمیشہ وضو کے ساتھ رہنا (۲) ہمیشہ خلوت میں رہنا (۳) ہمیشہ روزہ سے رہنا (۴) سوائے ذکر کے ہمیشہ خاموش رہنا۔ (لیکن ذکرِ الٰہی جاری رہنا) (۵) ہمیشہ ذکر میں رہنا

(٦) خیالات کی نفی کرنا۔ خواہ اچھے ہوں یا برے (٧) ہمیشہ مرشد کے ساتھ ذہنی تعلق اور قلبی ربط رکھنا۔ (٨) اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ کرنا اور مرشد پر اعتراض نہ کرنا۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قضاوقدر پر راضی ہونا۔

یہ شرائط جواہر السلوک کے ۳۱ ویں فائدہ میں حوالۂ قلم کئے گئے ہیں۔ فقیر ساتویں شرط کومن وعن کتاب مذکور سے یہاں نقل کررہا ہے۔ وہ ساتویں شرط یہ ہے:

تسلیم ورضا اور محبت والفت اور طاعت وفرماں برداری کے وصف کے ساتھ اور حسنِ اعتقاد واستمداد کے جذبات کے ساتھ مرشد سے ذہنی تعلق، قلبی ربط ہمیشہ رکھنا اور اس عقیدہ کے ساتھ کہ مرشد ایک ایسا مظہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے فائدے کے لیے متعین کیا ہے اور مجھے صرف اسی کی ذات سے فائدہ حاصل ہوگا اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں۔ اگرچہ کہ دنیا مشائخ سے بھری ہی کیوں نہ رہے۔ اور مرید کے دل میں اپنے مرشد کے سوا دوسرے کی جانب جب تک رجحان ومیلان رہے گا اللہ تعالیٰ کے بارے میں شرحِ صدر نصیب نہ ہوگا۔

پس انسان کئی جہتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے ایک بدن ہے اور ایک روح ہے اور اللہ تعالی جہتوں کی قید سے پاک وصاف ہے۔ پس اس کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ جو شخص صاحب جہت ہے وہ اس فیض حق سے استفادہ کرے جو کسی بھی جہت میں نہیں ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس بدنِ انسانی کے لیے جو بے حد وحساب کثرتوں سے مرکب ہے ایک ایسی جہتِ واحدہ متعین فرمادیا کہ انسان کی توجہ اس جہت واحدہ کے ذریعہ بارگاہِ وحدہ الٰہیہ تک پہنچ جائے اور عالم اجسام وابدان میں وہ جہت وحدہ، کعبۃ اللہ ہے۔

اور اس طرح روحِ انسانی کے لیے جو بھی صفات الٰہیہ کے انوار وبرکات کے نزول کا مقام ہے ایک ایسی جہت واحدہ متعین فرمادیا کہ انسان کی توجہ اس جہت واحدہ کے ذریعہ

اللہ تعالیٰ کی جانب قائم ہو جائے اور یہ جہت، عالمِ ارواح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ ہے۔

پس جس طرح کعبۃ اللہ کی جانب توجہ نہ ہو تو نماز قبول نہیں ہوتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب بھی توجہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کی جائے اور آپ کو ذہن و قلب کی گہرائیوں سے تسلیم نہ کیا جائے اور آپ ﷺ کی نبوت سے قلبی ارتباط نہ قائم کیا جائے۔ کیوں کہ تمام انبیائے کرامؑ میں آپ ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ اور ایک رابطہ ہے۔ اگر چہ کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور سب حق پر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے فیض کا حصول صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ذہنی تعلق اور قلبی ربط ہی سے ہوگا۔

پس بدن کی توجہ ایک ہی جہت کی طرف ہو اور روح کی توجہ بھی ایک ہی جہت کی طرف ہونے سے ہی انسان کو اللہ تعالیٰ سے فائدہ حاصل کرنے کی استعداد و قابلیت میسر ہوئی ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فیض پہنچانے والے اور فیض حاصل کرنے والے کے درمیان ان چیزوں میں جو استفاضہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، مناسبت شرط ہے۔

اور بعض حدیثوں میں جن کو مشائخ کرام نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے: مرشد اپنی قوم میں نبی کی طرح ہے جس طرح امت میں نبی کی حیثیت ہے۔ لہذا مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ساتھ ذہنی تعلق اور قلبی ربط رکھے۔ اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ اس کو فیض صرف اپنے ہی مرشد سے حاصل ہوگا۔ اگر چہ کہ تمام مشائخ ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ ہیں اور ان تمام بزرگوں کے ساتھ حسنِ اعتقاد رکھے اور ان کے حق میں دعا کرتا رہے۔ لیکن یہ حقیقت واضح رہے کہ اس کے لیے خصوصی فیض اور

خصوصی استفادہ صرف اپنے ہی مرشد کی روحانیت سے وابستہ ہے اور یہ سمجھے کہ اپنے مرشد سے استمداد دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد ہے۔

کیوں کہ اس کے مرشد اپنے مرشد سے مربوط ہیں اور ان ہی سے استفادہ حاصل کررہے ہیں اور ان کے مرشد اپنے مرشد سے منسلک ہیں۔ اس طرح اکتساب فیض اور نسبت وتعلق کا رابطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک قائم ہے اور مرید درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ حاصل کررہا ہے۔ اور آپؐ اللہ تعالیٰ سے استفادہ فرمارہے ہیں۔ سنت الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبديلا

غرض اکتساب فیض کے لیے مرشد کے ساتھ ذہنی تعلق اور قلبی ربط ہی بہت بڑی اصل اور بنیاد ہے بلکہ یہی چیز اصل الاصول ہے۔ اسی لیے مشائخ کرام نے اس شرط کی رعایت ونگہداشت میں بڑی جدوجہد کی ہے۔ حتیٰ کہ شیخ نجم الدین کبریٰ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بلا شک وشبہ ربط (مع اللہ) قلب کی حیثیت اعمال کے مقابلہ میں ویسی ہی ہے جیسے صنعتِ آئینہ سازی میں آلات کے مقابلہ میں کاریگر استاد کی۔ پس ہتھوڑا، گھن، بھتہ، کوئلہ اور آگ جیسے آلات جمع ہوجائیں اور آئینہ بنانے والا کاریگر استاد موجود نہ ہوتو آئینہ وجود میں ہی نہیں آئے گا: لا يتحقق وجود المرأة۔

اسی طرح خلوت اور عزلت کے سات شرائط جنیدیہ سے بھی شیخ کے ساتھ بدون ربط قلب، آئینہ دل پاک نہ ہوگا اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے اور اسی طرح پایا ہے۔ جس طرح کہ شیخ نے فرمایا ہے: اگر اکثر مرید روحانی فیض اور ترقی سے منقطع ہوگئے ہیں تو بس وہ اسی جہت سے ہوگئے ہیں یعنی تسلیم ورضا، یقین واحسان مندی اور سچی محبت کے ذریعہ شیخ کے ساتھ ربط قلب نہ ہونے کے سبب ہے۔

مرشد پر اعتراض اور نکیر فیض کا دروازہ بند کردیتا ہے اسی لیے مشائخ کرام نے

مرید کے آداب میں کہا ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ہاتھوں میں اس طرح رہے جس طرح غسال کے ہاتھوں میں میت رہتی ہے۔اگر غسال حسبِ مصلحت اس کے اعضاء میں سے کسی عضو کو آگے پیچھے دھودے یا اس کو حرکت دے یا اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق اس میں کوئی تصرف کرے تو کیا میت کوئی اعتراض کرسکتی ہے؟

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''الانتباہ'' میں خدا تک پہنچنے کا راستہ کے بیان میں شیخ تاج الدین سنبھلی نقشبندی خلیفہ خواجہ محمد باقی کے رسالہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

تیسرا طریقہ: اس مرشد کے ساتھ رابطہ کا طریقہ ہے جو مشاہدہ کی منزل پر پہنچ چکا ہو اور تجلیات ذاتی کے ساتھ موجود ہو تو بلا شبہ اس کا دیدار هم الذين اذا راو ذكر الله :(وہ لوگ جن کو دیکھیں تو اللہ کی یاد تازہ ہو جائے) کے مصداق ذکر کا فائدہ دیتا ہے اور اس کی صحبت میں رہنے سے هم جلساء لله (وہ اللہ کے ہم جلیس اور ہم نشین ہیں) کے مصداق اللہ تعالیٰ کی صحبت کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔اور جب تجھے ایسے مرشد کی صحبت میسر ہو جائے اور تو اپنے نفس میں اس کا اثر دیکھے تو تجھے چاہئے کہ اس اثر کو جس کو تو نے اپنے اندر بقدر امکان مشاہدہ کیا ہے اس کو محفوظ رکھے اور اگر تجھ کو اس معاملہ میں کوئی کمی اور فتور محسوس ہو تو اس کی صحبت میں رہ، یہاں تک کہ اس کی صحبت کی برکت تیری جانب لوٹ سکے۔اس طرح صحبت کو وقفہ وقفہ سے لازم کرلے یہاں تک کہ وہ کیفیت تیرے اندر ایک ملکہ کی صورت اختیار کر جائے اور اگر اس مرشد کی صحبت سے کوئی اثر ظاہر نہ ہو لیکن انجذاب باطنی اور محبت قلبی حاصل ہو تو ایسی صورت میں تمہیں چاہئے کہ مرشد کی صورت کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلے اور قلب کو اس کی جانب متوجہ کرلے یہاں تک کہ تمہیں اپنے نفس کے فنا اور اس کے غیر موجود ہونے کی کیفیت حاصل ہو جائے۔

اگر تمہاری ترقی رک جائے تو تمہیں چاہیے کہ داہنے کندھے کی طرف شیخ کی

صورت کا تصور کرو اور کندھے سے اپنے تصور کو شیخ کی صورت کے ساتھ ساتھ گزارتے ہوئے اپنے دل میں لا بٹھاؤ اس عمل سے امید ہے کہ تم کو فنائے نفس حاصل ہو جائے۔

نیز ''الانتباہ'' میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بیان میں جو شیخ مجدد کے واسطے سے پہنچا ہوا ہے، رقم طراز ہیں:

دوسرا مطلوب یہ کہ مرشد کی شکل و صورت کو اپنے سامنے تصور کرتے ہوئے ذکر کریں۔ الرفیق ثم الطریق (پہلے ساتھی منتخب کر لیں اور اس کے بعد راستہ چلیں) ان ہی بزرگوں کی شان میں کہا گیا ہے۔ مرشد کا تصور خیالات کی نفی کے لیے بڑی تاثیر رکھتا ہے، بلکہ سلطان الموحدین، برھان العاشقین، حجۃ المتوکلین شیخ جلال الحق والشرع والدین مخدوم مولانا قاضی خان یوسف ناصح قدس سرہ اس طرح فرماتے ہیں کہ:

ظاہراً دیکھا جائے تو مرشد کی صورت آب و گل کے پردہ میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہے لیکن جب خلوت میں مرشد کی صورت نمودار ہوتی ہے تو آب و گل کے پردہ کے بغیر اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہے کیوں کہ ان اللہ خلق ادم علی صورۃ الرحمن (بے شک اللہ نے آدم کو رحمٰن کی صورت میں پیدا کیا) ومن رانی فقد رأ الحق (جس نے مجھ کو دیکھا بلا شبہ اس نے حق کو دیکھا) مرشد کے حق میں صحیح و درست ہے۔

اگر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلی دیکھنا چاہتا ہے تو انسان کی صورت دیکھ ذات حق کے اندر آشکار اور ہنستا ہوا دیکھ۔

نیز قول الجمیل میں مشائخ چشتیہ کے اشغال میں لکھا ہے کہ صوفیاء کرام نے کہا ہے کہ مرشد کے ساتھ محبت و الفت اور تعظیم و تکریم کے ساتھ اس کی شکل و صورت کو اپنے ذہن میں مستحضر کرنا، طریقت کا عظیم ترین جزء ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے مظاہر ہیں، کوئی عابد غبی ہو یا ذکی، مگر وہ مظہر اس کے مقابل ہو کر اس کا معبود بن گیا۔

اسی راز کے لیے استقبالِ قبلہ اور استواء علی العرش کی بات شریعت میں آئی ہوئی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اپنے منہ کے سامنے نہ تھوکے کیوں کہ اس کے اور قبلہ کے درمیان اللہ تعالیٰ موجود ہے۔

پس اس کے بعد جان لینا چاہیے کہ شغل برزخ کس طرح اخیر زمانہ میں ناقص افراد کو تصاویر سازی پر آمدہ کیا ہوا ہے اور انہیں تصاویر کے روبرو، بت پرستوں کی طرح حرکاتِ تعظیمیہ پر مائل کر دیا ہے۔

اسی لیے مولوی شاہ اسماعیل دہلوی نے صراط المستقیم کے تیسرے باب میں شغل برزخ کو حرام کہا ہے۔ کیوں کہ جو چیز حرام کی طرف کھینچ لے جائے وہ بھی حرام ہے۔

شاہ صاحب نے حرام ہونے کی توجیہ اس طرح بیان کی ہے کہ شغل برزخ کا رواج ناقص اشخاص کو دلیل کی صورت میں تصاویر سازی کی طرف لے جا رہا ہے اور تصاویر سازی کے ساتھ ساتھ تعظیم و تکریم کے وہ افعال جو اہلِ صورت کے سامنے بجالاتے ہیں، ان تصاویر کے روبرو (تعظیمی حرکات و افعال) بجالا رہے ہیں اور صاف صاف طور پر بت پرستوں کے طریقہ پر چل رہے ہیں۔

اور شغل برزخ کے صورت پرستی کی طرف کھینچ لے جانے میں جو صریح حرام ہے کوئی شبہ نہیں ہے پس شغل برزخ بھی حرام ہونا چاہیے۔ اور شریعت محمدی میں صورت پرستی اور تصویر سازی کو پیش بندی کے طور پر مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور دیگر شرائع میں بعض صحیح اغراض مثلاً مردہ یا زندۂ غائب کے شکل و شمائل دریافت کرنے کے لیے درست تھی۔

پس جب شارح علیہ السلام نے تصویر سازی کے مسئلہ میں اس قدر احتیاط برتی ہے تو آپ ؐ کے متبعین کو بھی چاہیے کہ احتیاط کے اسی طریقہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شغل برزخ کو حرام اور قبیح خیال کریں۔ انتہیٰ

اوراسی طرح شغل برزخ کے مسئلہ میں ناقص اشخاص کوتصور شیخ کے وقت مشائخ کرام کی ارواح کی حاضری کا اعتقاد پیدا کردیا اور پیر پرستی پر آمدہ کردیا تو مایۃ المسائل کے مصنف نے 86ویں سوال کے جواب میں اس اعتقاد (ارواح مشائخ کی حاضری) کی وجہ شغل برزخ کو نہ صرف ناجائز قرار دیا بلکہ اس کے قائل کے کافر ہوجانے کا فیصلہ بھی صادر فرمادیا۔

چناں چہ اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ مرشد کی شکل وصورت کو اس اعتقاد کے ساتھ کہ بغیر کسی قید کے اس کو اطلاع ہوجاتی ہے، تصور کرنا اور اس کی صورت کو برزخ بنانا اور یہ خیال کرنا کہ اس وقت مشائخ کی ارواح حاضر ہوتی ہیں اور جانتی ہیں یہ اعتقاد درست نہیں بلکہ اس طرح کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ شیخ فخر الدین ابوسعید عثمان بن سلیمان الجیانی الحنفی نے اپنی کتاب میں ''کتب فتاوی بزاریہ'' وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ مشائخ کرام کی ارواح، علم ودانست کے ساتھ حاضر ہوتی ہیں تو وہ کافر ہوجائے گا۔ انتہی

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر سے بھی شغل برزخ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جوانہوں نے شرک کی اقسام اور فرقۂ مشرکین کی بحث میں بیان کی ہے۔ تفسیر کی عبارت اس طرح ہے۔

''پیر پرست افراد کہتے ہیں کہ جب کوئی بزرگ انتہائی ریاضت ومجاہدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستجاب الدعوات اور مقبول الشفاعت ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں تو ان کی روح کی بڑی وسعت اور بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص بھی اس بزرگ کی صورت کو برزخ بنائے یا ان کی نشست وبرخاست کی جگہ میں یا ان کی قبر پر سجدہ کرے اور انتہائی عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرے تو اس بزرگ کی روح، وسعت واطلاق

کے سبب اس پر مطلع ہوگی اور وہ دنیا وآخرت میں اس کے حق میں شفاعت فرمائیں گے۔ (اس نوع کا اعتقاد شرک ہے۔) انتہی

اور اگر مرشد کی شکل وصورت کا تصور وخیال، وصول الی اللہ کے لیے ایک رابطہ اور ایک ذریعہ ہونے کا اعتقاد کے ساتھ ہو تو یہ بات صحیح ودرست ہے۔ اور یہ بعض مشائخ کرام کا معمول بھی ہے۔ صاحب ''مائۃ المسائل'' کا کلام مکمل ہوا۔

مذکورہ بیان سے واضح ہے کہ شغل برزخ لاحقہ قباحتوں کے ظہور کی وجہ سے قبیح ہے۔ ورنہ اصل میں اس مسئلہ کے اندر کوئی قباحت نہیں بلکہ یہ چیز ترک دنیا کی صحت کے لئے بڑی عظیم شرط ہے جیسا کہ ابھی اس کی تفصیل گزر چکی۔

اس مسئلہ میں بھی عوام بڑی افراط وتفریط کا شکار ہیں اور شغلِ برزخ کو مطلق ناجائز کہہ رہے ہیں اور طرفہ طرازی تماشا تو یہ ہے کہ مرید ہونے کے دعوے کے باوجود اپنے ہی سلسلہ کے مشائخ کرام کی تضلیل وگمراہی کا حکم دے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۲۹

## علمِ غیب

علم غیب مستقل طور پر عالم الغیب کی صفت خاصہ ہے۔ جس کو وحی یا الہام، دلیلِ عقلی، منام، حواس اور فراست وغیرہ کی احتیاج نہیں ہے۔ اور وہ ان کے بغیر غیب کی ساری چیزوں کو جانتا ہے۔ اس کے برخلاف انبیائے کرام، اولیائے عظام، اور ساری مخلوق، وحی، الہام وغیرہ کی محتاج ہوتی ہے اور ان کے بغیر کسی غیب کو نہیں جانتے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ اولیائے کرام، حضرات انبیاء اور خصوصاً سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو من جانب

اللہ غیب کی بہت ساری چیزوں سے مطلع کیا گیا ہے۔ خاتم المجتہدین حافظ شہاب الدین ابنِ حجر مکی نے ''شرح ہمزیہ'' میں عالم الغیب فلا یظہر علی غیبه احدا الا من ارتضی من رسول کی آیت کریمہ کے تحت جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

غیب سے مراد غائب ہے جس کا مشاہدہ نہ ہو۔ لیکن یہ ہماری جانب نسبت ہو تو غیب ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی جانب نسبت ہو تو وہ غیب نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر چیز اس کے حضور اور مشاہدہ میں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب کی خصوصیت سے متصف کرنا اللہ تعالیٰ کے اس قول عالم الغیب فلا یظہر علی غیبه احدا الا من ارتضی کے مدنظر ہے۔ اس لیے کہ غیب کا جاننا بڑی ہی فخامت والی اور قدر والی چیز ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر و بیشتر علوم و معارف ایک مشہور حدیث علمت علم الاولین والاخرین (میں اولین و آخرین کا علم جان لیا ہوں) کی دلیل سے مغیبات سے مربوط و منسلک ہیں اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ذریعہ کلیات و جزئیات کا احاطہ کر لینے کی حیثیت سے بھی عالم الغیب کی خصوصیت سے متصف ہے۔ لہٰذا بہت سی مغیبات بلکہ مغیبات خمسہ (جن کے تعلق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا) سے اپنے بعض مخصوص بندوں کو اللہ تعالیٰ مطلع فرمائے تو یہ منافی نہیں ہے اس لیے کہ یہ مغیبات، جزئیات معدودہ ہیں۔

اس مسئلہ میں فرقۂ معتزلہ کا انکار خواہ مخواہ اپنی عظمت و بزرگی جتانے کے لیے بحث و مباحثہ کرنا ہے۔ حضرات انبیاء، اولیاء اور بالخصوص ہمارے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے علم غیب کے واقعات کثرت کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں، جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ ابن حجر مکی نے ''شرح مذکور'' میں جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں: کہ اس مسئلہ میں دو باتوں سے آگاہ کرانا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر شخص پر

واجب ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھے کہ غیب کا جاننا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور علمِ غیب کا جو حصہ بھی انبیائے کرام اور اولیائے عظام کو حاصل ہوا ہے وہ وحی کے ذریعہ ہے۔ یا الہام کے ذریعے سے ہے اور حدیث شریف میں ہے: انی لااعلم الا ما علمنی ربی۔ بے شک میں نہیں جانتا ہوں مگر وہ باتیں جو میرا رب مجھے معلوم کرا دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس بیان کو ملحوظ رکھنا چاہیے جس میں مصنف ''ہمزیہ'' نے اشارہ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے غیب کی باتیں بتلائی ہیں اور

(۱) قرآن میں جن مغیبات کی نشاندہی کی گئی ہے ان کا احاطہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

(۲) امام طبرانی کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے ساری دنیا کو پیش کیا۔ پس میں ان تمام احوال اور واقعات کو جو قیامت تک رونما ہونے والے ہیں ان کا اس طرح مشاہدہ کر رہا ہوں گویا ساری کائنات میری ہتھیلی پر موجود ہے۔

(۳) امام ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان خطاب کے لیے کھڑے ہوئے اور قیامت تک پیش آنے والے واقعات اور حالات کو بیان فرمایا۔ آپؐ نے کسی ایک بات کو بھی نہیں چھوڑا۔

(۴) صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اولین اور آخرین کا علم جان لیا ہوں۔

(۵) صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں نجاشی کی موت کی خبر دی۔ جس دن حبشہ میں ان کا انتقال ہوا اور آپؐ نے صحابہ کرام کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

(۶) ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم کوہ احد پر چڑھے تو

وہ ہلنے لگا۔ آپؐ نے اس پر اپنا قدم مبارک مارتے ہوئے فرمایا: ثابت اور چپ رہ! اس وقت تیرے اوپر ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ پس حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے۔

(۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسریٰ اور قیصر کا ملک میری رحلت کے بعد شام اور عراق سے منقطع ہو جائیں گے۔ چنان چہ یہ واقعہ عہد فاروقی میں رونما ہوا۔

(۸) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سراقہؓ سے فرمایا: تمہاری زندگی کے وہ لمحات کیسے ہوں گے جن میں تم شاہ کسریٰ کے کنگن پہن لو گے۔ چناں چہ جب ایران فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہ کنگن ان کے ہاتھوں میں پہنایا۔

(۹) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم حضرت عباسؓ کو مقامِ بدر میں ان کے اس مال کی خبر دی جس کو انھوں نے اپنی اہلیہ کے پاس رکھا تھا اور اس کی خبر میاں بیوی کے علاوہ کسی اور شخص کو نہ تھی۔

(۱۰) حاطب بن ابی بلتعہ نے اہلِ مکہ کو ایک خفیہ خط بھیجا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کی خبر تھی۔ آپؐ نے اس واقعہ کی خبر دی۔ (اور بعض صحابہؓ کو بھیج کر راستہ ہی سے وہ خفیہ مکتوب حاصل فرمالیا)۔

(۱۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو گم شدہ اونٹ کی خبر دی جس کی مہار ایک درخت میں پھنسی ہوئی تھی۔

(۱۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''غزوۂ احزاب کے بعد قریش کو ہم پر حملہ کرنے کی طاقت او حوصلہ نہ ہوگا۔ چنان چہ احزاب کے بعد قریش مسلمانوں سے متصادم نہیں ہوے۔

(۱۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ موتہ کے لیے زید بن حارثہؓ کو امیر الجیش مقرر فرمایا جو شام کی زمین میں لڑی گئی۔ جس روز زیدؓ کی شہادت ہوئی تو آپؐ نے مدینۂ منورہ میں

اطلاع دی اوران کے بعد جعفرؓ بن ابی طالب کولشکر کا امیر مقرر فرمایا۔ جب یہ شہید ہوئے تو اس کی اطلاع دی اوران کی جگہ پر عبداللہ بن رواحہ کوامیر الجیش مقرر فرمایا۔

(۱۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے وصال کے بعد میرے اہل بیت میں سب سے پہلے میری صاحب زادی فاطمہؓ مجھ سے آملے گی۔ چناں چہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق حضرت فاطمہؓ چھ یا آٹھ ماہ زندہ رہیں۔

(۱۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ شقی و بد بخت حضرت علیؓ کا قاتل ہے۔ جو آپؓ کی تالو پر وار کرے گا۔ چناں چہ بد بخت عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپؓ پر کاری ضرب لگائی جس سے آپؓ کی ریش مبارک خون سے تر بہ تر ہوگئی اوراسی میں آپؓ کی شہادت واقع ہوئی۔

(۱۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ معاویہؓ علیؓ کے مقابلہ پر آئیں گے اور وہ مغلوب نہیں ہوں گے۔ ان دونوں حدیثوں کو ابنِ عساکر نے روایت کی ہے۔ حضرت علیؓ نے صفین کی لڑائی کے دن فرمایا اگر یہ حدیث مجھے یاد ہوتی تو میں حضرت معاویہؓ سے جنگ نہیں کرتا تھا۔

(۱۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ عثمانؓ مظلوم قتل کئے جائیں گے اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو یہ بھی بتلا دیا تھا کہ تم اس حال میں قتل کئے جاؤ گے کہ سورۃ البقرہ تلاوت کررہے ہوں گے اور تمہارے خون کا ایک قطرہ فسيكفيكهم الله وهو السميع العليم کی آیت پر آگرے گا (یہ دوسری روایت موضوع ہے)

(۱۸) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ حرہ سے متعلق بھی خبر دی تھی کہ یزیدی لشکر مدینۂ منورہ پر حملہ آور ہوگا اور سات سو حفاظ قتل ہوں گے جن میں سے تین سو صحابہؓ ہوں گے اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں کی عصمت ریزی ہوگی۔

(۱۹) نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ جمل کی خبر دی۔

(۲۰) جنگِ صفین سے بھی متعلق وضاحت فرمائی۔

(۲۱،۲۲) حضرت عائشہؓ اور حضرت زبیرؓ کا حضرت علیؓ سے مقابلہ کرنے کی بھی خبر دی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت زبیرؓ جب حضرت علیؓ سے مقابلہ کے لیے اُتر آئے تو علی کرم اللہ وجہہ نے زبیرؓ سے کہا: تمہیں اللہ کی قسم، سچ بتاؤ کیا تم نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بارے یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا تھا کہ اے زبیرؓ تم علیؓ سے قتال کرو گے درآں حالیکہ تم ظلم پر رہو گے حضرت زبیرؓ یہ بات سن کر سر جھکاتے ہوئے واپس لوٹ گئے اور فرمایا کہ ہاں سنا ہے لیکن میں بھول گیا تھا۔

(۲۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسنؓ سے متعلق فرمایا۔ یہ میرا فرزند سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ چناں چہ یہ پیشن گوئی پوری ہوئی اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امام حسنؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی اور آپؓ چھ ماہ تک خلیفہ رہے۔ پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ مقابلہ کے لیے چالیس ہزار کا لشکر لیے ہوئے صف آراء ہوئے تو دونوں جماعتوں نے فریقین کی کثرت کا مشاہدہ کیا اور خیال کیا کہ ان دونوں میں سے کوئی فریق بھی غالب نہیں آئے گا۔ جب تک کہ کوئی ایک فریق پوری طرح ہلاک نہ ہو جائے۔ پس مسلمانوں کے لیے حسنؓ کے دل پر رقت طاری ہو گئی اور مسلمانوں پر رحم کر کے خالصۃً لوجہ اللہ ایک طور پر خلافت سے علاحدگی اختیار کر لی جیسا کہ آپؓ نے خود اس کی روایت کی ہے۔ چناں چہ آپؓ نے حضرت معاویہؓ کے پاس ایک قاصد روانہ کیا تو انہوں نے آپؓ کی خدمت میں سفید کاغذ روانہ کیا اور کہا کہ آپؓ اس میں جو شرائط اور مطالبات چاہیں درج فرمائیں تو امام حسنؓ نے چند شرائط تحریر فرمایا اور منصبِ خلافت سے دست بردار ہو گئے اس روز سے حضرت معاویہؓ

...رار پائے۔

(۲۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام طف میں حضرت امام حسینؓ کے قتل ہونے کی خبر دی اور دستِ مبارک سے مٹی دکھلاتے ہوئے فرمایا کہ حسینؓ اس مٹی میں شہید ہوں گے اور یہ پیشن گوئی صادق ہوئی۔

قطر کے فرشتے نے اپنے رب تعالیٰ سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونے کی اجازت چاہی تو اس کو اجازت دی گئی۔ اس روز آپؐ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف فرما تھے۔ فرشتہ حاضرِ خدمت ہوا تو آپؐ نے ام سلمہؓ کو حکم دیا کہ دروازہ بند رکھیں۔ اس اثناء میں امام حسینؓ تشریف لائے تو آپؐ کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چوما۔ اس پر فرشتے نے عرض کیا اللہ کے رسول! کیا آپؐ انہیں بہت عزیز رکھتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ہاں! فرشتے نے کہا: عنقریب آپؐ کی امت انہیں قتل کر دے گی۔ اگر آپؐ چاہیں تو میں وہ جگہ بتلا دوں جس میں یہ قتل کیے جائیں گے۔ پس اس کے بعد فرشتے نے آپ کو وہ جگہ دکھلا دی اور آپ کی خدمت میں وہ مٹی پیش کی۔ جس کو امّ سلمہؓ نے ایک کپڑے میں اٹھا رکھا۔

راوی کا بیان ہے کہ ہم قتل گاہ سے متعلق سوچا کرتے تھے کہ وہ کربلا کی زمین ہوگی۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ سے فرمایا: جب یہ مٹی خون ہو جائے تو سمجھ لو کہ حسینؓ قتل ہو چکے۔

(۲۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خبر دی کہ وہ نابینا ہو جائیں گے جب کہ انہوں نے حضرت جبرئیلؑ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آدمی کی صورت میں دیکھا۔

(۲۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عباسؓ کی والدہ کو خبر دی کہ انہیں عبداللہ تولد

ہوں گے۔(۲۸) عبداللہ بن عباسؓ ابوالخلفاء ہوں گے۔(۲۹) اوران کی نسل میں عباس اور مہدی خلیفہ ہوں گے(۳۰) آپؐ نے یہ خبر بھی دی کہ ترک عربوں پر تو یہ غلبہ ختم ہوجائیگا غالب رہیں گے جب ان کے درمیان بخل اور باہمی حسداور رقابت سر اٹھائے۔

(۳۱) اورآپؐ نے یہ خبر بھی دی کہ قریب ہے ایک دور ایسا آئے جس میں لوگ طلب علم کی خاطر سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے نکل پڑیں اور وہ مدینۂ منورہ کے عالم سے بڑھ کر کسی بھی شخص کو صاحبِ علم وفضل نہیں پائیں گے۔

ابنِ عیینہؒ نے فرمایا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد امام مالک بن انسؒ کی جانب ہے۔ اوراسی وجہ سے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے مالک بن انسؒ کے دروازے پر ہجوم کرتے تھے اور دکھا پیل بھی۔ اوراکابرین میں سے جن لوگوں نے آپؒ سے روایت کی ہے امام زہری، امام سفیان ثوری، امام شافعی، امام اوزاعی، امام اہل شام، امام لیث، امام اہلِ مصر، امام ابوحنیفہ اوران کے دو اصحاب امام ابو یوسف اور امام محمد، حضرت ذوالنون مصری، حضرت فضیل ابنِ مبارک ابن ادھم کی شخصیات ہوں گی۔

(۳۲) آپؐ نے یہ خبر بھی دی کہ قریش میں ایک ایسا عالم ہوگا جو اپنے علم وفضل سے ساری زمین کے حصوں کو فیض یاب کرے گا۔

امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں کہ ایسا قریشی ہم نے صرف امام شافعی کو دیکھا ہے کہ جس طرح ان کی ذات گرامی سے ہر سو علم کی روشنی پھیلی صحابہ اور غیر صحابہ میں اہلِ قریش کے کسی فرد سے ایسا فیض عام نہ ہوسکا اور حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے جو علمی فیض جاری ہوا وہ فقہی مسائل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جیسا کہ ان کی حیات اور خدمات سے واضح ہے۔

صاغانی نے اس حدیث کی اطلاع دیتے ہوئے زعم کیا ہے کہ بے شک یہ حدیث

محل قبولیت میں سے ہےاوراس میں صرف ایک طرح کا ضعف ہےاوراس حدیث کے لیے کئی شواہد ہیں جو اس حدیث کے صحت کی خبر دیتے ہیں۔اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کے طرق میں ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے۔

(۳۴) آپؐ نے خبر دی کہ روافض اسلام کو چھوڑ دیں گے۔

(۳۵) فرقۂ قدریہ کہ گمراہی اور ضلالت کی بھی نشاندہی فرمائی۔

(۳۶) اسی طرح فرقۂ مرجیہ سے متعلق بھی فرمایا کہ وہ بھی اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

(۳۷) آپؐ نے یہ بھی پیشن گوئی فرمائی کہ میری امت تر ہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔

(۳۸) یہ خبر بھی دی کہ سرزمین حجاز سے ایک روشنی ظاہر ہوگی جس سے بصرہ کے قرب و جوار چمک اٹھیں گے۔ چناں چہ ۳/ جمادی الاخر ۶۵۴ھ میں بعدِ نماز عشاء مدینۂ منورہ سے تقریبا ایک مرحلہ پر ایک بھیانک آگ بھڑک اٹھی۔ جس کے ساتھ ہی عظیم زلزلہ ہوا اور اس میں مسلسل شدت آتی گئی اور جوش مار رہا تھا۔ جیسے کہ سمندر جوش مارتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے زمین اور اس کے اوپر کی ہر چیز ہلنے لگی جس سے اہل مدینہ کو اپنی ہلاکت کا یقین ہونے لگا۔ زلزلوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں اٹھارہ مرتبہ زلزلہ ہوا۔ لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مدینۂ منورہ میں بادِ نسیم کے جھونکے چل رہے تھے مکہ مکرمہ اور بصرہ تک کے پہاڑوں کو زلزلہ کے شر سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔

اور زلزلہ رجب کی ستائیسویں رات کو ختم ہوا۔ جو معراج کی رات تھی۔

مورخین نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ غیبی خبروں اور پیشن گوئیوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جن کا احاطہ اور استیعاب طویل ہوگا۔

اگر آپ ان غیبی امور وحقائق پر غور کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف فرمایا ہے اور بالخصوص ''صحیفہ'' میں جو غیبی امور درج ہیں، صرف ان میں بھی غور

کریں تو آپ پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان غیبی علوم و معارف وحقائق کا انکشاف رب تعالی کے الطاف اور عنایات میں سے ہے۔

اسی طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اللہ تعالیٰ کی عنایت اور آپ کی اطلاع کے ذریعہ بہت سارے غیب کی چیزوں کا علم رکھتے تھے اور بے شمار غیبی اشیاء کی خبر بھی دے چکے تھے۔

علامہ قیصری ''مقدمہ شرح نصوص الحکم'' کی نویں فصل میں فرماتے ہیں:

پس قطب جس پر عالم کے احکام کا دارومدار ہے وہی ازل سے لے کر ابد تک دائرۃ الوجود کا مرکز ہے جو وحدت کے حکم کے اعتبار سے واحد ہے اور یہی حقیقت محمدی ہے جو کثرت کے حکم کے اعتبار سے متعدد ہے۔

اور یہی حقیقت محمدیؐ انقطاع نبوت سے قبل کبھی مرتبۂ قطبیت میں ظاہر ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور کبھی ولی غائب کے روپ میں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اور یہ قطب اس وقت تھے جب تک موسیٰ علیہ السلام اس خلعتِ قطبیت سے مشرف نہیں ہوئے تھے۔

اور نبوت تشریع کے منقطع ہونے اور دائرۂ نبوت کے پورا ہونے اور باطن سے ظاہر کی طرف ولایت کے منتقل ہونے کے وقت قطبیت مطلقہ اولیاء اللہ کی طرف منتقل ہوگئی۔

اب ہمیشہ اس مرتبہ میں ان لوگوں میں سے ایک شخص ہمیشہ اس کی جگہ میں رہے گا تاکہ یہ ترتیب اور یہ انتظام اس کے سبب سے باقی رہے۔

نیز اسی میں رقم طراز ہیں:

اور اس ربوبیت مطلقہ کا تصور ہر صاحبِ حق کو اس کا حق پہنچانے اور ان تمام چیزوں کا افاضہ کرنے کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے جس کی طرف سارا عالم محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ

بات مکمل قدرت اور جمیع صفات الہیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی واسطے ان کو تمام اسماء پر حکومت حاصل ہے جس کے ذریعہ وہ عالم کے اندر لوگوں کی استعداد کے مطابق تصرف کرتا ہے۔

اور جب یہ حقیقت انسانیہ دو جہت (الہیت اور عبودیت) پر مشتمل ہے تو اسی لیے حقیقت انسانیہ کو تصرف بالاصالہ، صحیح نہیں ہے بلکہ بالتبع صحیح ہے۔ اور اسی تبعیت کا نام خلافت ہے۔ پس اس صورت میں حقیقت محمدیہ کو بھی زندہ کرنا، مارنا، لطف، قہر، رضا، سخط اور جمیع صفات حاصل ہیں تا کہ وہ عالم میں تصرف کر سکے اور خود اپنی ذات اور بشریت میں بھی تصرف کر سکے۔ کیوں کہ اس کی ذات اور بشریت بھی عالم ہی کا ایک حصہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آہ و بکا کرنا، تنگ دل ہونا اور سینۂ مبارک میں تنگی محسوس کرنا یہ تمام باتیں مذکورہ حقیقت کی منافی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ ساری چیزیں آپ ؐ کی ذات اور صفات کی بعض مقتضیات میں سے ہیں۔ اور آپ ؐ کے مقام و مرتبہ کی حیثیت سے آسمان اور زمین کا کوئی ذرہ بھی آپ ؐ کے علم سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر چہ کہ آپ ؐ یہ کہیں: انتم اعلم بامور دنیـــاکـم : یعنی تم اپنی دنیا کے معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ یہ ارشاد مبارک آپ ؐ کی بشریت کی حیثیت اور اس کے اعتبار سے ہے۔ انتہی (اس حدیث کو رکھتے ہوئے آپ کے دنیاوی امور اور علمی حقائق و اسرار میں آپ ؐ کے لاعلم ہونے کا استدلال نہیں کیا جاسکتا مترجم۔)

علامہ قیصری مذکورہ مقدمہ کی آٹھویں فصل میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

شیخ محی الدین ابنِ عربی ''فتوحات مکیہ'' میں قطبیت کے بیان میں لکھتے ہیں کہ وہ کامل جو تیسرے سفر (جس میں انسان کامل حق سے خلق کی طرف، حق کے ساتھ سفر کرتا ہے) میں اترتا ہوا عناصر تک پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کو عالم کا خلیفہ اور قطب وقت بنادے تو اس کو ضروری ہے کہ افراد انسانیہ میں سے ان سب کا مشاہدہ کرے جو قیامت تک

وجود میں آئیں گے اوراس مشاہدہ پر بھی وہ قطب ہونے کا مستحق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہر ایک کے مرتبوں کو بھی نہ جانتا ہو۔ پاک ہے وہ ذات جو ہر شئے کے اندر اپنی حکمت سے تدبیر کرتی ہے اور جس سے تمام مصنوعات ومخلوقات کو اپنی رحمت کے ذریعہ مستحکم کیا ہے۔

نیز اسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

اسی لیے کہا گیا ہے کہ انسانِ کامل کے لیے ضروری ہے کہ وہ جمیع موجودات میں حق سبحانہ تعالیٰ کے مل جانے کی طرح مل جائے۔

ان تمام اسناد اور روایات کا ماحصل یہ ہے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام مستقل طور پر اپنی ذات سے غیب کا علم نہیں رکھتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے یہ حضرات کرام غیب کی بہت ساری باتوں کی خبر دئے ہیں۔ جیسا کہ امام نووی ایک سائل کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ وہ سوال وجواب من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے:

سوال: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ ، (کہہ دیجئے اے نبی محترمؐ! آسمانوں اور زمین میں جو بھی غیب ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد لا یعلم ما فی غد الا اللہ (آنے والا کل میں کیا ہونے والا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا) کا کیا مطلب ہے؟ قرآن وحدیث نبوی میں اس قسم کے اور بھی اقوال موجود ہیں لیکن اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات کے ذریعہ آنے والے کل کے علم کا جاننا ثابت ہے۔

الجواب: جن آیات اور احادیث نبویؐ میں علم غیب کی نفی ہو رہی ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ علم غیب مستقل طور پر اپنی ذات سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے انبیائے کرام کو معجزات کے ذریعہ اور اولیائے کرام کو کرامات کے ذریعہ غیب کا علم حاصل

ہوتا ہے اوران حضرات کرام کو یہ علم، مستقل نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ احاطۂ علمی بھی صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے اور کلیات وجزئیات میں سے کوئی بھی شئے اس کے علم سے خارج نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان اللـه قـد احاط بكل شئی علما : بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئی پر علم کے ذریعہ احاطہ کئے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: وفـوق كل ذی علم علیم : ہر صاحب علم کے اوپر ایک علم والا ہے۔

مولانا جامیؔ فرماتے ہیں:

بیابانوں میں ریگ کی تعداد اور باغوں میں پتوں کی تعداد یہ سب اس کے نزدیک ظاہر اور واضح ہے اور یہ سب اس کے علم میں حاضر اور موجود ہے۔ انتہی

خاتم المجتہدین ابنِ حجر مکی ''شرح ہمزیہ'' میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے پر غیب کو کلیۃً مطلع نہیں فرماتا بلکہ مغیبات کی مخصوص جزئیات سے مطلع فرماتا ہے۔ انتہی

مولانا جامی ''شرح فص یعقوبیہ'' میں فرماتے ہیں:

بعض اوقات میں بعض انسانوں کے لیے کسی آنے والے واقعہ کی اطلاع و انکشاف سے مقصود اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عبد مکاشف کو کسی ایسے امر خاص کی اطلاع ہو جائے جس کی اطلاع اس کو اللہ تعالیٰ کرا دینا چاہتے ہوں۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ولا یحیطون بشئی من علمه الا بما شآء۔

پس اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک علـــم علما الاولین والاخرین (میں اولین اور آخرین کا علم جان چکا ہوں) آپ کی اطلاع اور علم کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے اگر چہ کہ یہ بعض اوقات ہی میں ہو۔

اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ یہ اعتراض درست نہیں کیوں کہ علم اولین و آخرین

بھی اللہ تعالیٰ کی معلومات کی طرف نسبت سے وہ خود بھی ایک امر خاص ہی ہے۔اور اگر علم اولین اور آخرین سے عموم تسلیم کرلیں تو حدیث شریف سے ثابت شدہ آپ کا علم ،علمِ کلی اور اجمالی ہونا مقام روح میں ہوگا۔اور جس علم کی یہاں نفی کی گئی ہے وہ مقام قلب میں آپ کا علم تفصیلی ہے۔واللہ اعلم بالصواب

مولانا بحر العلوم ''مثنوی'' کے پہلے دفتر کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

انسانِ کامل بالخصوص قطب الاقطاب اپنی سیر تمام کرنے اور فناء کے بعد بقاء کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد اعیانِ ثابتہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کے اندر یہ استعداد پیدا ہونے کے بعد ہی اعیان منکشف ہوتے ہیں۔پس جس حال میں کہ اس پر اعیان جاری ہوتے ہیں یا جاری ہوں گے تو اجمالاً منکشف ہوتے ہیں۔اس وقت اس کے اوپر سعادت ازلیہ اور شقاوت ازلیہ ہر دو آشکار ہوجاتے ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام اعیان ممکنات اپنے تمام احوال کے ساتھ بالتفصیل اس کے اوپر منکشف ہوجاتے ہیں۔یہ بات تو انسان کے حق میں محال ہے جیسا کہ فصوص الحکم میں سے ثابت ہے:

اور یہ بات ( تمام اعیان ممکنات اپنے احوال کے ساتھ تفصیل سے انسان پر منکشف ہونا ) کیسے ممکن ہوسکتی ہے اگر ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مساوات لازم آئے گی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سورۂ مزمل کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس طریقہ ( تقرب بہ ذکر ) سے مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ تقرب پیدا کرلے تو یہ ممکن نہیں۔کیوں کہ اس نوع کے تقرب میں متقرب الیہ کے لیے دو چیزیں چاہیے:

پہلی چیز: زمانوں، مکانوں اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود ذاکر کے لیے اذکار قلبیہ اور لسانیہ کا علمی احاطہ ہے۔تا کہ ہر ذاکر کے ذکر لسانی اور قلبی کو معلوم کرسکے۔

دوسری چیز: نزدیک ہونا اور اس کے عقل و ذہن میں سما جانا اور اس کو پر کرنا اور اس کی صفت کا

حکم پیدا کرنا ہے جس کو شریعت کی زبان میں دنو، تدلی، نزول اور قرب کہتے ہیں۔

یہ دونوں صفتیں صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ ہے جو کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ ہاں بعض کفار اپنے بعض معبودوں کے حق میں اور بعض پیر پرست اپنے پیروں کے حق میں پہلی چیز کو ثابت کرتے ہیں۔ اور ضرورت و احتیاج کے وقت اسی اعتقاد کے ساتھ ان معبودوں اور پیروں سے استعانت طلب کرتے ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ صحیح نہ ہوگا اور در حقیقت یہ لوگ اشتباہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اشتباہ کا بیان یہاں غیر موزوں ہے۔ اور ان ہی دو چیزوں سے سلوک کا کارخانہ مکمل ہوتا ہے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ بندہ رب کے ساتھ نزدیک ہو جائے۔

نیز شاہ صاحب اسی سورۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یہ صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے یاد کرنے والے کی جانب نزول فرماتا ہے اور قریب ہوتا ہے اور اس کے عقل و ذہن کو پر کرتا ہے اور اس کے لطائفِ باطنہ پر مستولی اور غالب ہوتا ہے۔ اور اس واقعی اور حقیقی نزدیکی کے ذریعہ اس کی روح کا حکم اختیار کر لیتا ہے۔ اور جو نسبت کو روح کو جسم کے ساتھ ہے اس نزدیکی کو اس کی روح کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور دوسری مخلوقات ہر چند کہ روحانیات ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ علم محیط نہیں رکھتی ہیں کہ ہر ذاکر کے ذکر پر مطلع ہو سکیں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ روحِ ذاکر پر دائمی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ مخلوق کی حالت یہ ہے کہ جب وہ کسی ایک کام میں مشغول ہوں تو دوسرے کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اسے ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کر سکتا۔

ان تمام اسناد اور روایت کا ماحصل یہ ہے کہ احاطۂ علمی صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں۔ اگر کوئی شریک ہوتا تو افضل المخلوقات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو جاسوس، اخبار نویس اور مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور نر کھجور کے خوشہ کو

مادہ کھجور کے خوشہ کے ساتھ ملا دینے کے مسئلہ میں انتم اعلم بامور دنیاکم نہ فرماتے ۔اور امیر المؤمنین عثمان بن عفانؓ ، اور بی بی رقیہؓ جب حبشہ ہجرت کر گئے تو ان کی خیریت و کیفیت معلوم کرنے کے لیے بے چین اور مضطرب نہیں رہتے ۔اور ایک ضعیفہ خاتون سے ان کے حالات دریافت نہ فرماتے ۔اور وحی کی آمد سے قبل ہی منافقین کی تہمت اور حضرت عائشہؓ کی برأت سے مطلع ہو جاتے ۔اور حضرت عاصمؓ اور دیگر صحابہؓ کرام کو اطراف مکہ اور ستر صحابہ کو نجد روانہ نہیں کرتے اور یہ حضرات کفار کے ہاتھوں مقتول نہیں ہوتے ۔

اور حضرت یعقوبؑ اپنے فرزند یوسفؑ کے فراق میں آنسو نہیں بہاتے اور نہ آپؑ کی آنکھوں کی روشنی ختم ہوتی اور حضرت موسیٰؑ ، حضرت خضرؑ کے کاموں پر اعتراض نہ کرتے اور حضرت ہارونؑ کی موجودگی کے باوجود قوم کے مبتلائے شرک ہونے پر غصہ میں آکر حضرت ھارونؑ کی ریشِ مبارک نہیں پکڑتے اور ان کے سر کے بالوں کو نہیں کھینچتے اور ان کی اہانت نہیں کرتے اور اپنے عصا کے اژدھا ہونے سے بے خبر نہیں رہتے ۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

حضرت موسیٰؑ نے اس کو عصا سمجھا جو فی الحقیقت عصا نہ تھا ، اژدھا تھا اور اپنا راز خود ظاہر کر رہا تھا۔ جب ایسا بادشاہ ہی عصا کے راز کو نہیں جان سکا تو بچھے ہوئے جال اور بکھرے ہوئے دانوں کے اسرار کیا جان سکتا ہے؟

نیز جاننا چاہئے کہ صور مکشوفہ کا ظہور صاحبِ کشف ( وہ شخص جس کے دل میں امور غیبی کے اسرار ظاہر ہو جائیں ) کے قابو میں نہیں ہے بلکہ یہ چیز ارادہ الٰہی کے تابع ہے۔

علامہ قیصری ''شرح فصوص الحکم'' میں فرماتے ہیں

جب اللہ تعالیٰ ان صورتوں کے ظہور کا ارادہ فرماتا ہے جن کی نوع اس عالم کے اندر صورت حسیہ میں موجود نہیں ہے جیسے عقول مجردہ وغیرہ تو یہ صورتیں اشکال محسوسات کے

ذریعہ شکل وصورت اختیار کر لیتی ہیں، ان مناسبات کے ذریعہ جو ان کے درمیان اور اشکال محسوسات کے درمیان ہوتی ہیں ۔ شئے متشکل کے استعداد کے مطابق مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضرت دحیہ کلبی کی صورت اور دوسری شکل میں ظاہر ہونا۔ جیسا کہ اسلام، ایمان اور احسان سے متعلق سوال کی حدیث سے ظاہر ہے جس کو حضرت عمرؓ نے روایت کی ہے۔

اسی طرح باقی ملائکہ سماویہ اور عنصریہ اور جنات بھی دوسری شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ اگر چہ کہ جنات کے لیے اجسامِ ناریہ ہیں ۔ ارشاد خداوندی ہے" خلق الجان من مارج من نار"

اور انسانیت کاملہ کے مالک نفوسِ قدسیہ بھی اپنی محسوس شکلوں کے سوا دوسری صورتوں میں بھی ظاہر ہوتے ہیں ۔ حالاں کہ وہ اسی دنیا میں ہیں ۔ اپنے بدنوں سے انسلاخ کی قوت کی وجہ سے اور آخرت کی جانب انتقال کے بعد بھی وہ دوسری صورتوں میں منتقل ہوتے ہیں ۔ اس انسلاخی قوت کی زیادتی کے باعث اور جسمانی موانع کے مرتفع ہو جانے کی وجہ سے ، اور ان نفوس قدسیہ کو تمام عالم ملکوتیہ میں دخل رہتا ہے جس طرح عالمِ دنیا کے اندر ملائکہ کا دخل رہتا ہے اور جیسے ملائکہ اہلِ دنیا کی شکلوں میں منتقل ہوتے ہیں اور انہیں یہ قوت اور طاقت بھی ہوتی ہے کہ وہ مکاشفین کے خیالات میں خواب و بیداری کی حالت میں ظاہر ہوں ۔ جیسا کہ ان کے خیالات میں ملائکہ اور جنات ظاہر ہوتے ہیں ۔ ان نفوس قدسیہ کو بدلاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ صور مرئیہ کا ظہور ارادۂ الٰہی کے تحت ہے۔ کبھی مرئی کے ارادہ سے ہے تو کبھی رائی کے ارادے سے ۔ اور کبھی دونوں کے ارادے سے اور کبھی دونوں کے ارادہ کے بغیر۔

علامہ قیصری "فیض یوسفی" کی شرح میں لکھتے ہیں:

جان لیجئے کہ مرئی کا ظہور اپنی اصلی صورت کے علاوہ کسی اور صورت میں یا اپنی ہی صورت میں کبھی اس کے اپنے ارادہ سے ہوتا ہے اور کبھی رائی کے ارادے سے ہوتا ہے۔ اور کبھی مرئی اور رائی دونوں کے ارادے سے اور کبھی ان دونوں کے ارادے کے بغیر ہوتا ہے۔

پہلے کی مثال یعنی (مرئی کے ارادے سے ظہور کی مثال) انبیاء کرام میں سے کسی نبی کے پاس فرشتہ کا مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ظاہر ہونا اور انسانوں میں سے انسان کامل کا بھی بعض صالحین پر غیر کی صورت میں ظاہر ہونا۔

دوسرے کی مثال یعنی رائی کے ارادے سے ظہور کی مثال: فرشتوں اور انسانوں کی ارواح میں سے کسی اور روح کا ظہور کسی انسانِ کامل متصرف کے، اس کو اپنے عالم میں بلانے کی وجہ سے ہو۔ تا کہ اس معنی کا انکشاف ہو جائے جس کا جاننا اس روح کی آمد کے ساتھ مخصوص ہو۔

تیسرے کی مثال یعنی رائی اور مرئی دونوں کے ارادہ سے ظہور کی مثال: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاہنے پر اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کی وجہ سے جبرئیلؑ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔

چوتھے کی مثال یعنی رائی اور مرئی دونوں کے ارادہ کے بغیر ظہور کی مثال: زید کا عمر کو خواب میں دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا دونوں کے ارادے کے بغیر ہو۔

''مؤلف'' ''انسان کامل'' باب نمبر باسٹھ میں لکھتے ہیں: کہ

اللہ تعالیٰ فرشتہ اسماعیل کو فلک قمر کے جمیع املاک پر حاکم بنا رکھا ہے اور اسماعیل قمر کی روحانیت کا نام ہے۔ جب اسماعیل کسی بھی فرشتے کو کسی امر کا حکم دیتا ہے اور وہ فرشتہ اس حکم کو بجا لاتا ہے تو اس کو اپنی کرسی پر بٹھاتا ہے جو تصویر خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ پس وہ

فرشتہ اس کرسی پر جس صورت میں اس کو نزول کرنے کا حکم دیا گیا ہے اسی شکل میں متشکل ہو کر بیٹھتا ہے اور وہ اپنی حالت بسیطہ کی طرف ہرگز نہیں لوٹے گا بلکہ اپنی جزوی تشکیل وتصویر پر اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے باقی رہے گا۔ اس لیے کہ ارواح جب مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں متشکل ہوتی ہیں تو اپنے طور پر اس صورت کو چھوڑ کر اپنی اصلی حالتِ بسیطہ پر لوٹ کر آنا ممتنع ہے لیکن یہ بات ان کے دائرۂ قوت میں ہے کہ وہ جس صورت میں چاہیں، متشکل ہوں بغیر اپنی اس صورِ اصلیہ کو چھوڑنے کے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان ارواح کے لیے حکمت رکھی ہے اور یہ روحانی صورتیں درحقیقت کلمات اللہ ہیں جو موجودات کے ساتھ قائم ہیں۔ پس جب ارواح دائرہ علمی سے نکل کر ذاتی روشنی میں آتی ہیں تو وجود میں اپنی ذات کے ساتھ باقی رہتی ہیں۔ پس تمام مخلوقات کے اجسام معدنیات نباتات، حیوانات وغیرہ کی ارواح اسی صورت پر قائم رہتے ہیں جس پر ان کے اجسام رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ جسم زائل ہو جائے تو روح تسبیح پڑھتے ہوئے اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ باقی رکھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو فنا کے لیے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ بقا کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور صاحبِ کشف جب کسی امر کے کشف کا ارادہ کرے تو وہ ارواح اس پر ظاہر ہوتی ہیں۔ جو اللہ کے کلمات ہیں۔ پس صاحب کشف ان ارواح کو ان کی ذاتوں ان کے اسماء اور ان کے اوصاف کے ساتھ پہچان لیتا ہے۔ اس لیے کہ ارواح وجودی میں سے ہر روح ان لباسوں میں ظاہر ہوتی ہے جو جسم پر اوصاف، نعوت اور اخلاق کی حیثیت سے چسپاں تھے۔ یہ وہ جسم ہے جس کی تدبیر ارواح کرتی رہتی ہے۔ اور اس جسم کی مثال حیوانات، معدنیات، اور مرکب وبسیط ہے یا اس صورت پر ظاہر ہوتی ہے کہ روح اس صورت کے لیے روح اور معنی ہوتی ہے۔ اور اس صورت کی مثال الفاظ، اعمال، اعراض اور ان جیسی چیزیں ہیں۔ ایسا اس صورت میں ہو گا جب کہ روح عالم علمی سے عالم عینی

وذاتی میں ظاہر ہو۔ اگر چہ وہ عالم علمی ہی میں رہے تو صاحب کشف ان ارواح کو انواع خلق کی بہت ساری صورتوں پر قائم دیکھے گا۔ جو اپنے مظہر جسم یا صورت کے لیے اوصاف اور اعمال ہوں گے لیکن اس حالت میں صاحب کشف جانتا ہے کہ ان ارواح کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان کی حقیقت کے اعتبار سے ہے تو پھر صاحبِ کشف حقیقت ارواح سے ان کی حقیقت کے اقتضاء کے مطابق جو علوم چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے اس کے برخلاف اگر صاحبِ کشف ان ارواح کو عالم عینی وذاتی میں ظاہر ہونے کے بعد دیکھے تو وہ جانتا ہے کہ اس وقت ارواح کا وجود ارواح ہونے کی حیثیت سے ہی ہے تو صاحب کشف ان ارواح سے بات چیت کرتا ہے تو ارواح اپنے علوم وحقائق کے مطابق اس کی بات کا جواب دیتی ہیں۔
اس مشہد میں ان روحوں کے حاضر ہونے کی جگہ میں بعض انبیاءؑ اور اولیاء بعض کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ میں اسی مشہد میں یمن میں ۸۰۰ھ ربیع الاول کے مہینے میں تمام نبیوں، رسولوں کو اولیاء کو اور ملائکہ مسخرات، غیر مسخرات کو دیکھا اور تمام موجودات کی روحانیہ کو دیکھا۔
ازل سے ابد تک حقائق امور کا انکشاف ہوا اور میں نے ایسے علوم الوہیت کی تحقیق کی ہے کہ ان کے ذکر کے لیے یہ کائنات کافی نہیں ہے۔ اس مشہد میں تھا، جو کچھ تھا، نیک گمان رکھو وہاں کی خبروں سے متعلق سوال مت کرو۔ اس تشریح اور توضیح کے سمندر میں بیان کے غواص نے ہمارے ساتھ غوطہ لگایا یہاں تک کہ تقدیر نے ہمیں ان موتیوں کے ظاہر ہونے پر مجبور کیا۔ انتہیٰ

امام ربانی مجدد الف ثانی ”رسالۂ مبداء ومعاد“ میں فرماتے ہیں کہ:

ایک شخص صوفیوں کے لباس میں ملبوس تھا اور بدعت اعتقادی میں مبتلا تھا۔ یہ فقیر اس کے معاملہ میں تردد رکھتا تھا۔ اتفاقاً میں دیکھتا ہوں کہ انبیائے کرام جمع ہیں اور اس شخص کے حق میں بیک زبان ہو کر ارشاد فرما رہے ہیں: ”لیس منا“ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس اثنا

میں میرے قلب میں یہ بات گزری کہ ایک دوسرا شخص جس کے معاملہ میں فقیر کو تردد تھا اس کے بارے میں استفسار کرلیا جائے۔اس کے بارے میں ارشاد ہوا، کان منا۔ہم میں سے ہے۔

نیز امام ربانی مکتوبات کی پہلی جلد میں ۲۵۹ ویں مکتوب میں پہاڑ کی گھاٹی میں بسنے والے اصنام پرست انسانوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

یہ لوگ نہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور نہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بلکہ بعثت اور دوسری زندگی کے بعد ان کی نیکیوں اور بدیوں کا حساب لے کر جرم کے اندازہ کے مطابق عذاب دیا جائے گا اور حقوق کی ادائیگی کے بعد ان کو غیر مکلّف حیوانات کے رنگ میں معدوم مطلق اور لاشئ محض قرار دیا جائے گا۔ پھر خلود اور دوام کہاں اور مخلد کون؟ جب یہ غریب اور نادر معرفت کو انبیائے کرام کے محضر میں پیش کیا گیا تو تمام نے تصدیق کی اور قبول فرمایا والعلم عند اللہ سبحانہ۔انتہی

یہ بات بھی اسی مقام اور مرتبہ کی خبر دیتی ہے۔خاتم المجتہدین علامہ ابن حجر مکی بعض اہلِ علم سے ''شرح ہمزیہ'' میں حکایت کرتے ہیں کہ یہ بات معروف اور معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مزار مبارک میں زندہ ہیں۔

بے شک اس شخص کے حق میں یہ بات بعید نہیں ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے شرف وعزت حاصل ہو۔اس کو یہ اعزاز واکرام بھی حاصل رہے کہ اس کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حجابات اٹھادیے جائیں۔پس آپؐ اپنی مزار مبارک میں ہوتے ہوئے بھی اولیائے کرام بیداری کی حالت میں آپؐ کو مزار مبارک میں دیکھ لیتے ہیں۔اور آپؐ سے گفتگو کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔اگر چہ کہ ان کے اوطان ودیار دور ہوں اور ان کے درجات ایک ہی حالت میں مختلف اور متفاوت ہوں۔

اس عظیم اور روشن کرامت کی وجہ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بے شک یہ اولیاء

اللہ بھی صحابیِ رسول ہیں کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف سے صحبت جسمانی منقطع ہوگی اور اگر کوئی شخص آپ کو آپ کی وفات کے بعد یا آپؐ کے جسم اطہر کی تدفین سے قبل دیکھا تو وہ صحابی نہیں ہے۔ پس یہ لوگ بھی اسی طرح بطریق اولیٰ صحابہ نہ ہوں گے۔

نیز اسی کتاب ''شرح ہمزیہ'' میں لکھتے ہیں جس کی حکایت حضرت ابن حمزہ، امام بارزی، امام یافعی اور ان کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کی جماعت نے کی ہے۔ کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ پس اس کے بعد بیداری کی حالت میں آپ کو دیکھا۔ اور آپؐ سے غیب کی اشیاء سے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے ان کو ان باتوں کی خبر دی اور وہ امور اسی طرح ثابت تھے جس طرح کہ آپؐ نے خبر دی۔

ابنِ ابی حمزہ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں اولیاء اللہ کی کرامات میں سے ہیں۔ ان باتوں کے انکار کرنے والے کے حق میں یہ بات لازم آئے گی کہ وہ اولیاء اللہ کی کرامات کے انکار کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔

''منقذ الغزالی'' میں ہے: اربابِ قلوب کبھی کبھی بیداری کی حالت میں ملائکہ اور انبیائے کرامؑ کی ارواح کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان سے کچھ آوازیں سنتے ہیں اور ان آوازوں سے کچھ فوائد و مطالب اور اسرار و معانی اخذ کر لیتے ہیں۔

نیز اسی کتاب میں ہے:

قطب اکبر ابوالحسن شاذلی کے وارث و نائب قطب ابو العباس المرسی یہ دونوں حضرات حالتِ بیداری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں۔ بلکہ ابوالحسن شاذلی نے یہاں تک فرمایا کہ میرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک لمحہ کے لیے بھی حجاب واقع ہو تو میں اپنے آپ کو مسلمان شمار نہیں کرتا۔

نیز اسی کتاب میں رقم طراز ہیں:

میرے شیخ اور والد شمس الدین محمد بن ابی الحمائل اکثر و بیشتر بیداری کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تھے اور جب کبھی ان کے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو فرماتے تھے، میں اس مسئلہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں پھر اس کے بعد مراقبہ کرتے پھر فرماتے تھے کہ اس مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا۔ پس وہ بات اسی طرح ہوتی تھی۔ جس طرح کہ وہ بتلائی جاتی اور کبھی بھی اس سے مختلف نہیں ہوتی۔

لہذا ان باتوں کے انکار سے احتراز واجتناب کریں اس لیے کہ یہ انکار ہلاک کر دینے والا زہر اور سانپ ہے۔ انتہیٰ

اس مقام پر کشف کے ذریعہ بارادۂ الٰہی کثرت کے ساتھ ظہور میں آئی ہوئی اشیاء کا جائزہ لینا چاہیے۔

حاصل کلام! مستقل غیب دانی اور احاطۂ علمی ہر دو صفت اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہیں۔ اور اس صفتِ خاصہ میں کوئی مخلوق اللہ کے ساتھ شریک نہیں۔ علمِ غیب کے مسئلہ میں بھی بعض عوام افراط وتفریط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۳۰

# علامات انبیاء و اولیاء

صاحب تفسیر رحمانی فقیہ علی مہایمی ''سورۂ فاتحہ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حجۃ الاسلام امام غزالی نے اپنی کتاب ''منہاج'' میں فرمایا: انبیاء کرام اور اولیائے عظام پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدح وستائش، عزت کرتا ہے

اوران کے ساتھ اورمحبت والفت فرماتا ہے اوران کے اموراوران کے رزق کی کفالت فرماتا ہے اوران کے دشمنوں سے ان کی حفاظت فرماتا ہے اوران کا دوست ومونس رہتا ہے اوران کے نفوس وذوات کوعزیز رکھتا ہے۔

یہ حضرات بادشاہوں کی خدمت پر راضی نہیں ہوتے ہیں اور دنیا کی نجاست و پلیدی سے ان کے حوصلے متاثر اورآلودہ نہیں ہوتے اوران کے قلوب روشن ومنور ہوتے ہیں۔اور وہ نگاہ ودل سے حقائق کا معائنہ کرتے ہیں اوران پرآنِ واحد میں ایسے ایسے علوم و معارف اور دقائق وحقائق منکشف ہوجاتے ہیں جن تک دوسروں کی رسائی طویل عمر صرف کرنے کے بعد اور بڑی محنتوں اور ریاضتوں کے بعد ہوتی ہے۔اوران کوشرحِ صدر کی نعمت حاصل رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کی آزمائشوں اوراس کے آلام ومصائب اورلوگوں کے مکروفریب سے تنگ دل اور مایوس نہیں ہوتے۔

اوراللہ تعالیٰ ان کی ہیبت وعظمت، جابروظالم اشخاص کے دلوں پر مسلط کردیتا ہے اوران کے نفوس میں اوران کے کاموں میں اوران کے رہنے سہنے کے مقامات میں اوران کی صحبت میں رہنے والوں بلکہ ان کی ملاقات کرنے والوں میں برکت عطا فرماتا ہے۔اوران کے لیے بحروبرکومسخر کردیتا ہے جس کی وجہ سے فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔اور پانی پر چلتے پھرتے ہیں اورآنِ واحد اورقلیل ساعت میں مسافتِ بعیدہ کو طے کرلیتے ہیں۔اوران کے لیے حیوانات کومسخر فرماتا ہے اوروہ زمین کی کنجیوں کے مالک ہوتے ہیں۔پس وہ جہاں کہیں اپنا ہاتھ ماریں ان کے لیے اس کے اندر خزانہ موجود رہتا ہے اور جہاں وہ ٹھوکر ماریں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے، اوراگر وہ قدرومنزلت، جاہ وجلال طلب کریں تو حاصل ہوگا۔جس سے وہ ہرطرح کی حاجت پوری کرلیں اوران کی دعائیں مقبول ومستجاب ہوتی ہیں اوراگر وہ کسی پہاڑ کی جانب اشارہ بھی کردیں تووہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، ان پر یہ بھی نعمت الٰہی ہے

موت کوان کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے اور وہ ایمان پر ثابت قدم رہتے ہیں اور ان کی
رف روح اور ریحان بھیجے جاتے ہیں تا کہ انہیں امن وامان اور عافیت کی بشارت دیں۔

اور انہیں جنت میں ہمیشہ ہمشہ رکھا جاتا ہے اور آسمانوں کے فرشتے ان کی ارواح کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور ان کے جنازہ میں انسانوں کا جم غفیر شامل رہتا ہے اور وہ قبر کے فتنے سے مامون ومحفوظ رہتے ہیں اور ان کے لیے قبر وسیع اور منور کر دی جاتی ہے جس سے ان کی روحیں مانوس ہو جاتی ہیں اور سبز پرندوں میں ان کی ارواح رکھ دی جاتی ہیں اور ان کا حشر عزت وکرامت کی حالت میں ہوگا اور ان کے سروں پر تاج رہے گا اور انکے بدنوں پر پوشاک رہے گی اور وہ براق پر فائز رہیں گے۔ اور ان کے چہرے چمکتے دمکتے رہیں گے اور وہ قیامت کی ہولناکیوں سے مامون ومحفوظ رہیں گے۔ اور ان کا نامۂ اعمال ان کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور ان کا حساب بہت آسان اور ہلکا ہوگا۔ اور ان میں سے بعض حضرات کا حساب ہی نہیں لیا جائے گا اور ان کے میزان ثقیل ہوں گے اور ان میں سے بعض تو میزان کے پاس روکے بھی نہیں جائیں گے اور وہ حوض کوثر کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گے اور وہ چشم زدن میں پل صراط کے اوپر سے گزر جائیں گے اور دوزخ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہے گا اور وہ اس کی آوازیں بھی نہ سن سکیں گے۔ اور وہ انبیاء کرام کی طرح گناہ گار مسلمانوں کی شفاعت کریں گے اور ان کو ملکِ دوام سے سرفراز کیا جائے گا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رضامندی حاصل ہوگی اور وہ رب العالمین سے ملاقات کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت

سند العلماء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ''تفسیر عزیزی'' میں رقم طراز ہیں:

نبی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہے اور ہر انسان کے اندر دو قوتیں ہیں۔ ایک قوت نظریہ جس سے وہ اشیاء کی حقیقت کو جانتا اور سمجھتا ہے، دوسری قوت عملیہ جس سے اچھے اور برے اعمال صادر ہوتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ براہ راست نبی کی بلاواسطہ بشر اس طرح تربیت فرماتا ہے کہ نور القدس کی تاثیر نبی کی قوت نظریہ میں اس طرح واقع ہوتی ہے کہ اس کی معلومات میں غلطی اور اشتباہ کا امکان ہی نہیں رہتا۔

اور اس کی قوت عملیہ میں ایسا ملکہ پیدا فرماتا ہے کہ جس کی وجہ سے نبی سے صالح اعمال انتہائی رغبت کے ساتھ صادر ہوتے ہیں اور وہ انتہائی نفرت کے ساتھ فاسد اعمال سے محفوظ رہتا ہے اور جب اس کی جسمانی قوتیں حد کمال کو پہنچ جاتی ہیں اور عقل بھی تجربہ وکمال کی حد کو پہنچ جاتی ہے تو اس کو انسانوں کی تعلیم و تربیت اور تکمیل کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔ اور معجزات کے ذریعہ اس کی تصدیق کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ معجزہ کبھی اقوال کی جنس سے ہوتا ہے (جیسے قرآنِ کریم) تو کبھی افعال کی جنس سے ہوتا ہے جیسے انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا۔ معجزات کے ساتھ ساتھ نبی کو آیات عقلیہ سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ خواص کے لیے ایمان قبول کرنے کا سبب ہوتے ہیں جس طرح معجزات عوام کے لیے ایمان لانے کا سبب ہوتے ہیں۔

آیاتِ عقلیہ کی چند قسمیں ہیں جن سے اخلاقِ کریمہ، علوم صادقہ، بیان شافی، حجت اور صحبت کے برکات بھی ہیں۔ اور عوام معجزات سے استدلال کرتے ہیں اور کاملین

کمالاتِ نبوت سے استدلال کرتے ہیں اور خواص روحانی امراض کے علاج اور ناقص افراد کی تعلیم و تکمیل اور صحبت کے ثمرات و برکات سے استدلال اور مشاہدہ کرتے ہیں اور نبی کی نبوت پر کامل یقین حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# انبیائے کرام کی حقیقت

بعض اوقات انبیائے کرام ایسی چیز بیان کرتے ہیں جس کو عقل بھی قبول کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کے کمال کی صفات، اور بعض اوقات ایسی چیز بیان کرتے ہیں کہ عقل اس کو بہت کم سمجھ پاتی ہے جیسے بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کے لیے روزہ کا حکم۔ اعمال صالحہ اور اعمال فاسدہ پر ثواب اور عتاب کی تفصیلات کا بیان اور بعض اعمال کی حالت و کیفیت کا بیان جو کبھی نیک ہوتے ہیں تو کبھی وہ برے ہوتے ہیں، پس اگر انبیائے کرام کا بیان ہمراہ آیاتِ عقلیہ اور معجزات نہ ہوں تو عقلِ محض اور بالخصوص عوام کی عقل ان باتوں کو تسلیم نہیں کرے گی اور صحبت کا فائدہ بھی متحقق اور ثابت نہ ہوگا۔ بقدر ضرورت نبی کا معنی اور مفہوم جان لیا گیا ہے تو اب تصدیق کا معنی بھی جان لینا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# صدیق کا معنی

صدیق وہ ہے جس کی قوت نظری، نبی کی قوت نظری کی طرح کامل ہوگی۔ اوائلِ عمر ہی سے دروغ گوئی اور منافقانہ بات چیت اس کے مزاج میں نہ ہوگی اور اس سے دینی مقامات میں اخلاصِ کامل کا ظہور ہوگا اور اس کے مزاج میں اصلاً حظ نفس کی آمیزش نہ ہوگی۔ اور صدیق کی یہ بھی علامتیں ہیں کہ وہ اپنے عزم و ارادہ میں تردد نہیں کرے گا۔ اور نماز میں

دائیں اور بائیں جانب متوجہ نہ ہوگا۔ خواہ وہ کتنا ہی عظیم ترین حادثہ پیش آجائے اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد نہیں ہوگا اور وہ کسی شخص پر لعن وطعن نہیں کرے گا اور خواب کی تعبیر اچھی طرح جاننے والا ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# شہید کا معنی

شہید وہ ہے جس کا قلب مشاہدہ کی نعمت سے بہرور ہوگا اور جو چیز انبیائے کرام کے ذریعہ پہنچتی ہیں وہ اس کو اس انداز سے پہنچتی ہیں کہ اس کا قلب اس چیز کو قبول کر لیتا ہے۔ گویا وہ اس چیز کی حقیقت کا مشاہدہ کر رہا ہے اسی لیے دین کی راہ میں جان قربان کر دینا اس کے نزدیک بہت ہی سہل ہوتا ہے گو کہ ظاہری اعتبار سے مقتول نہ ہوا ہو اور اس کی قوت عملیہ کمال میں نبی کی قوت کے قریب قریب ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# صالح کا معنی

صالح وہ ہے اس کی دونوں قوتیں ( نظری اور عملی ) انبیائے کرام کے کمال کے مرتبہ سے کمتر ہوتی ہیں۔ لیکن کمالِ متابعت کی وجہ سے وہ اپنے ظاہر کو گناہوں سے پاک و صاف کیا ہوا ہوتا ہے اور اپنے باطن کو فاسد اعتقادات اور مذموم اخلاق سے دور رکھتے ہوئے ذکر الٰہی سے اس قدر آراستہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کسی دوسری چیز کی شمولیت کی گنجائش نہیں رہتی۔

ہر چند کہ ولی کا نام ان تینوں گروہوں کو شامل ہے لیکن زیادہ تر اس لفظ کا اطلاق صالحین پر کیا جاتا ہے۔ اور جو چیزیں کہ ان چاروں گروہوں کو شامل ہیں۔ وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ

ان کو دوست رکھتا ہے اور ان کے رزق کی کفالت اس نہج سے فرماتا ہے کہ وہ دیگر انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور ان کو دشمنوں سے محفوظ رکھتا ہے اور غربت و اجنبیت میں ان کا مونس وغم خوار رہتا ہے۔ اور ان کے نفوس میں غیریت اور حمیت ودیعت فرماتا ہے جس کی وجہ سے وہ امراء و سلاطین کی خدمت پر راضی نہیں ہوتے اور ان کے دلوں کو منور فرماتا ہے۔ اور ان حضرات کو ایسی چیزوں کا علم حاصل رہتا ہے جو ان کے علاوہ اربابِ فکر و نظر کو شدید جد و جہد اور عمر طویل صرف کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور ان کے سینوں کو کشادہ فرماتا ہے۔ دنیا کی محنتوں، مشقتوں اور اس کی مصیبتوں سے اور رشتہ داروں کے فوت ہونے سے اور دیگر تکلیفوں، سختیوں اور مصیبتوں سے تنگ دل نہیں ہوتے۔

نیز ان حضرات کے اندر ایک ہیئت و عظمت اور جلالت عطا فرماتا ہے جس کی وجہ سے سرکش لوگوں کے دل بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کے کلام میں برکت، ان کے نفوس میں برکت، ان کے افعال میں برکت، ان کے اماکن میں برکت، ان کے ہم نشینوں میں برکت، ان کی اولاد و نسل میں برکت، ان کی زیارت کرنے والوں میں برکت پے در پے ظاہر فرماتا ہے اور اپنے نزدیک ان حضرات کو ایک ایسا مقام بخشتا ہے جس کی وجہ سے ان کی دعائیں مقبول و مستجاب ہوتی ہیں۔ بلکہ جو کوئی ان کا وسیلہ لے تو اس کی حاجت پوری فرماتا ہے۔

اور جو علامات و خصوصیات کہ ان حضرات کو عالمِ برزخ میں اور مواقف قیامت میں اور عالمِ ملکوت میں دی جاتی ہیں کہ وہ اس قبیل سے نہیں ہیں کہ عام مسلمان ان سے استدلال کر سکیں۔ الا یہ کہ ان عوالم کے مشاہدے کے بعد ہی استدلال اور تصدیق کر سکیں۔

# فائدہ نمبر (۳۱)

# زیارتِ قبور اور زیارت کے لیے سفر اور ان دونوں کے متعلقات

واضح ہو کہ اہلِ ایمان کی قبروں کی زیارت کرنا اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا مستحب ہے اور اس مسئلہ میں سارے علمائے کرام کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ بحر الرائق اور عالمگیری میں مرقوم ہے۔

زیارت کا حکم اس لیے ہے کہ وہ موت کو یاد دلاتی ہے اور قلب کی قساوت اور دنیا کی رغبت سے رہائی دلاتی ہے۔ اور یہ قلب کے لیے رقت اور عبرت کا باعث ہے اور آخرت کی یاد کا موجب بنتی ہے۔ چناں چہ حدیث میں آیا ہوا ہے: زوروا القبور فانها تذكر الاخرة: قبروں کی زیارت کرو بے شک یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

زیارتِ قبور کے مسئلہ میں قابل اعتماد عمل، میت کے لیے دعا اور استغفار ہے اور یہی سنت بھی ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع تشریف لے جاتے تھے اور اہلِ بقیع پر سلام بھیجتے اور ان کے لیے استغفار فرماتے تھے جیسا کہ مشکوٰۃ میں مذکور ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے مسئلہ میں علمائے کرام کا اجماع ہے کہ وہ قولی اور عملی سنتوں میں سب سے افضل ہے اور مستحبات میں مؤکد ترین مستحب ہے۔ قاضی عیاض شافعی فرماتے ہیں:

''سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار اقدس کی زیارت ایک ایسی سنت ہے جس کے مسنون ہونے پر اجماع ہے اور وہ ایک ایسی فضیلت ہے جس کی غیر معمولی ترغیب اور تحریص

دلائی گئی ہے''

بعض مالکی علمائے کرام نے قبر نبویؐ کی زیارت کو واجب قرار دیا ہے اور دوسرے مکاتیب فکر (حنفی، شافعی، حنبلی) کے علمائے کرام تاویل کے ساتھ سنت واجبہ قرار دیتے ہیں اوران کے نزدیک سنت واجبہ سے مراد ایسی موکد سنت ہے جس کی ترغیب غیر معمولی طور پر دی گئی ہے جیسا کہ ''جذب القلوب'' میں مذکور ہے۔

زیارت کے وقت اہلِ قبور کا احترام، ان کی جانب چہرہ کرنے میں، ان سے نزدیکی اور دوری اور بیٹھنے میں آداب کی رعایت، ان کے درجات و مراتب کے مطابق واجب ہے۔ جیسا کہ ان کی زندگی میں ان تمام باتوں کا پاس ولحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''جامع الرموز'' اور ''شرح مشکوٰۃ'' اور ''اللالی الفاخرہ فی تذکرۃ الاخرہ'' میں مذکور ہے۔

جب تم کسی بزرگ کی قبر پر زیارت کے لیے جاؤ تو ان کی عظمت و بزرگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب واحترام کو اپناؤ۔ کذافی زادالاخرۃ

مولانا مخدوم محمد ہاشم سندھی اپنی کتاب ''حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب'' میں سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے آداب میں رقم طراز ہیں:

جب تم حمد وثنا اور دعا سے فارغ ہو جاؤ تو توبہ کی تجدید کرو اور انتہائی خشوع وخضوع تواضع وانکساری اور وقار وادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مزارِ اقدس کی جانب آؤ اور آنکھیں بند کئے ہوئے خاموش کھڑے ہو جاؤ اور اپنے اعضاء کو حرکت نہ دو اور اپنے قلب کو خطرات ووساوس اور علائق سے خالی رکھو اور سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر باندھو جس طرح کہ نماز میں باندھتے ہیں۔ اور زیارت کے وقت اپنا چہرہ نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی جانب رکھو اور اپنی پشت قبلہ کی طرف رکھو اور یہی مذکور طریقہ ائمہ اربعہ کے نزدیک مستحب ہے جیسا کہ ابن ماجہ وغیرہ نے صراحت کی ہے۔

صاحبِ فتاویٰ عالمگیری فرماتے ہیں:

مواجہ شریف میں حالتِ نماز کی طرح (باادب) کھڑے رہیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک و مسعود اور منور چہرہ کو اپنے ذہن میں لائیں گویا کہ آپؐ اپنی مزارِ اقدس میں سوئے ہوئے ہیں اور تم کو جانتے ہیں اور تمہارے کلام کو سن رہے ہیں جیسا کہ ''الاختیار فی شرح مختار'' میں مذکور ہے:

بلکہ زائرینِ قبر نبویؐ کے علاوہ دوسرے حضرات بھی اگر متبرک مقامات کی جانب متوجہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے مقرب و برگزیدہ بندوں کی شکل وصورت کو عظمت وجلالت کے ساتھ اپنے ذہن میں مستحضر کرلیں تو یہ بات شریعت مطہرہ کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس سے محض سعادت اور قرب کی تحصیل ہوتی ہے جیسا کہ شیخ الہند شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے ''مدارج'' اور اس کے تکملہ میں بیان کیا ہے۔

سند العلماء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مولانا نعیم الدین کے جواب (مطبوعہ ۱۲۳۷ھ) میں فرماتے ہیں:

نمازِ عشاء کے بعد درودِ شریف جس صیغہ کے ساتھ بھی ہو مدینہ منورہ کی سمت متوجہ ہوکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک و مسعود صورت کو اپنے ذہن وقلب میں مستحضر کرتے ہوئے سو (۱۰۰) مرتبہ پڑھنا چاہیے۔

زیارت کے لیے سفر کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ صاحب ''مفتاح البیت العتیق'' لکھتے ہیں کہ امام نووی شافعیؒ نے فرمایا:

تین مساجد (مسجد نبوی، مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ) کے علاوہ دیگر مقامات مثلاً بزرگانِ دین کی مزارات اور فضیلت والے مقامات وغیرہ کی طرف سفر کرنے کے بارے میں علمائے کرام نے اختلاف کیا ہے۔ ہمارے شافعی فقہاء میں شیخ ابو محمد جوینی نے فرمایا کہ تین

مساجد کے علاوہ دیگر مقامات کی طرف سفر کرنا حرام ہے لیکن ہمارے دیگر فقہائے کرام کے نزدیک صحیح اور درست موقف تو وہی ہے جس کو امام الحرمین اور محقق فقہاء نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سفر نہ حرام ہے اور نہ مکروہ ہے بلکہ جائز ہے۔

شیخ ملا علی قاری حنفی ''شرح عین العلم'' میں لکھتے ہیں:

بخاری اور مسلم کے علاوہ دیگر کتابوں میں ابوھریرہ اور ابو سعید کی روایت کردہ حدیث لاتشدوا الرجال آئی ہوئی ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ میری مسجد اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے سوا کسی قطعۂ زمین سے حصولِ برکت کے خیال سے سفر نہ کیا جائے لیکن اس حدیث سے انبیائے کرام اور اولیاء عظام کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔کیوں کہ حصر مساجد کے حق میں ہے۔۔تمام مشاھد اور مقابر کے حق میں نہیں ہے۔انتہیٰ

شیخ الہند عبدالحق محدث دہلوی ترجمۂ ''مشکوٰۃ'' میں فرماتے ہیں:

اولیائے کرام کی مزارات کی زیارت کے لئے سفر کرنے کے بارے میں اور مقامات متبرکہ میں پہنچنے کے بارے میں اختلاف ہے۔بعض علماء نے مباح قرار دیا ہے اور بعض نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ''مجمع البحار'' میں مرقوم ہے۔اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ان مقامات ( مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ ) کے علاوہ کسی بھی مقام کے لیے نذر کے طریقہ پر قصد کرنا اور جانا درست نہ ہوگا۔اگر ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کی نذر اور منت کرلے تو اس کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ سفر کی ممانعت مساجد کے حق میں ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تین مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کی طرف سفر جائز نہ ہوگا۔لیکن مساجد کے علاوہ دیگر مواضع اور مقامات کی طرف سفر کی ممانعت کا مفہوم اس حدیث سے خارج ہے یعنی انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی قبروں کی طرف سفر

کرنے کی ممانعت ثابت نہیں ہوسکتی۔

نیز مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''جذب القلوب'' میں لکھتے ہیں:۔

لا تشدوا الرحال کی حدیث سے سفر کی ممانعت ثابت نہیں ہوسکتی، چناں چہ نحو کا قاعدہ بھی ہے کہ استثناء مفرغ میں مستثنیٰ کا مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہونا لازمی ہے۔ لہذا ان مساجد کے علاوہ مطلق سفر کی ممانعت لازم نہیں آئے گی اور ان مساجد کے سوا سفر سے منع بھی کیسے کیا جائے گا، جب کہ حج، جہاد، دار الکفر سے ہجرت، تجارت اور تمام دنیاوی مصالح اور فوائد کے لیے سفر کرنا جائز ہے اور شریعتِ مطہرہ کے موافق امر ہے۔ جس پر سارے فقہاء کا اتفاق ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ ''کیمیائے سعادت'' کے رکن دوم کی ساتویں اصل میں لکھتے ہیں: دوسری قسم سفر برائے عبادت ہے جیسے حج بیت اللہ، جہاد، انبیاءؑ، اولیاءؒ، صحابہؓ اور تابعین کے مزارات کی زیارت بلکہ عالموں اور بزرگوں کی زیارت ہے۔ جن کے چہروں کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے اور ان کی دعاؤں کی برکت بڑی عظیم ہوتی ہے اور ان کے مقابر، و مشاہد کے فوائد و برکات میں سے ایک برکت یہ ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی رغبت اور خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لہذا ان کا دیدار بھی عبادت ہے اور بہت ساری عبادتوں اور ریاضتوں کا اصل ثابت ہوتی ہے۔ لہذا ان کا دیدار بھی عبادت ہے اور بہت ساری عبادتوں اور ریاضتوں کا اصل ثابت ہوتی ہے۔ جب ان نفوس قدسیہ اور ان کے ارشادات کے فوائد و برکات، زیارت کرنے والوں کے ساتھ پیوست ہو جائیں تو فوائد دوگنے ہو جاتے ہیں۔ لہذا زیارت گاہوں اور بزرگوں کے مقبروں کی زیارت کے لیے قصد و ارادہ کے ساتھ جانا جائز ہوتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے لاتشدوا الرحال یہ اس بات

کی دلیل ہے کہ تین مساجد کے سوا دیگر مقامات اور مساجد سے تبرک حاصل کرنے کی غرض سے سفر نہ کریں۔ کیوں کہ یہ تمام فضیلت میں برابر ہیں۔ لیکن علمائے کرام کی زیارت اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات پا گئے ہوں۔ غرض حصولِ برکت کی خاطر انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا اور اس نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔

مولانا ابوالمکارم رکن الدین علاؤالدولہ احمد بن محمد البیانکی قدس سرہ کے احوال میں صاحب ''نفخات'' فرماتے ہیں کہ ایک درویش نے ان سے سوال کیا کہ جب اس جسم کو قبر میں ادراک کی قوت نہیں ہے اور وہ، روح سے اکتساب نہیں کرتا ہے اور وہ اس سے جدا ہو چکی ہے اور عالمِ ارواح میں حجاب نہیں ہے پھر قبر کے پاس جانے کی ضرورت کیا ہے؟ اور اس سے کیا فائدہ ہے؟ کیوں کہ جس مقام سے بھی کسی بزرگ کی روح کی طرف توجہ کریں تو یہ ویسے ہی ہوگا جیسے قبر پر حاضری تو پھر کیوں قبر کے پاس جائیں؟

شیخ نے فرمایا: قبر پر جانے میں بہت سے فوائد و برکات ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی شخص کی زیارت کے لیے جائیں گے اور جتنا زیادہ جائیں گے اس کی توجہ اتنی ہی زیادہ ہوگی اور جب قبر کے پاس پہنچیں اور آنکھوں سے قبر کا مشاہدہ بھی کریں تو اس کی قبر کی طرف بھی اس کی حِس مشغول ہوگی اور اس طرح اس کو توجہ تام حاصل ہوگی اور (زیارت کا) فائدہ بہت زیادہ ہوگا۔

دوسرا یہ کہ ارواح کے لیے اگرچہ کہ کوئی حجاب نہیں ہے اور ان کے لیے سارا جہاں ایک ہے لیکن جس جسم میں روح ستر سال تک رہی ہو اور جسمِ محشور میں حشر واقع ہونے کے بعد ابدالاباد تک رہے گی۔ وہ جسم جس جگہ (قبر) ہوگا روح کی نظر اور اس کا تعلق اس جگہ کے ساتھ زیادہ ہوگا۔ برخلاف دوسرے مقام کے۔

اس وضاحت کے بعد شیخ نے حکایت بیان کی ایک مرتبہ میں جنید بغدادی کی

خلوت گاہ میں تھا اور اس خلوت گاہ سے ذوق تمام حاصل ہو رہا تھا۔ جب ان کی خلوت گاہ سے باہر آیا اور ان کی قبر پر چلا گیا تو اس جگہ میں نے وہ ذوق نہیں پایا۔

میں نے یہ بات شیخ سے عرض کی تو انہوں نے فرمایا: کیا تم نے یہ ذوق جنید بغدادیؒ کی وجہ سے نہیں پایا؟ عرض کیا: ہاں! پھر فرمایا: ظاہر ہے کہ جس جگہ انہوں نے صرف چند مرتبہ قیام کیا تھا تو ذوق حاصل ہوا اور جو جسم کے کئی سال تک اس کی صحبت میں تھا تو اولیٰ یہی ہے کہ ذوق زیادہ حاصل ہو۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ احساس وشعور کی مشغولیت کے باعث صاحبِ قبر سے توجہ میں کمی واقع ہوگئی ہو۔ آخر خرقہ جو مشائخ کرام سے پہنا جاتا ہے اس میں بھی تو اس کے ذوق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جسم خرقہ سے بہت ہی نزدیک ہے۔

زیارت کے فوائد بہت ہیں۔ اگر کوئی شخص اسی مقام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ اقدس کی جانب متوجہ ہو تو فائدہ پائے گا لیکن اگر مدینۂ منورہ چلا جائے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ اس کے جانے اور راہ کی صعوبت سے باخبر ہوگی اور جب اس جگہ پہنچے تو احساس وشعور کے ساتھ روضۂ نبویؐ کو دیکھے گا اور پورے ذہن ودل کے ساتھ نبی کریمصلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ ہوگا۔ مدینہ منورہ پہنچنے سے جو فوائد اور برکات حاصل ہوں گے اس کے مقابلہ میں دور ہی دور سے روحانیت کی طرف متوجہ ہونے سے حاصل ہونے والے برکات وفوائد کو کیا نسبت ہے۔ اور ان فوائد کے درمیان جو عظیم فرق ہے یہ اہلِ مشاہدہ پر پوری طرح واضح ہے۔

اگر قبر پر جانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد میں شہید ہونے والے صحابۂ کرام اور جنت البقیع میں مدفون حضرات کی زیارت کے لیے قبرستان تشریف نہیں لے جاتے۔

ان اسناد اور شواہد سے یہ بات واضح ہے کہ زیارتِ قبور مستحب ہے اور قبر پر حاضری

دینا بلکہ صاحب قبر کی شکل وصورت کو ذہن میں مستحضر کر لینا بھی سعادت اور حصولِ تقرب کا ذریعہ ہے۔

''مصباح الانام'' کے مصنف تیرھویں فصل میں لکھتے ہیں:

امام غزالی ''احیاء'' میں ربع العبادت (جو کتاب اسرار الحج ہے) کی کتاب سابع میں فرماتے ہیں:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لاتشدوالرحال الاثلثة مساجد۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری مسجد کے سوا کہیں سفر نہ کرو۔ اس حدیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ علماء اور صلحاء کے مقابر اور مشاہد کی زیارت کرنا منع ہے۔ یہ بات مجھ پر کھل نہ سکی کہ فی الواقع یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض علماء مے مذکور حدیث سے استدلال کیا ہے ۔کیوں کہ شریعتِ مطہرہ میں زیارت کا حکم موجود ہے۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها ۔ میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا پس اب تم زیارت کرو۔

مذکور حدیث ان تین مساجد سے متعلق ہے جو فضیلت میں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ (بقیہ پوری مسجدیں فضیلت میں برابر ہیں)

پس کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں مسجد نہ ہو۔ لہذا ایسی صورت میں شہر کی مسجد چھوڑ کر کسی دوسری مسجد کی طرف سفر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن مشاہد اور مقابر باہم مساوی نہیں ہوسکتے کیوں کہ ان کی زیارت کی برکت، اصحاب قبور کے درجات ومراتب کے لحاظ سے ہوگی، جو عنداللہ انہیں حاصل ہیں۔

ہاں! اگر کسی جگہ میں ایک ہی مسجد ہو تو اس مقام سے دوسرے کسی ایسے مقام کی طرف سفر کرنا جس میں مسجد ہو، درست نہیں ہے البتہ اگر وہ چاہے تو مستقل طور پر دوسرے

مقام کی طرف منتقل ہو جاسکتا ہے۔

کاش میں جان سکتا کہ کیا اس بات کا قائل انبیائے کرام مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت یحییٰ وغیرہ کی مزارات کی طرف سفر کرنے کو بھی منع قرار دے گا پس اگر منع کرے تو یہ بات انتہائی محال ہوگی اور اگر سفر کو جائز قرار دے تو علماء، اولیاء، اور صلحاء کی مزارات اسی حکم میں داخل سمجھی جائیں گی۔

پس بعید نہیں ہے کہ سفر کے اغراض و مقاصد میں یہ بات (تحصیل برکت) شامل ہو جیسا کہ زندگی میں علماء کی زیارت کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ بحث سفر کے جواز میں تھی۔ انتھیٰ

لیکن ہم عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے جن منکرات شرعیہ کے وقوع اور رونما ہونے کا احساس کر رہے ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان خلاف شرع امور کو ختم کر دیں۔ یہ نہیں کہ کسی امرِ جزوی کی وجہ سے کسی امرِ کلی کو ترک کر دیں۔

امام مقریؒ ''الارشاد'' کے باب الجہاد میں فرماتے ہیں:

عورتوں کا جہاد میں تیر چلانا جائز ہے جب کہ ہم ان کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ اور امام ابن سیرین بعض جنازوں میں شریک ہوئے جن میں نوحہ کیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر امام ابن سیریں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو حضرت حسن بصری نے ان سے کہا کہ اگر ہم اس طرح جب کبھی کسی بدعت کو دیکھ کر سنت کو چھوڑ دیں تو اس طرح اہم بہت سنتوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔ اس واقعہ کو امام زکریا نے ''شرح رسالۃ القشیر یہ'' میں ذکر کیا ہے۔ اور شیخ محمد بن احمد العدنی نے بھی شرح ''تراجم البخاری'' میں جو وضاحت کی ہے وہ بھی اس موقف سے قریب ہے۔

امام علامہ عبداللہ بن عمر مخرمہ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی جنازہ میں مختلف اور

متعدد منکراتِ شرعیہ موجود ہوں مثلاً عورتوں کا نکل آنا اور ان کا مردوں کے ساتھ اختلاط وغیرہ تو ایسی صورت میں کوئی شخص جنازہ میں شریک نہ ہو تو کیا اسے معذور قرار دیا جائے گا، جب کہ اس کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ ان منکرات کا ازالہ کر سکے۔

امام موصوف نے جواب دیا کہ باطل کی وجہ سے حق کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ خلافِ شرع کام روک سکتا ہے تو جنازہ میں شریک ہو کر یہ کام انجام دے۔ اور اگر نہیں روک سکتا ہو تو اپنے دل میں غیر مشروع کام کو مکروہ سمجھے۔ اس کراہت اور ناپسندیدگی کے باعث عند اللہ اجر و ثواب پائے گا۔

علامہ ابنِ عبد السلام نے بھی مذکورہ مسئلہ کے موافق طویل جواب دیا ہے واللہ اعلم۔

فتاوٰی العدنیہ کی عبارت مکمل ہوگئی۔

''تحفہ'' کے مصنف شیخ ابن حجر مکی سے سوال کیا گیا۔ کیا اولیاء کرام کی مزارات کی زیارت کے ارادے سے ایک متعین وقت مین سفر کرنا جائز ہے جب کہ مزارات کے پاس کثیر مفاسد پائے جاتے ہیں جیسے مردوں اور عورتوں کا اختلاط اور کثیر چراغوں کا روشن کرنا وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے جواب دیا: اولیائے کرام کی مزارات کی زیارت کرنا اور اس کے لیے سفر کرنا مستحب اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے لیکن شیخ ابو محمد کا یہ قول ہے کہ صرف قبر نبوی کی زیارت کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔ اس کی تردید امام غزالی نے کردی ہے۔

حدیث میں تین مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کی طرف سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

اس کی علت یہ ہے کہ جب تمام مساجد فضیلت و ثواب میں مساوی ہیں تو کسی مسجد کی طرف سفر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ شیخ ابو محمد نے اسی ممانعت پر قیاس کیا ہے۔ لیکن حضرات اولیاء کے درجات و مراتب، تقرب الی اللہ کے لحاظ سے متفاوت اور متفرق ہوتے ہیں اور ان کے

اسرار و معارف کے اعتبار سے زیارت کرنے والوں کو زیارت میں متعدد اور گونا گوں فوائد و برکات حاصل ہوتے ہیں۔ یہیں سے مزارات اولیاء کی طرف قصد وارادہ کے ساتھ سفر کرنا، صرف مردوں کے لیے مسنون ہونا اوران کی نذروں کا منعقد ہونا، معلوم ہو گیا۔

اور سائل نے جن بدعات اور محرمات کی جانب اشارہ کیا ہے یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ ان کی وجہ سے قربات اور مستحبات کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان قربات پر عمل کرنا اور ان بدعات کا انکار وازالہ، مسلمان پر لازم ہے۔

اور فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے کہ قطع نظر طواف واجب کے مندوب طواف بھی عورتوں کی موجودگی کے ساتھ کیا جاتا ہے اوراسی طرح رمل بھی۔ البتہ فقہاء نے حکم دیا ہے کہ عورتوں سے دور رہتے ہوئے طواف اور رمل کریں۔ اور جو بھی حرام دیکھیں تو منع کریں بلکہ ممکن ہو تو اس کا ازالہ کریں۔

اور جس نے اختلاط اور اس جیسی چیزوں سے خوف کھاتے ہوئے زیارت ہی کو مطلقاً منع قرار دے تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ وہ طواف، رمل، عرفہ اور مزدلفہ میں قیام اور رمی کو منع قرار دے۔ اور ائمہ کرام نے ان امور میں کسی امر کے متعلق ممانعت نہیں کی ۔ حالانکہ ان سارے امور کے اندر اختلاط ہی اختلاط ہے۔ فقہاء نے نفسِ اختلاط کو منع کیا نہ کہ اس قسم کے امور میں اختلاط کو۔

اور جس نے اختلاط کے خوف سے زیارت کا انکار کیا ہے اس کی جلالت سے دھوکہ نہ کھاؤ اور اس کے کلام کے محمول کو ہماری بیان کردہ تفصیل پر متعین کردو۔ ورنہ اس کے لیے اور کوئی وجہ نہیں ہے، اور اس کا یہ زعم کہ اولیائے کرام کی زیارت بدعت ہے، کیوں کہ اس کا رواج سلف کے زمانہ میں نہ تھا، ممنوع ہے اور اس کے قول کو تسلیم کرنے کی صورت میں بھی وہ بدعت منہیہ نہیں بلکہ بدعت واجبہ قرار پائے گی۔ جیسا کہ انہوں نے تصریح کی ہے۔ علامہ

ابن حجر کا جواب مکمل ہوا۔

اور ''جواہر'' کی عبارت یہ ہے کہ زیارتِ قبور اور جس قدر ممکن ہو سکے قرآن کریم کی تلاوت اور میت کے حق میں دعائے مغفرت کرنا مندوب اور مستحسن ہے بلکہ ایسی زیارت مندوب اور مستحسن ہے۔

''مصباح الانام'' کے مصنف سترھویں فصل میں لکھتے ہیں:

جان لیجئے! بے شک نجدی کے ہفوات اور واہیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے سید المرسلین خاتم النبین حبیب رب العالمین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر کو ممنوع قرار دیا۔ بلکہ مقام احساء کے لوگ زیارتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے اور جب مقام درعیہ میں پہنچے تو نجدی نے ان کی داڑھیاں منڈھوا دیں اور انھیں انتہائی خستہ حالت میں درعیہ سے احساء کی طوف لوٹا دیا۔ حتی کہ اس سال دنیا جہاں سے لوگ درعیہ آ پہنچے اور ان سب کا مقصد بھی زیارتِ نبویؐ اور حج تھا۔

بعض لوگوں نے نجدی کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ یہ مشرکین ہیں جو مدینہ جا رہے ہیں۔ انہیں جانے دو اور مسلمان وہ ہیں جو ہمارے حلقے میں ہیں۔

(یہ عجیب وغریب تشدد اور تعصب ہے،) باوجود اس کے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے زیارت سے منع نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ زیارتِ نبویؐ کے لئے سفر کرنا مستحب نہیں ہے۔ اور ابو محمد نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے سوا کسی اور انسان کی زیارت کے لیے سفر مستحب نہیں ہے جیسا کہ ہم نے تیرھویں فصل کے خاتمہ میں، بیان کیا ہے۔

زیارتِ نبوی کے لیے سفر کو ممنوع قرار دینے والے حضرات اور اولیائے کرام کی زیارت کے لیے سفر کو غیر مستحب قرار دینے والے حضرات دونوں کے موقف کی تردید امام

غزالی نے ''احیاء'' میں کردی ہے۔

اس فرق کو پیشِ نظر رکھیں کہ نجدی حضرات قبر نبویؐ کی زیارت کرنے والے کو عقاب اور عتاب کررہے ہیں اور علامہ ابن تیمیہ نے یہ نہیں کہا کہ قبرِ نبوی کی زیارت کرنے والا خطا کار ہے بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ بالراست قبر نبویؐ کی زیارت، غیر مستحب ہے۔ لہٰذا مسجد نبویؐ کی طرف سفر کی نیت کی جائے اور اس کے ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی جائے۔ اس کے بعد ابن تیمیہ نے جو کلام کیا ہے وہ چنداں قابلِ التفات نہیں ہے۔

نیز ''مصباح الانام'' کے مصنف مذکورہ فصل میں لکھتے ہیں:

''احیاء'' میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو قبر نبویؐ کے پاس مقرر کیا ہے جو ہر اس امتی کا سلام بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچا دیتا ہے جس نے آپ پر سلام بھیجا ہے۔

پھر غزالی نے فرمایا:

یہ اس شخص کے حق میں ہے جو آپؐ کی مزار پر حاضری نہ دے سکا۔ پھر بھلا کیسے اس شخص کا سلام آپؐ کی بارگاہ میں نہیں پہنچے گا جس نے وطن سے مفارقت اختیار کی اور آپؐ کی محبت اور شوق میں وادیوں کو طے کرتے ہوئے روضۂ اقدس پر پہنچا۔ انتہی

مذکورہ دونوں فصلوں میں مصنف ''مصباح الانام'' کی بڑی طویل بحث ہے۔ جس کے نقل کی یہاں گنجائش نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۳۲)

# در تبرک

صاحبِ تفسیر جلالین علامہ جلال الدین سیوطی سورۃ البقرہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

**وقال لهم نبيهم ان اٰية ملكه ان ياتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترک اٰل موسیٰ واٰل هارون تحمله الملائکة ان فی ذلک لاٰية لکم ان کنتم مؤمنين**

اور ان کے نبی حضرت شمویلؑ نے کہا جب کہ لوگوں نے ان سے طالوت کی سلطنت سے متعلق نشانی طلب کی۔ بے شک ان کے بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا جس میں انبیائے کرام کی تصویریں ہوں گی۔ اور اس صندوق کو اللہ نے حضرت آدمؑ پر نازل فرمایا اور ان کے نزدیک ایک عرصۂ دراز تک رہا اور اس کے بعد قوم عمالقہ نے اس پر قبضہ کرلیا اور یہ لوگ اسی تابوت کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر فتح ونصرت طلب کرتے تھے اور جنگ میں اس کو مقدم رکھتے اور اس سے سکینت وطمانیت پاتے تھے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا: اس تابوت میں تمہارے قلوب کے لیے تمہارے رب کی طرف سے طمانیت وسکینت موجود ہے اور اس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے آثار ومتروکات ہیں وہ آثار یہ ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نعلین شریفین اور آپؑ کا عصائے مبارک اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور من وسلویٰ (جو ان لوگوں پر آسمان سے نازل ہوتا تھا) کا پیمانہ۔ اور تورات کے الواح کے ریزے وٹکڑے اور اس صندوق کو فرشتے اٹھالاتے تھے۔ بے شک اگر تم صاحب ایمان ہو تو اس میں تمہارے لیے طالوت کی بادشاہت پر نشانی ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''فتح الرحمٰن'' میں فرماتے ہیں:

بنی اسرائیل کو ان کے پیغمبر شمویلؑ نے کہا کہ بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تسکینِ قلب کا سامان ہے جس کے سبب سے تم لوگ جنگ کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے اور اس صندوق میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے کچھ آثار اور متروکات ہوں گے۔ اور اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے۔ بے شک اگر تم صاحب یقین ہو تو اس صندوق میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی ''موضح القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''اور کہا ان کو ان کے نبی نے، نشانی اس کی سلطنت کی یہ کہ آوے تم کو صندوق، جس میں دل جمعی ہے تمہارے رب کے طرف سے اور کچھ چیزیں جو چھوڑ گئے موسیٰ اور ہارون کی اولاد، اٹھا لاویں اس کو فرشتے، اس میں نشانی ہے تم کو اگر یقین رکھتے ہو۔ انتہیٰ

اور موضح القرآن کے حاشیہ پر یہ فائدہ تحریر فرماتے ہیں:

''بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے موسیٰ و ہارون کے ۔لڑائی کے وقت سردار کے آگے لے چلتے اور دشمن پر حملہ کرتے تو اس کو آگے دھر لیتے۔ پھر اللہ فتح دیتا۔ جب بدنیت ہو گئے تو وہ صندوق ان سے چھن گیا۔ غنیم کے ہاتھ لگا۔ اب جو طالوت بادشاہ ہوا وہ صندوق خود بخود رات کے وقت اس کے گھر کے سامنے آ موجود ہوا۔ سبب یہ کہ غنیم کے شہر میں جہاں رکھا ہوا تھا ان پر بلا پڑی، پانچ شہر ویران ہوے، تب ناچار نہوں نے دو بیلوں پر لاد کر ہانک دیا۔ پھر فرشتے بیلوں کو ہانک کر یہاں لے آئے۔ انتہی

صاحب جلالین سورۂ یوسف کی تفسیر میں فرماتے ہیں

اذهبوا بقميصى هذا فالقوه على وجه ابى يات بصيرا ۔ فلما ان جاء البشير القاه على وجهه فارتد بصيرا۔

حضرت یوسف نے فرمایا۔ میری قمیص لے جاؤ میرے والد کے چہرے پر ڈال دو

تو ان کی آنکھوں میں روشنی آ جائے گی۔ یہ وہی قمیص ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے اس وقت پہن رکھا تھا جب کہ انہیں آگ میں ڈال دیا گیا اور یہی قمیص حضرت یوسفؑ کی گردن میں رہی جب کہ وہ کنویں میں ڈال دیے گئے تھے اور یہ جنت کی قمیص تھی۔ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسفؑ کو حکم دیا کہ اس قمیص کو اپنے والد (حضرت یعقوبؑ) کے پاس بھیج دیں۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا۔ اس میں جنت کی بو باس ہے۔ جس کو مریض پر ڈال دیں وہ شفایاب ہوگا۔ پس ان کے چہرہ پر ڈال دو تو آنکھوں میں بصارت لوٹ آئے گی۔

نیز صاحب جلالین تفسیر یوسفؑ میں فرماتے ہیں:

جب یہودا حضرت یوسفؑ کے پاس سے قمیص لے کر حضرت یعقوبؑ کے پاس آیا اور ان کے چہرہ پر ڈال دیا تو ان کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ یہی وہ یہودا تھا، جس نے حضرت یعقوبؑ کے پاس حضرت یوسف کی خون آلود قمیص لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس لیے اس نے چاہا کہ حضرت یعقوبؑ کو فرح و سرور سے ہم کنار کرے، جس طرح کہ اس نے انہیں مغموم و محزون کیا تھا۔ جب قمیص آپؑ کے چہرہ پر پڑ الدیا تو آنکھوں میں روشنی آ گئی۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی ''فتح الرحمٰن'' میں فرماتے ہیں:

حضرت یوسف نے فرمایا کہ میرا پیراہن لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرہ پر ڈال دو تا کہ وہ بینا اور صاحب بصارت ہو جائیں۔

نیز شاہ صاحب اسی کتاب میں فرماتے ہیں: پس جب حضرت یعقوبؑ کے سامنے مژدہ سنانے والا آ پہنچا اور ان کے چہرہ پر قمیص ڈال دیا تو وہ بینا ہو گئے۔

مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی ''موضح القرآن'' میں لکھتے ہیں: لے جاؤ کرتا میرا اور ڈالو منہ پر میرے باپ کے، چلا آوے آنکھوں سے دیکھتا۔

نیز شاہ صاحب اسی کتاب میں فرماتے ہیں

پھر جب پہنچا خوش خبری والا ڈالا کرتا اس کے منہ پر تو الٹا پھر آنکھوں سے دیکھتا۔انتھی

مذکورہ آیات سے برکات کا ثبوت ملاحظہ کیجئے:

شیخ الاسلام زکریاؒ ''شرح رسالہ قشیریہ'' میں اولیاء کرام کی کرامات کے اثبات میں فرماتے ہیں: شیخ معروف کرخیؒ طبقۂ اولیاء میں منبع فیوض و برکات ہیں۔حتیٰ کہ ان کا مزار بھی تریاقِ آزمودہ ہے جس شخص نے بھی اس سے کچھ اخذ کیا وہ شفایاب ہوا۔انتھی

''النہایۃ'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ امام رملی نے اولیاء کرام کے آستانوں کو تحصیل تبرک کے ارادہ سے چومنے کو بغیر کراہت کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

مصباح الانام کے مصنف تیسری فصل میں لکھتے ہیں

نجدی کے خرافات اور بے ہودہ باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اولیاء اکرام کی زیارت کا قصد اور ان کے ساتھ حسنِ اعتقاد اور ان سے تحصیل تبرک کا عقیدہ شرکِ اکبر ہے۔واضح رہے کہ اولیائے کرام کی زیارت کا قصد اور ان سے تحصیل تبرک کا حکم پہلے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو مصاحب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو دیا ہے کہ وہ حضرت اویس قرنیؒ کے پاس جائیں اور ان سے دعا و استغفار طلب کریں۔جیسا کہ صحیح مسلم ہے۔

اولیاء کرام سے حصول برکت کی نظیر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک حضرت کعب بن مالک کے پاس تھی جس سے وہ برکت حاصل کرتے تھے،اس چادر کو حضرت معاویہؓ نے ان کی اولاد سے تیس ہزار درہم دے کر خریدا اور ہمیشہ خلفاء اس سے برکت حاصل کرتے رہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک حضرت خالد بن ولید کی ٹوپی میں تھے اور وہ اس ٹوپی کو ہمیشہ برکت کے خیال سے پہنا کرتے تھے جیسا کہ قاضی عیاض نے'' شفاء'' میں ذکر کیا ہے۔

امام عبدالرءوف المناوی الشافعی مصنف ''الکواکب الدریہ فی طبقات الصوفیاء'' نے امام سیوطی کی کتاب ''خصائص'' کی شرح میں لکھا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کو منڈھوایا اور صحابۂ کرام میں تبرک کے خیال سے اپنے بال تقسیم فرمایا۔ کتابِ مذکور میں یہ طویل حدیث ملاحظہ کیجئے۔

تحصیل تبرک کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ قرآن کریم میں خود اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کی حکایت بیان فرمائی اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا فلما ان جاء البشیر القاہ علی وجھہ فارتدا بصیرا ۔میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے چہرہ پر ڈال دو تو ان کی آنکھوں میں بصارت آجائے گی۔ پس خوشخبری سنانے والا آ پہنچا اور حضرت یعقوبؑ کے چہرہ پر قمیص ڈالدی تو ان کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہر چیز کی اصل اور بنیاد اعتقاد ہے اور اس امت کے مردوں میں سب سے پہلے جنھوں نے یہ سعادت حاصل کی وہ سعید اور نیک بخت حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد رکھا کہ آپؐ اللہ کے رسول اور اللہ کے حبیب ہیں اور خدا کی ساری مخلوق میں سب سے بہتر اور افضل ہیں۔ پس اسی اعتقاد کی بنیاد پر آپؓ ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کی۔

اعتقاد، انتقاد اور تنقید کی ضد ہے۔ اور یقیناً کفار اسی سے شقی اور بد بخت ہو گئے اس لیے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقید اور تنقیص کی اور آپ کو آپؐ کے صحابہؓ کو اور ان کو دوست رکھنے والوں کو عظمت وجلالت اور تعظیم وتکریم کی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ پس جو شخص بھی ان صحابہ کرام کو اور ان کے دوستوں کو اعتقاد کی نظر سے دیکھے تو وہ نیک بخت اور سعید ہے۔ اور جو شخص ان کو انتقاد اور تنقید کی نظر سے دیکھے تو وہ شقی اور بد بخت ہے اور وہ ان کے فیوض وبرکات سے محروم ہے۔ انتہیٰ

# فائدہ نمبر ۳۳

# در اقسام ندا

واضح ہو کہ ندا کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ندا کبھی تعبد کے طریقے پر ہوتی ہے۔ جیسے کوئی شخص نماز یا خارج نماز میں یاایھا المزمل پڑھتا ہے۔ اس سے یہاں یہ بات لازم نہیں آتی کہ قاری غیب دانی کا اعتقاد رکھتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر رہا ہے اور آپ کو نماز تہجد ادا کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ معاذ اللہ من ذلک۔ بلکہ کلام خدا کو تعبد کے طریقہ پر تلاوت کر رہا ہے۔

اور اسی طرح تشہد میں السلام علیک ایھا النبی یہ ندا بھی تعبد کے طریقے پر ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی شرح ''مشکوٰۃ'' میں فرماتے ہیں کہ السلام علیک ایھا النبی اس کلام کو اسی نہج پر باقی رکھنا ہے جس نہج پر وہ اصل میں تھا، کیوں کہ شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پروردگار کی جانب سے سلام کا خطاب اسی نہج آ پہنچا اور یہی لفظ امت کی تعلیم کے وقت میں بھی باقی رہ گیا۔

اور ندا کبھی قانونِ فصاحت کے اقتضاء کی وجہ سے ہوتی ہے جس کو اصحاب علم بدیع کی اصطلاح میں التفات کہتے ہیں۔ منادی (ندا کرنے والا) اس قسم میں غائب کو حاضر قرار دے کر مخاطب ہوتا ہے چناں چہ اکابر حضرات کی مثنویات اور قصائد میں اس قسم کی ندا کا استعمال کثرت سے موجود ہے۔ یا، کلام غائبانہ سے خطابِ حاضرانہ کی جانب انتقال کرتا ہے۔ یا کلام غائبانہ سے خطابِ حاضرانہ کی جانب انتقال کرتا ہے۔ جیسا کہ شیخ سعدی کے کلام میں ہے:

خدیو خردمند فرخ نہاد      کہ شاخ امیدش برومند باد

درختے بہشتے تو اے بادشاہ   کہ افگندہ سایہ یکسالہ را

نیک سیرت عاقل بادشاہ جس کی امید و آرزو کی شاخ سرسبز رہے، اے بادشاہ تو شجر طوبیٰ ہے جس کا سایہ ایک سال کی مدت میں طے ہو سکے گا۔

اور کبھی بیماری والا شخص اور ڈرنے والا شخص مرض اور خوف کی حالت میں اپنے ماں باپ اور دیگر غم خواروں کو بے اختیار غیب دانی کی نیت کے بغیر پکارتا ہے اور کبھی مغموم شخص فرطِ غم سے وفات یافتہ لوگوں کو پکارتا ہے لیکن وہ ان کے غیب دان ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتا۔ اور کبھی عاشق فرطِ محبت اور جوشِ الفت سے معشوق غائب کو حاضر قرار دے کر اس سے مخاطب ہوتا ہے اور اپنے بے قرار دل کو کچھ قرار و تسکین دیتا ہے۔ اور ندا کبھی توسل اور استمداد کے طریقے پر ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۳۴

# توسل و استمداد

''حصن حصین'' کے مصنف شیخ القراء والمحدثین'' آداب الدعاء'' میں امام بخاری، امام بزاز اور امام حاکم سے نقل کرتے ہیں، وان نتوسل الی اللہ تعالیٰ بانبیائه ،ہمیں چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیائے کرام کا وسیلہ اختیار کریں اور امام بخاری سے نقل کرتے ہیں والصالحین من عبادہ ای ان نتوسل الی اللہ تعالیٰ بالصالحین من عبادہ ۔ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے صالح اور نیک بندوں کا وسیلہ اختیار کریں۔

''مصباح الانام'' کے مصنف چودھویں فصل میں لکھتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کی

حدیث سے ثابت ہے کہ انسان کا اپنے صالح عمل کے وسیلہ سے دعا کرنا صحیح اور درست ہے جیسا کہ اہلِ غار کی حدیث میں ہے (تین اشخاص غار میں تھے۔ تیز وتند آندھیوں کے باعث ایک بڑی چٹان ڈھل گئی جس سے غار کا منہ بند ہوگیا۔) کہ انہوں نے بارگاہ خداوندی میں اپنے افضل اعمال کے وسیلہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مصیبت سے رہائی عطا کی۔ بخاری ومسلم نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ انتھی

مولانا شاہ عبدالحق دہلوی شرح ''مشکاۃ'' میں فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے علاوہ دیگر اہلِ قبور سے توسل اور استمداد کا انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زیارت کا مقصد صرف اموات کے لیے دعا، استغفار اور تلاوتِ قرآن کے ذریعہ نفع پہنچانا ہے۔ اور مشائخ صوفیاء اور بعض فقہاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیائے کرام کے سوا دیگر حضراتِ کرام مثلاً صحابہؓ اور اولیاء سے توسل اور استمداد ثابت کیا ہے۔ اور اہلِ کشف وکمال کے نزدیک یہ مسئلہ ثابت اور متحقق ہے کہ انبیاء کے علاوہ دیگر بزرگوں سے بھی بہت سارے لوگوں کو فیوض وبرکات پہنچتے ہیں اور اس طائفہ کو صوفیاء کی اصطلاح میں اویسی کہتے ہیں۔

امام شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا: قبولیتِ دعا کے لیے امام موسیٰ کاظم کا مزار شریف تریاق مجرب ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے فرمایا: جس شخص سے اس کی زندگی میں مدد طلب کی جاتی تھی اس کی وفات کے بعد بھی اس سے مدد طلب کی جاسکتی ہے۔

مشائخ عظام میں سے ایک بزرگ نے فرمایا: میں نے مشائخ کرام میں چار اشخاص کو دیکھا جو اپنی قبروں میں اسی طرح تصرف کررہے ہیں، جس طرح کہ وہ اپنی زندگی میں تصرف کرتے تھے بلکہ زندگی سے بھی زیادہ تصرف کررہے ہیں۔ ایک شیخ معروف کرخی دوسرے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور اولیائے کرام میں سے مزید دو حضرات کو شمار کیا۔ یہاں جن

اصحابِ تصرف کا شمار کیا گیا ہے اس سے حصر مقصود نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے جن بزرگوں کو دیکھا اور انہیں متصرف پایا، اس کو بیان کر دیا ہے۔

سید احمد زروق جو دیار مغرب کے عظیم علماء اور مشائخ میں سے ہیں انہوں نے فرمایا: ایک روز شیخ ابو العباس حضرمی نے مجھ سے پوچھا کہ زندہ بزرگوں کی امداد قوی تر ہے یا وفات یافتہ بزرگوں کی امداد؟ میں نے عرض کیا: ایک جماعت کہتی ہے کہ زندہ بزرگ کی امداد قوی تر ہے۔لیکن میں کہتا ہوں کہ وفات یافتہ بزرگ کی امداد قوی تر ہے۔ اس پر شیخ نے فرمایا: ہاں! یہ درست ہے۔ کیوں کہ وفات یافتہ بزرگ حق تعالیٰ کی بساط میں اور اس کے حضور میں ہے۔

اس موضوع پر صوفیاء کی بڑی تفصیلات ہیں جو احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ اور کتاب وسنت اور مشائخ سلف صالحین کے ارشادات اور اقوال میں کوئی قول ایسا نہیں ہے جو ان امور وحقائق کا مخالف اور منافی ہو۔ اور ان کی تردید کرتا ہو۔ آیات واحادیث سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ روح، غیر فانی ہے اور اولیاء اللہ کی ارواح کو بارگاہ خداوندی میں ایک خاص قرب اور ایک مخصوص مقام حاصل ہے جس طرح کہ انہیں زندگی میں حاصل تھا۔ بلکہ زندگی سے بھی زیادہ بلند مقام اور تقرب حاصل ہے۔ اور اولیاء اللہ کو دنیا میں تصرف اور کرامات کی نعمت حاصل ہے اور یہ قوت تصرف اور شرفِ کرامت دراصل ان کی ارواح سے وابستہ ہے اور ارواح غیر فانی ہیں۔ اور متصرف حقیقی، نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی متصرف حقیقی اور فاعل حقیقی ہے اور یہ ساری چیزیں یعنی تصرف وکرامات اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت سے ہے۔ اور یہ حضرات اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد بھی جلال حق میں فانی ہیں۔ لہذا اللہ کے برگزیدہ دوستوں میں سے کسی دوست کی وساطت سے اور اس کے مقام کے باعث جو اس کو بارگاہ ایزدی میں حاصل ہے۔ اگر کسی شخص کو کوئی چیز حاصل ہو جائے تو یہ بعید نہیں ہے، جس طرح کہ حیات کی حالت میں تھا اور زندگی وموت دونوں حالتوں میں فعل اور تصرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔

یعنی وہی فاعلِ حقیقی اور متصرف حقیقی ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان دو حالتوں یعنی زندگی اور موت کے درمیان فرق کر سکے۔ اور اس کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ (یعنی بزرگان دین زندگی میں تو متصرف ہوں اور موت کے بعد نہ ہوں)۔

علامہ ابن حجر مکی ہیتمی نے اس حدیث لعن اللہ الیھود والنصاری اتخذوا قبورھم انبیائھم مساجد ۔یعنی اللہ تعالیٰ یہود و نصاری پر لعنت کرے کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ہے) کی تشریح میں لکھا ہے کہ لعنت کی بات اس صورت پر مبنی ہے جب کہ نمازی صاحبِ قبر کی تعظیم کے خیال سے قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور یہ بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن کسی پیغمبر یا اللہ کے ولی کی قبر کے قریب مسجد تعمیر کرنے میں اور کسی پیغمبر یا ولی کی قبر کے نزدیک نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب کہ نماز پڑھنے میں صاحبِ قبر کی تعظیم کا قصد نہ ہو۔ اور قبر کی جانب توجہ اور رخ نہ ہو بلکہ صاحبِ قبر سے حصول مدد کی نیت ہو تا کہ اس کی برکت اور اس کی روح پاک کی قرب و مجاورت کی وجہ سے عبادت کا ثواب کامل ہو اور دعا مقبول ہو۔

شاہ صاحب ''جذب القلوب'' کے پندرھویں باب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی والدۂ ماجدہ حضرت فاطمہ بنتِ اسد کی قبر کے ذکر میں مذکور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں اترے اور یہ دعا پڑھی: بحق نبیک والانبیاء الذین من قبلی: اے اللہ! تیرے نبی (محمد) اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کے وسیلے سے فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما۔

اس حدیث میں حیات اور بعد ممات دونوں حالتوں میں وسیلہ جائز ہونے پر دلیل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نسبت (بحق نبیک) کی وجہ سے حالت حیات میں وسیلہ جائز ہے اور انبیاء کرام کی جانب نسبت (والانبیاء من قبلی) کی وجہ سے بعد از

وفات وسیلہ جائز ہے اور جب حضرات انبیاء کرام سے بعد از وفات وسیلہ جائز ہے تو سید الانبیاء کی وفات کے بعد آپؐ سے بطریقِ اولیٰ وسیلہ جائز ہے بلکہ اس حدیث سے اگر یہ قیاس کیا جائے تو درست ہوگا کہ اولیاء اللہ سے بھی ان کی وفات کے بعد وسیلہ جائز ہے۔ مگر اس صورت میں جب کہ بعد از وفات وسیلہ طلب کرنا، انبیاء کے لئے مخصوص ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کی تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

نیز شاہ صاحب اسی میں رقم طراز ہیں:۔

عالمِ برزخ اور قبر کی منزل میں انبیائے کرام کے ساتھ تبرک اور توسل کو مخصوص رکھنے میں تردد ہے، اور ان کے علاوہ امت کے صلحاء اور اولیاء اللہ کے حق میں توسل کے جواز کی وجہ ظاہر ہے۔ حالتِ حیات میں توسل کا جواز عام ہونے کی وجہ سے میت کی روح اور شعور وادراک کے بقاء کے ضمیمہ کے ساتھ اور عند اللہ ان کے قرب ومنزلت کی وجہ سے جو ان کو ایمان وعملِ صالح اور اتباع سنت کی وجہ سے حاصل ہے۔

اس کے علاوہ توسل کی حقیقت بس یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال اور دعا کی جائے اللہ تعالیٰ کی اس محبت وکرم کے واسطہ سے جو وہ اس بندۂ خاص کے ساتھ رکھتا ہے۔

یا اس بندہ کی روحانیت سے التماس اور طلب کرنا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور فریاد کرے اس بندۂ خاص کے قرب وکرامت کے وسیلہ سے جو اس کو بارگاہِ خداوندی میں حاصل ہے۔ اور اس کے لیے نص صریح موجود رہنے کی ضرورت نہیں، متوسل ہی کی ذات کے بقاء کے وجود کی جہت ہی سے انتہی۔

نیز شاہ صاحب" اشعة اللمعات فی شرح مشکوة " کی تیسری جلد میں باب "حکم الاسرار" میں فرماتے ہیں کہ اہلِ قبور میں جو اولیاء اور صلحاء ہیں، ان سے توسل واستمداد کے منکر فقہاء چند ہی ہیں (انبیاء کرام سے توسل واستمداد کے مسئلہ میں تمام فقہاء کا اتفاق

ہے کہ جائز ہے ) اگران بعض فقہاء کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ قبور کو زائرین اوران کے احوال کے علم اور سماع کی قدرت نہیں ہے تو اس خیال کا باطل ہونا ثابت ہے اور اگر انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کو قبر میں قدرت اور تصرف کی قوت نہیں ہے کہ وہ مدد کر سکیں بلکہ یہ خود ہی محبوس اور ممنوع ہیں اور قبر میں پیش آنے والے عوارضات میں مشغول اور منہمک ہیں اوران کو وہاں کی شدت و تکلیف دوسروں کی طرف متوجہ ہونے سے روک رکھی ہے تو یہ کلیہ بالخصوص اولیاء اللہ کی شان میں صحیح نہیں ہے۔ جو اللہ کے دوست اور محبوب ہیں۔ یہ بات ممکن ہے کہ ان کی ارواح مقدسہ کو قرب خداوندی کے باعث، برزخ میں شفاعت، دعا اور زائرین کی حاجات کو پورا کرنے کی قدرت حاصل ہو جو ان کا وسیلہ طلب کرتے ہیں۔ جیسا کہ قیامت کے روز انہیں یہ قدرت حاصل ہوگی اوراس کی نفی پر کیا دلیل ہے۔

مفسر قرآن امام ناصر الدین بیضاوی نے" والنازعات غرقا ۔الایة کی تفسیر ارواح فاضلہ کی صفات سے کی ہے۔ان کے بدن سے مفارقت کی حالت میں جب کہ انہیں ان کے جسموں سے کھینچ لیا جاتا ہے، علاحدہ ہوتی ہیں اور عالم ملکوت کی جانب خوشی سے پرواز کرتی ہیں اوراس میں سیر وسیاحت کرتی ہیں اور مقدس مقامات میں ایک دوسرے پر سبقت کرتی ہیں۔ اور قوت وشرف کے ذریعہ دنیوی امور میں تدبیر کرنے والوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آخر منکرین توسل واستمداد کیا چاہتے ہیں۔

ہم نے امداد واستمداد سے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محتاج اور فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتا ہے اوراسی کی ۔ بے نیاز اور عزت والی بارگاہ میں اپنی حاجت کی تکمیل چاہتا ہے اوراس کی بارگاہ عزت میں اس بندۂ مقرب ومکرم کی روحانیت اور اعمال کا وسیلہ اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے اے خداوند! تیرے اس بندے کی برکت سے جس پر تو نے اپنی رحمت نازل کی ہے اوراس کو اپنے فضل وکرم سے مکرم ومعزز فرمایا اوراس کرم و

احسان کے صدقے میں جو تو نے اس پر کیا ہے، میری حاجت پوری فرما۔تو عطا کرنے والا ہے اور کرم کرنے والا ہے۔

یا استمداد کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرنے والا اس بندۂ مقرب و مکرم کو پکارتا ہے کہ اے خدا کے بندے! اے اللہ کے ولی! میرے لیے شفاعت فرمائیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے مجھے میرا مطلوب پورا کردے اور میرا مقصود و مسئول پورا کرے۔اور میری ضرورت و حاجت پوری کردے۔پس! معطی (عطا کرنے والا) مسئول (جس سے سوال کیا) اور مامول (جس سے امید کی گئی) وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔اور یہ بندہ (صاحبِ قبر) درمیان میں صرف وسیلہ ہے۔ اور یہ اپنی ذات اور وجود سے متصرف، فاعل اور قادر نہیں ہے بلکہ اللہ ہی قادر اور متصرف اور فاعل حقیقی ہے۔اور اولیائے کرام اللہ تعالیٰ کے فعل اور قدرت وسطوت میں فانی اور ھالک ہیں۔اور ان بزرگوں کو فعل، قدرت اور تصرف کی قوت بالذات نہ اِس وقت ہے کہ وہ قبور میں ہیں اور نہ اُس وقت تھی جب کہ وُہ دنیا میں زندہ تھے۔(دونوں حالتوں زندگی میں اور قبر میں اللہ کی قدرت ہی سے ان کا تصرف قائم ہے اور اعداد جاری ہے اور یہ ان کی ذاتی قوت اور بخشش نہیں ہے)

امداد و استمداد کا جو معنیٰ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اگر یہ موجب شرک اور ماسوی اللہ کی جانب توجہ کا باعث ہے جیسا کہ اس مسئلہ کے منکر خیال کرتے ہیں تو چاہیے کہ اہل اللہ اور صالحین سے ان کی زندگی میں دعا کی درخواست اور توسل سے منع کیا جائے۔اور یہ باتفاق فقہاء ممنوع نہیں ہے بلکہ مستحب اور مستحسن ہے اور یہ دین میں شائع و ذائع ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ موت کے بعد یہ حضرات تصرف اور قدرت سے معزول ہو چکے ہیں، اور زندگی میں اُن کو جو حالت اور کرامت حاصل تھی اس سے ان کو باہر کر دیا گیا ہے تو اس بات کے لیے دلیل کیا ہے؟

یا یہ کہا جائے کہ یہ حضرات موت کے بعد پیش آنے والے مصائب اور آفات میں گھرے ہوئے ہیں تو یہ کوئی کلیہ نہیں اور اس کے دوام واستمرار پر دلیل بھی نہیں ہے کہ قیامت تک وہ ان عوارضات میں پھنسے رہیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہوسکتی ہے کہ یہ بھی کلیہ نہ ہو اور استمداد کا فائدہ عام نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ بعض حضرات عالم قدس کی طرف مائل ہوں اور لاہوت حق میں فنا ہوں جس کی وجہ سے ان کو عالم دنیا کی جانب کسی قسم کا شعور اور کسی طرح کی توجہ نہ رہے۔ اور اس حال میں ان سے کسی قسم کا تصرف اور کسی نوع کی تدبیر وتصور کا ظہور نہ ہوتا ہو جس طرح کہ اس عالم میں بھی مجذوب اور باہوش بزرگوں کی حالت کے فرق سے بھی ظاہر ہوتا ہے یعنی مجذوب حضرات دنیاوی امور سے غافل اور بے تعلق رہتے ہیں۔

ہاں! اگر زائرین یہ اعتقاد رکھیں کہ اصحاب قبور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع اور توجہ کے بغیر اور اس کی جناب میں التجا کے بغیر اپنی ذات سے متصرف، مختار، قادر اور فاعل ہیں جیسا کہ عوام اور جہلاء اور غافل اشخاص اس قسم کے اعتقاد میں مبتلا ہیں اور وہ جو کچھ افعال واعمال کر رہے ہیں یہ سب حرام ہیں اور منہی عنہ ہیں (وہ کام جس سے منع کیا گیا)۔ قبر کو بوسہ دینا اور اس کو سجدہ کرنا اور اس کی طرف چہرہ کرتے ہوئے نماز پڑھنا اور اس قسم کے دوسرے امور ہیں جن کے متعلق شریعت میں ممانعت کی گئی ہے اور تحذیر آئی ہوئی ہے۔ اس قسم کے عقائد اور افعال حرام اور ممنوع ہوں گے اور عوام کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں اور یہ چیز نفس مسئلہ اور موضوع سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے۔ حاشا وکلا! ہرگز ہرگز کوئی بھی عالم اور احکامِ شریعت کا جاننے والا نہ اس قسم کے عقائد رکھتا ہے اور نہ اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور نہ اس قسم کے افعال اور امور انجام دینے کی تعلیم اور تلقین کرتا ہے۔

اولیائے کاملین کی ارواح سے استمداد وامداد اور ان سے استفادہ کے باب میں اہلِ کشف مشائخ کرام سے جو روایات اور حکایات بیان کی گئی ہیں وہ اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں

ن کا احاطہ مشکل ہے اور یہ ساری چیزیں ان بزرگوں کی کتابوں میں مرقوم ہیں اور اہل علم کے درمیان مشہور ہیں ۔ لہذا اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان چیزوں کو یہاں نقل کیا جائے اور ممکن ہے کہ ان کے کلمات اور ارشادات منکر اور متعصب شخص کے لیے سودمند ثابت نہ ہوں ۔ عافانا اللہ من ذالک

اس مسئلہ میں بحث، علم اور شریعت کی بنیاد پر ہے، ہاں! تو زیارت کے مسئلہ میں مسنون اور ضروی چیز اصحاب قبور کے لیے سلام کرنا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا اور ان کے لیے تلاوت قرآن کا ثواب پہنچانا ہے۔ لیکن یہاں استمداد سے ممانعت نہیں ہے۔ لہذا زیارت کا حکم اصحاب قبور کی

امداد کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور ان سے امداد طلب کرنے کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور یہ دونوں صورتیں زیات کرنے والے اور صاحب مزار کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہوں گے یعنی صاحب مزار اگر منصب نبوت اور ولایت کا حامل ہو تو اس سے امداد طلب کی جاسکتی ہے اور اگر عام مسلمان ہے تو اس کے لئے ایصال ثواب کے ذریعہ فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ غیر انبیاء (یعنی اولیاء اور صلحاء) سے توسل واستمداد کے مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے ، ۔ انبیاء کرام سے توسل و استمداد کے مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے کیوں کہ حضرات انبیاء زندہ ہیں (فنبی اللہ حی یرزق حدیث، اللہ کے نبی زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اس زندگی اور رزق کو دنیاوی زندگی اور دنیاوی رزق پر محمول نہیں کیا جاسکتا) اور اس پر سب کا اتفاق ہے اور اولیاء کرام اخروی ومعنوی اور برزخی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں۔

اس مقام پر منکروں کے غلط اعتقاد اور غلط کام کی بناء پر کلام اطناب اور تطویل کی حد تک پہنچ گیا کیوں کہ زمانۂ قریب میں ایک جماعت پیدا ہو چکی ہے جو ان اولیاء کرام سے

استمداد اور استعانت کی منکر ہے۔ جو دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف کوچ کر گئے ہیں۔ حالاں کہ یہ اپنے پروردگار کے نزدیک زندہ ہیں۔ اور رزق پا رہے ہیں۔ اور خوش حال ہیں اور اس حقیقت کا شعور لوگوں کو نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ان بزرگوں کی جانب متوجہ ہونے والوں کو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے اور بتوں کی عبادت کرنے والے سمجھتے ہیں۔ اور جو چاہے، کہتے ہیں۔

اس مسئلہ کی تحقیق و تفصیل قلب ہی میں تھی اور اب یہ توفیق الٰہی سے قرطاس پر پھیل گئی الحمد للہ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ واللہ اعلم وحکمہ احکم۔ انتھی

نیز شاہ صاحب "جذب القلوب" کے پندرھویں باب میں تحریر فرماتے ہیں:

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے شفاعت طلب کرنا اور آپ کا وسیلہ طلب کرنا اور آپ کی جناب میں استغاثہ طلب کرنا اور آپ کے جاہ و مرتبہ سے امداد طلب کرنا، انبیاء و مرسلین کی سنت ہے اور سلف و خلف صالحین کی سیرت ہے۔

کیا اس وقت، جب کہ آپ کی روح پاک ابھی جسمانیت کا لبادہ اوڑھے نہ تھی اور کیا اِس وقت، جب کہ آپ دنیاوی زندگی میں جلوہ افروز رہے۔

اور عالمِ برزخ میں بھی اور میدانِ قیامت میں بھی جب کہ انبیاء اور مرسلین کو نطق گوئی کی مجال اور دم مارنے کی تاب و طاقت نہ ہوگی، (آپ کی ذاتِ گرامی متوسل ہے) آپ ہی بارگاہِ رب ذوالجلال میں شفاعت کا آغاز فرمائیں گے اور اولین و آخرین کو نعمت کے سمندروں میں غرق فرمائیں گے اور انوارِ رحمت میں شامل فرمائیں گے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ان چاروں مقامات (قبل تخلیق، حیات دنیاوی، حیات برزخی، میدانِ قیامت) میں امداد و استعانت کے ثبوت میں اخبار اور آثار

وارد ہیں۔

نیز شاہ صاحب اسی کتاب میں رقم طراز ہیں:

یہ بات ثابت اور متحقق ہے کہ ان چاروں مقامات میں سید العباد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدسؐ سے توسل واستمداد، واقع اور ثابت ہے۔

## پہلا مقام

آپؐ کی روحِ اقدس سے توسل ہے جب کہ وہ ابھی خلعت جسمانیت سے ملبوس نہ تھی۔ اس منزل میں کسی روح کا متوسل قرار پانا یہ صرف آپ ہی کا خاصۃ ہے اور اس منقبتِ عظمٰی ومرتبتِ علیا میں کوئی نبی اور کوئی ولی آپؐ کا شریک اور سہیم نہیں ہے۔ اور آپؐ کے علاوہ کسی نبیؑ اور ولی کے تعلق سے نص کا وارد نہ ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ یہ صرف حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔

## دوسرا مقام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوی زندگی میں آپؐ کی ذاتِ اقدس سے توسل و استمداد ہے۔ ظاہر ہے کی یہ صرف آپؐ کی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ آپؐ کے متبعین (حضرات جن کو آپؐ کی متابعت کا شرف اور آپؐ سے قربت کی نسبت حاصل ہے جیسا کہ آپؐ کی آل اور آپؐ کے اصحابؓ اور دیگر اولیائے کرامؒ امت ہیں۔) ان کی دنیاوی زندگی میں توسل واستمداد ثابت ہے۔

دنیا کے موجودات میں اولیاء اللہ کا تصرف اور ان کی کرامات کا ثبوت اولیاء اللہ سے ظاہر ہونے والی کرامات وتصرفات، یہ ہمارے مطلب (توسل واستمداد) کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

نیز طلبِ باراں کے قضیہ میں حضرت عباس ؓ بن عبدالمطلب سے حضرت عمرؓ بن الخطاب کا توسل ثابت ہے۔جس میں کسی ایک عالم کا بھی اختلاف ثابت اور متحقق نہیں ہے۔

## تیسرا مقام

روزِ آخرت میں شفاعت کے وسیلہ سے انبیائے کرام ،اولیاء اللہ اور صالحینِ امت سے بھی توسل اور استمداد ثابت ہے جیسا کہ عقائد کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

## چوتھا مقام

قبر کی منزل اور عالم برزخ میں توسل وتبرک کا حضرات انبیاء کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ اولیاء اللہ اور صلحائے امت کے حق میں بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ زندگی کی حالت میں توسل کا جواز عام ہونے کی وجہ سے میت کی روح کی بقاء وشعور وادراک کے ضمیمہ کے ساتھ اور اس قرب ومنزلت کی وجہ سے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان، عمل صالح اور اتباع سنت سے حاصل ہوا ہے۔

اس کے ساتھ توسل واستمداد کے معنی کی حقیقت بس یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا اور سوال کرنا ہے اس محبت اور لطف وعنایت کی وساطت سے جو اللہ تعالیٰ اس بندۂ خاص کے ساتھ رکھتا ہے یا اس بندہ کی روحانیت سے التماس اور طلب کرنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرے اس قرب وکرامت کے توسل کے ذریعہ جو اس بندہ کو اس درگاہ میں حاصل ہے۔اور متوسل بہ کی ذات کی بقاء کے وجود سے۔ اس بارے میں نص صریح کے وارد ہونے کی ضرورت نہیں ہے برخلاف پہلے مقام کے (خلعتِ جسمانیت سے قبل) بلکہ اس کے منع پر نص کا وارد نہ ہونا ہی کافی ہے۔

ہاں !اگر دلیل قاطع انبیاء کے ساتھ اختصاص پر پائی جاتی تو اس کا منع کرنا درست

ہوتا۔ظاہر ہے کہ مذکورہ دلیل موجود نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ معصوم شخص (نبیؑ) کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں کہ اس کو قرب الہی حاصل ہے اور اس کی موت ایمان پر ہوئی ہے۔ یہ کوئی یقین کے ساتھ کہے جانے والی بات نہیں ہے تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ میت کی روح کے باقی رہنے اور اولیاء اللہ سے عموماً وخصوصاً توسل کے جواز کی بشارت وخوش خبری کے رو سے ان سے توسل کرنا یقینی امر ہے تو پھر ان سے توسل جائز ہوگا۔ اور توسل کرنے میں انبیاء اور اولیاء کے درمیان فرق کے قائل کوئی بھی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں عالم مثال کے اسرار کے محرم اور اربابِ کشف مشائخ کبار سے جو اخبار اور آثار ہیں وہ اس شبہ کو جڑ سے ہی کاٹ دینے والے ہیں۔

ہاں! بعض فقہاء کو اس مسئلہ میں ایک گونہ اختلاف ہے اور یہ بعض بھی کل کے مقابلہ میں ہے اور یہ زیادہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ بہت سارے فقہاء توسل کے منکر ہیں۔ لیکن حق اس بات کا حق دار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ واللہ اعلم

شاہ صاحب نے مذکورۃ الصدر چاروں مقامات میں توسل واستمداد کے ثبوت میں ''جذب القلوب'' کے پندرھویں باب میں جو اسناد اور شواہد بیان کئے ہیں وہ مطالعہ کے قابل ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ان تفاصیل کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔

اس مقام پر ''مصباح الانام'' کے مصنف سید علوی شافعی تریمی کے کلام کا خلاصہ بھی پڑھ لینا چاہیے۔ جو انہوں نے چودھویں فصل میں کیا ہے اور وہ یہ ہے:

امام رملیؒ، امام نوویؒ کی کتاب ''الایضاح'' کی شرح میں فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا انبیائے کرامؑ اور اسی طرح اولیاء کرامؒ سے توجہ، شفاعت یا استغاثہ اور توسل کے ذکر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اس مسئلہ میں امام سبکی متفق ہیں اگر چہ کہ ابنِ عبدالسلام نے ولی سے توسل کو منع کیا ہے۔ اعمال باوجود اس کے کہ وہ

اعراض ہیں، ان سے توسل جائز ہے تو ذواتِ فاضلہ اور نفوس قدسیہ سے، بدرجۂ اولیٰ توسل جائز اور صحیح ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ بندہ کی روحانیت سے دعا کی درخواست کرنا غیر اللہ سے استعانت کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔ چناں چہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وایاك نستعین کی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس مقام پر یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ غیر اللہ سے استعانت اس طریقہ پر کہ اس غیر پر اعتماد ہو، اور اس کو عونِ الٰہی اور تائید ربانی کا مظہر نہیں سمجھ رہے ہیں تو ایسی استعانت حرام ہے اور اگر التفاتِ محض اور توجۂ کامل، اللہ تعالیٰ کی جانب ہو اور غیر اللہ کو عونِ الٰہی کے مظاہر میں سے ایک مظہر جانتے ہوئے اور کارخانۂ اسباب کی طرف نظر کرتے ہوئے اور اس میں حکمتِ الٰہی کا خیال پیش نظر رکھتے ہوئے، غیر اللہ سے استعانت ظاہری کی جائے تو یہ بات حقیقت اور عرفان سے دور نہ ہوگی اور شریعت مطہرہ میں بھی جائز اور درست ہے۔ اور حضرات انبیاء اور اولیاء نے بھی اس قسم کی استعانت، غیر اللہ سے طلب کی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی استعانت، غیر سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔

ان دلائل اور اسناد سے جو حقیقت مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء سے توسل و استمداد، کیا ان کی زندگی میں اور کیا ان کی وفات کے بعد، دونوں حالتوں میں جائز ہے اور اس پر صوفیاء اور فقہاء دونوں کا اتفاق ہے اور اسی طرح انبیائے کرام کے علاوہ دیگر حضرات (صحابہ، اولیا) سے حالت حیات میں توسل و استمداد جائز ہونے پر بھی صوفیہ اور فقہاء سب کا اتفاق ہے لیکن فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور اصحابِ قبور میں جو انبیاء نہیں ہیں ان سے توسل کا مسئلہ اہل کشف و کمال کے ثابت اور متحقق ہے یہاں تک کہ ان سے بہت سارے حضرات کو فیض اور فتوح ارواح کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح سے فیض پانے

والوں کو صوفیاء کی اصطلاح میں اویسی کہتے ہیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''الانتباہ'' میں اسی نسبتِ اویسیت سے متعلق لکھتے ہیں: کہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے حضرت بایزید بسطامی سے روحانی استفادہ کیا جس طرح کہ اویس قرنیؒ نے منبع انوارذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس سے اکتساب فیض کیا۔اسی طرح سلطان العارفین نے امام جعفر صادق کی روحِ پاک سے استفادہ کیا اور یہ بات جو مشہور ہے کہ سلطان العارفین امام موصوف کی خدمت اور صحبت میں رہے (یہ جسمانی صحبت نہیں ہے روحانی صحبت اور اخذ اکتساب ہے ) صحیح نہیں ہے۔

شیخ ابوعلی قارمدی نے خواجہ ابوالحسن خرقانی اور شیخ بایزید بسطامی سے جو اکتسابِ فیض کیا یہ روحانی طور پر ہے جسمانی طور پر نہیں۔ بے شک شیخ بایزید بسطامی کی وفات شیخ خرقانی کی ولادت سے عرصۂ دراز قبل ہو چکی اور شیخ بسطامی نے امام جعفر صادق سے جو اکتسابِ فیض کیا یہ بھی باطنی طریقہ پر ہے۔ ظاہری طریقہ پر نہیں۔ امام جعفر صادق کی وفات کے عرصۂ دراز کے بعد بایزید بسطامی کی ولادت ہوئی۔

## مثنوی جلال الدین رومی

همچناں آمد کہ اوفرمودہ بود ابوالحسن از مردمان اور اشنود

کہ حسن باشد مریدی زامنم درس گیر د ہر صباح از تربتم

گفت من ہم نیز خواہش دیدہ ام و زروانِ شیخ ایں بشنیدہ ام

ہر صباحی رونہادے سوی گور ایستادی تاضحیٰ اندر حضور

تا مثالِ شیخ پشیش آمد ی تا کہ نے گفتی شکالش حل شدی

تا یکی روزی بیامد با سعود گورہا را برف تو پوشیدہ بود

توی برتو برفہا ہم چون علم قبہ قبہ دید و جانش شد بغم

بانگش آمد از حفیرہ شیخ جی ہا انا ادعوک کی تسعی الیَّ

ہیں بیا این سوبر آوازم شتاب
عالم أر برف است رواز من متاب

حال اوزان روز شد خوب و پدید
آن عجائب را کہ اول می شنید

جیسے فرمایا تھا اس نے وہ!
ابو الحسن نے اس کو لوگوں سے سنا

کہ حسن ہو ایک مرید امت مرا
قبر سے مری پڑھے ہر صبح آ

ہر سحر آ کر اسبق مجھ سے پڑھے
ایک خدا کے اولیاؤں سے بنے

بولا امین خواب میں دیکھا اسے
اور سنایا میں نے روح شیخ سے

ہر سحر کے وقت جانا سوئے گور
چاشت تک رہتا کھڑا اندر حضور

تا مثالِ شیخ آئی سامنے
مشکلیں حل ہوتیں اس کے بے کہے

تا کہ ایک دن ابو الحسن آئے وہاں
برف میں تھیں تر بتیں جمعہ نہاں

برف کے تودے لگے مثلِ علم
قبہ قبہ دیکھ جان آئی بغم!

آئی آواز اس کو زندہ شیخ سے
ہاں انا اعودک تسع الی

ادھر آواز پر جلدی میرے
برف کا عالم ہے مجھ سے مت پھرے

حال ان کا خوب تب ظاہر ہوا
وہ عجائب جو کہ تھا پہلا سنا

### پیراہن یوسفی

''ہمعات'' کے مصنف مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے کلام کا خلاصہ نسبتِ اویسیہ سے متعلق یہ ہے:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص روح کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ وہ اس کے فضائل سنا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے اس کے دل میں ایک خاص الفت پیدا ہوتی ہے اور یہی محبت اس شخص اور اس روح کے درمیان ایک وسیع راہ ہموار کرنے کا سبب بن جاتی ہے یا اس واسطے کہ وہ روح اس شخص کے مرشد یا دادا کی ہوگی اور اس کے اندر اپنے مرید یا متبعین کی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کی ہمت جاگزیں ہوگی یا کسی جبلی دقیق

مناسبت کی وجہ سے۔ پس یہ شخص اس روح کو خواب میں دیکھتا ہے اور اس سے مستفیض ہوتا ہے۔ اس طرح اکتسابِ فیض کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ اس کو مشائخ صوفیاء کی تمام ارواح کے ساتھ یا بعض کے ساتھ عشق و محبت حاصل ہوے اور اس شخص کو فنا فی المشائخ کا مرتبہ حاصل ہو۔ تو ہر شخص میں ایک عجیب حالت اور عجیب واقعہ ظاہر ہوگا۔

اس لیے مشائخ کے اعراس کی حفاظت، اور ان کے قبور کی زیارت پر مواظبت اور مداومت اور ان کے لیے فاتحہ خوانی اور صدقہ و خیرات کی پابندی اور ان کی اولاد اور ان کے آثار اور ان سے منسوب افراد کی تعظیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اور اس نسبت کے ثمرات و برکات میں سے خواب میں اس جماعت کا دیدار کرنا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ہے اور شخصیتوں اور ہلاکتوں کے مواقع میں ان کی صورت کا ظاہر ہونا اور اس مشکل کا حل اس صورت کے ساتھ منسوب ہونا اور اس جیسے واقعات ہیں۔

جاننا چاہیے کہ صاحب نسبت اُویسیہ کو ان ارواح کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق پیدا ہوتا ہے جو خواب اور بیداری کے فرق کے بغیر اس شخص کی روح کے جوہر میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ شخص سو جاتا ہے تو ظاہری حواس اپنے مشاغل سے استراحت پاتے ہیں۔ فی الجملہ وہ شخص طبعی احکام سے خلاصی پالیتا ہے تو وہی صورت جو اس کے دل میں جاگزیں ہے کام کرنے لگ جاتی ہے۔ اور اس شخص کی توجہ اس صورت کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے تو اسی وقت عجیب عجیب چیزوں اور رنگ برنگ معاملات کا ظہور ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ نسبتِ اُویسیہ خواہ کسی بھی قسم کی ہو اس کے ثمرات و برکات بیداری اور خواب میں مختلف واقعات کا مشاہدہ ہی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ خواب میں صاحب نسبت اویسیہ کی عظمت و شرف کے دلائل کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں قبول بھی کر لیتے ہیں اور انہیں شدت و تنگی میں غیب سے مدد بھی حاصل ہوتی ہے اور غالباً صاحبِ

نسبت اویسیہ کو اپنی معاش میں تائیدِ غیبی بھی ملتی رہتی ہے اور وہ لوگ ظاہر میں کسی پیر کے مرید نہ ہو کر بھی طریقہ اویسیہ میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے اندر ایک کشش اور راحت پاتے ہیں۔اور غفلت کے عین ہجوم میں بھی ان سے کشش قلب ختم نہیں ہوتی۔غالبا اصحابِ نسبت اویسیہ ارواح کے ساتھ مناسبت سے خالی نہیں ہیں۔

وہ اس حقیقت کی تفصیل جانیں یا نہ جانیں اور جو بھی سرِ الٰہی اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے تو لامحالہ اس کے لیے ایک مخصوص جسم اور ایک خاص صورت ہوتی ہے۔اس عالم سے جو سر الٰہی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور اس اعتبار سے عالم الغیب کی توجہ اس شخص کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے اور اس ظہور مثالیہ کے ھیکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اور آپ کی امت میں سب سے پہلے شخص جنہوں نے جذب کی حقیقت کو پالیا اور اس منزل میں قدم رکھا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔اسی لیے طریقت کے سلاسل آپؓ ہی کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

اور امت کے اولیاء وصلحاء اور طریقت کے اصحاب میں سب سے زیادہ قوی ترین شخص جنہوں نے راہِ جذب یعنی توحیدِ ذاتی کی راہ کی تکمیل کے بعد بہت ہی قوی اسباب کے ذریعہ اس نسبتِ اویسیہ کی اصل کی طرف میلان کیا اور اس مقام میں اکمل اور اتم طریقہ کے ساتھ قدم رکھا، وہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہیں۔

اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیخ جیلانی اپنی مزار میں ایک زندہ شخص کی طرح تصرف فرما رہے ہیں اور اس فقیر کو آگاہی بخشی گئی ہے کہ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ توحید ذاتی کا راستہ طے کر لینے کے بعد صاحبِ نسبت اویسیہ کے خلاصے کے رنگ میں ڈوب کر رنگین ہو جائے۔

نیز ملّتِ مصطفویؐ میں خصوصاً اس زمانے میں کوئی بھی شخص ان دو بزرگوں سے

بڑھ کر خوارقِ عادت کی جہت سے مشہور تر نہیں ہے۔ اور یہ بات متقاضی ہے کہ اپنی طرف عالم غیب کی توجہ انہیں بزرگوں کی وجہ سے ملی ہے سمجھیں۔

حاصل کلام! یہ اسباب اس بات کے متقاضی ہیں کہ آج بھی اگر کسی شخص کو کسی بزرگ سے کوئی نسبت پیدا ہو جائے اور وہ اس سے فیض پالے تو غالباً یہ بعید نہیں ہے کہ یہ فیض امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی نسبت سے ہے یا حضرت غوث جیلانی کی نسبت سے۔

اور وہ اشخاص ان دو بزرگوں کے سوا باقی ارواح کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ ان ارواح کے ساتھ خصوصی مناسبت کا باعث رونما ہونے والے مختلف اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ صاحبِ نسبت ان بزرگ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور کثرت سے ان کی قبر پر آتا جاتا ہے اور یہ چیز صاحب نسبت کی طرف اس بزرگ کے ساتھ مناسبت کے لیے سلسلۂ خیال ہو جاتی ہے اور اس بزرگ کو دنیا ہی میں اپنے متبعین اور مریدین کی تعلیم و تربیت کرنے کی قوی ہمت و استعداد رہی ہے اور یہی ہمت ان کی روح میں باقی اور برقرار ہے اور یہی بات ان بزرگ کی طرف سے ان بزرگ کے ساتھ مناسبت کے لیے سلسلۂ جنبانی ہے۔

اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اویسی اجمالاً ارواح کا جاننے والا تو ہوتا ہے مگر اس کی نظر میں یہ مناسبت چند اسباب کی وجہ سے کسی خاص بزرگ کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔

اور جب یہ فقیر مشائخ صوفیاء کی ارواح کی جانب متوجہ ہوا تو ان کا اثر اپنے اندر چند طریقوں سے محسوس کیا ان میں سے ایک حیوانی قوتوں کا اضمحلال ہے۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس بزرگ کی روح کی مثال پانی سے بھرے ہوئے اس حوض کے مانند ہوتی ہے جس کے ظاہر و باطن کو نورِ آفتاب نے احاطہ کر لیا ہو اور پورا حوض شعاعوں میں تبدیل ہو گیا ہو ایسے ہی صاحب نسبت کا تصور اور اس کی توجہ عالم غیب کی جانب اس بزرگ کی روح میں ظاہر ہو کر اس کو تمام اطراف سے احاطہ کر لیتا ہے۔

ان کلمات کے ضمن میں یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ بزرگوں کے ارواح کی جانب توجہ کے اثر کا ظہور دو طرح سے ہوتا ہے۔

ایک قسم یہ ہے کہ صاحبِ نسبت مثلاً اپنی روح کو اس حقیقت کے ساتھ ملتصق کر دیتا ہے جو مسافتِ بعیدہ پر ان بزرگ کی قبر میں موجود ہے۔ اور وہاں اس کی روح پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور صاحبِ نسبت اس کیفیت میں غور و تامل کرتا ہے۔ اور واقعہ کی حقیقت کو پہچان کر لیتا ہے۔ اس شخص کی طرح جو آفتاب کے ارتفاع کو مقیاس کے سایے سے پہچان لیتا ہے یا کسی شخص کے چہرے کو آئینہ میں دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ صاحبِ نسبت بزرگ کی قبر پر حاضر ہوتا ہے اور اس پر صاحب قبر بزرگ کی کیفیت بالکل اسی طرح واضح ہو جاتی ہے جیسے کوئی شخص آنکھ کھولے تو اس کے مقابل میں جو کچھ ہے اس کو دیکھ لیتا ہے اس مثال میں چشم سے مراد چشمِ بصیرت ہے۔

صاحب ''ہمعات'' کا خلاصہ مکمل ہوا۔ انتہیٰ

فیض اور فتوح روحانی کی یہی وہ منزل ہے جس کے تعلق سے امام غزالی ''کیمیائے سعادت'' میں فرماتے ہیں:

کسی چیز پر قادر ہونے کے اعتبار سے انسانی دل کی شرافت و بزرگی یہ ہے کہ جیسے وہ بدن پر قدرت رکھتا ہے اور اس پر تصرف کرتا ہے ویسے ہی بعض دل جو بہت ہی شریف اور بہت ہی قوی ہوتے ہیں اور ملائکہ کی جو ہر طبیعت کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں تو دوسرے اجسام بھی جو ممکنات سے باہر ہوتے ہیں ان کے مطیع و فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اگر کسی شیر پر قابو کا ارادہ کریں تو شیر بھی انکا مطیع اور ماتحت ہو جائے گا۔ اور اگر کسی بیمار کے لیے صحت کا ارادہ کریں تو بھی شفایاب ہوگا اور کسی تندرست کے لیے بیماری کا ارادہ کریں تو وہ بیمار ہوگا اور اگر کسی شخص کے بارے میں خیال کریں کہ وہ ان کے پاس

آجائے تو اس شخص کی باطن میں حرکت ظاہر ہوگی اور کھنچا چلا آئے گا۔

اور اگر وہ بارش کا ارادہ کریں تو باراں کا نزول ہوگا۔ یہ ساری باتیں عقلی دلائل سے ممکن اور تجربہ سے معروف اور مشہور ہیں۔ اور یہ خاصیت جب کسی شخص کے اندر ظاہر ہوجائے اگر وہ خلق (نبی) ہوگا تو معجزہ کہیں گے اور اگر نہ ہوگا تو کرامت کہیں گے۔ اس موضوع پر امام موصوف نے بڑی بحث کی ہے۔ یہ مقام اس کے نقل کا متحمل نہیں۔

اسی موضوع سے متعلق یہ بات بھی ہے جس کو امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات کی دوسری فصل کے ۸۵ ویں مکتوب میں لکھتے ہیں:

اسی طرح حاجت منداشخاص زندہ اور رحلت کردہ بزرگوں سے خوف و ہلاکت کے مقاصد اور مسالک میں مدد طلب کرتے ہیں۔ اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کی مثالی صورتیں حاضر ہو کر ان بلیات اور مصائب کو دور کرتی ہیں۔ کبھی ان بزرگوں کو ان بلاؤں کو دفع کرنے کی اطلاع ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔

حقیقت میں اللہ ہی سارے امور کا وکیل ہے۔ ہمیں اور تمہیں صرف ایک سبب ٹھرایا ہے۔ یہ ان بزرگوں کا مثالی صورت میں تشکل ہے۔

یہ شکل وصورت ان بزرگوں کے لطائف اور صفات ہیں اور یہ تشکل کبھی عالم شہادت میں (یعنی بیداری میں) ہوتا ہے تو کبھی عالمِ مثال (یعنی عالمِ خواب) میں ہوتا ہے چنان چہ ایک شب میں ہزاروں بزرگان کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں متعدد صورتوں اور شکلوں میں دیکھتے ہیں اور آپ کی ذات اقدس سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ تمام آپؐ کے لطائف اور صفات کی شکل وصورت ہے جو مثالی صورتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح مریدین مرشدین کی مثالی صوتوں سے استفادہ کرتے ہیں اور مشکلات کا حل پاتے ہیں۔ انتہیٰ

نیز امام ربانی مذکورہ کتاب میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جنات کو جب قدر حاصل ہوتی ہے کہ وہ مختلف شکلوں اور صورتوں کو اختیار کرتے ہوئے عجیب وغریب اعمال اور افعال صادر کرتے ہیں تو اگر یہ قدرت وطاقت اولیاء اللہ اور کاملین کی ارواح کو عطا ہو جائے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے اور دوسرے بدن کی احتیاج کیا ہے کہ تناسخ لازم آجائے۔

جیسا کہ یہ حقیقت بھی اسی قبیل سے ہے کہ بعض اولیاء اللہ ایک آن اور ایک ہی وقت میں متعدد مقامات میں حاضر ہوتے ہیں اور ایسے دو مخالف افعال کو جو ایک دوسرے پر صادق نہ آسکیں وقوع میں لاتے ہیں۔ اس جگہ میں بھی ان بزرگوں کے لطائف اور صفات مختلف اجساد کے ساتھ جسم اختیار کر لیتے ہیں اور متبائن اشکال میں متشکل ہوتے ہیں۔ انتہی

یہ بات بھی اسی سے میل کھاتی ہے جو سید عبداللہ دہلوی المعروف شاہ غلام علی نقش بندی مجددی نے رسالہ ''سیر'' اور اپنے مرشد مرزا مظہر جان جاناں کے حالات میں صحبت کی تاثیرات کی فصل میں بیان فرمایا ہے

اللہ تعالیٰ حضرت موصوف ( مرزا مظہر جان جاناں ) کو نسبت باطنی کے القاء اور ارشاد میں کمال قوت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اپنی غائبانہ توجہات سے بھی دور دراز شہروں میں بسنے والے سالکینِ طریقت کو ترقیات سے بہرور فرماتے تھے اور جو حالات و کیفیات کہ حاضرین آپ کی پرنور مجلس میں پاتے تھے۔ ان ہی کیفیات وحالات کو دور دراز کے مریدین کو عطا فرماتے تھے۔ چناں چہ شاہ بھیک جو شیخ احمد سرہندی کے پوتے ( شیخ عبدالاحد کے نبیرہ ) ہیں دہلی سے حضرت کی غائبانہ توجہات کی بدولت کابل شہر میں مقامات عالیہ اور وارداتِ سامیہ پر پہنچ گئے اور اسی طرح دیگر عزیزین و مریدین بھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انتہی

مولانا سید عبداللہ دہلوی نے مذکورہ رسالہ کی بارہویں فصل میں بھی جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشکلات کا حل اور فیوض و برکات کا افاضہ پیر و مرشد کی صورت میں بیداری کی حالت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی اس بزرگ کے بعض لطائف اور صفات ان کی صورت میں متمثل ہوکر حاجتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس بزرگ کو اس معاملہ کی اطلاع بھی کبھی ہو جاتی ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

از ماو شما بہانہ بر ساختہ اند ودر حقیقت وکیل امور او تعالیٰ است

او بدلہامی نماید خویش را او بدوز د خرقہ در درویش را

ہماری اور تمہاری ذات کو تو صرف ایک ذریعہ بنائے ہوئے ہے ورنہ در حقیقت سارے کاموں کا وکیل اور کارساز اللہ تعالیٰ ہے۔

دلوں میں جلوہ گری بھی وہی کرتے ہیں اور درویش کی کارسازی بھی وہی۔ یعنی ظاہر و باطن میں انہیں کی جلوہ گری ہے۔

یہ بات بھی اسی حقیقت سے متعلق ہے جس کو مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے ''قول الجمیل'' مشائخ نقشبندیہ کے اشغال کی فصل میں بیان کیا ہے۔

جب مرید سے مرشد دور ہو تو مرید توجہ و استمداد کے جذبات کے ساتھ محبت اور تعظیم سے سرشار ہوکر اپنے مرشد کی صورت تخیل ہی تخیل میں اپنی نگاہوں کے سامنے لاتا ہے تو اس کی صورت کا تصور بھی وہی فائدہ دیتا ہے جو فائدہ کہ مرشد کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

مولانا خورم علی بلہوری ''شفاء العلیل'' میں لکھتے ہیں:

اور جب مرشد اس کے پاس نہ ہو تو اس کی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان خیال کرتا رہے بطریق محبت اور تعظیم کے تو اوس کی خیالی صورت وہ فائدہ دے گی جو

اوس کی صحبت میں فائدہ دیتی ہے۔ انتہیٰ

نیز شاہ صاحب مذکورہ فصل میں رقم طراز ہیں:

جب مرشد موجود نہ ہو تو مرید میں اس کی شکل وصورت کو طلبِ امداد کے جذبات کے ساتھ ذہن میں لاتے ہیں اور اس کی صورت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

مولانا خورم علی بلہوری ''شفاء العلیل'' میں فرماتے ہیں:

جب کہ طالب غائب ہو تو اس کی صورت کو خیال کرتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں غائب کو توجہ دیتی ہیں اوس کی صورت کو خیال کر کے۔ انتہیٰ

یہ بات بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے جس کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ''تفسیر عزیزیہ'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

خواص اولیاء میں سے بعض بزرگوں کو جو اپنے مریدین کی تعلیم وتربیت اور رشد و ہدایت کا مؤثر ذریعہ ٹھہرایا گیا ہے وہ موت کے بعد بھی دنیا میں تصرف کی طاقت سے نوازے ہیں اور ان ہی سے اویسی حضرات کمالاتِ باطنی کی تحصیل اور تکمیل کرتے ہیں اور پاتے ہیں۔ ان کی زبان حال اس مقال کی ترنم ہے۔

اگر تو تن کے ساتھ آئے تو میں جان کے ساتھ آؤں

یہ بات بھی وہی ہے جس کو مولانا شاہ عبدالعزیز نے نعیم الدین کے جوابات مطبوعہ ۱۲۳۷ھ میں تحریر کیا ہے کہ نماز عشاء کے بعد مدینۂ منورہ کی سمت متوجہ ہو کر جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارک کو ذہن میں مستحضر کرتے ہوئے ایک سو مرتبہ درود شریف جس صیغہ کے ساتھ ہی پڑھنا چاہیے۔ انتہیٰ

یہ بھی وہی حقیقت ہے جس کو مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''صراطِ مستقیم'' کے خاتمہ میں درج کیا ہے

شیخ ماجد سید احمد مجاہد نے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور سیدۃ النساء فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ بہاء الدین نقشبندی علیہ الرحمہ کی ارواحِ پاک سے مزارات پر حاضری کے بغیر دور ہی سے روحانی استفادہ حاصل کیا۔ (لہٰذا آپ اویسی ہیں)۔

اور حضرت غوث پاکؒ اور خواجہ نقش بندی سے طریقہ نقشبندیہ کا استفادہ کیا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی مرقد پر حاضری کے بغیر طریقۂ چشتیہ کا استفادہ کیا۔

حاصلِ کلام مرشد کے ساتھ قلبی و ذہنی ارتباط اور اس سے استمداد کی حقیقت ''جواہر السلوک'' کے ۲۳ ویں فائدہ میں ملاحظہ کیجئے۔ اُویسی حضرات کیا رزق کی وسعت، اولاد کا حصول، بارش کا نزول، عیش کی فراخی و فراوانی میں اور کیا خوف و ہلاکت کے مقامات اور مسالک میں اور کیا طبعیہ و بہیمیہ قوتوں کے اضمحلال میں اور عالم غیب کی جانب توجہ اور تصور، سبھی حالات میں بزرگوں کی ارواح سے مدد پاتے ہیں اور کبھی ان کو مدد ان کی مثالیہ صورتوں کے ذریعہ بھی حاصل ہوتی ہے لیکن کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ارادے اور مشیت کے بغیر ظہور میں نہیں آتی۔

علامہ قیصری ''فصوص الحکم'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ ان صورتوں کے ظہور کا ارادہ فرماتا ہے جن کی نوع اس عالم کے اندر صورتِ حسیہ میں موجود نہیں ہے۔ جیسے عقولِ مجردہ وغیرہ تو وہ صورتیں محسوسات کی شکل و صورت شئ متشکل کی استعداد کے مطابق اختیار کر لیتی ہیں۔ ان مناسبتوں کے ساتھ جو ان کے درمیان اور اشکالِ محسوسات کے درمیان ہوتی ہیں، مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں اور کبھی دوسری شکل میں ظاہر ہونا، جیسا کہ اسلام، ایمان اور احسان سے متعلق سوال کی حدیث سے ظاہر ہے۔ جس کو حضرت عمرؓ نے روایت کیا ہے۔

ویسا ہی ہے باقی ملائکہ سماویہ اور عنصریہ کا دوسری شکلوں میں متشکل ہونا اور جنات بھی دوسری شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ جنات کے لیے اجسامِ ناریہ ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ خلق الجان من مارج من نار

اور انسانیت کاملہ کے مالک نفوس قدسیہ بھی اپنی محسوس شکلوں کے سوا دوسری صورتوں میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اسی دنیا میں ہیں۔ اپنے اجسام سے باہر آنے کی قوت کی وجہ سے اور آخرت کی جانب انتقال کے بعد بھی وہ دوسری صورتوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس انسلاخی قوت کی زیادتی کے باعث اور جسمانی موانع کے مرتفع ہوجانے کی وجہ سے ان نفوسِ قدسیہ کو تمام عوالم ملکوتیہ میں دخل رہتا ہے جس طرح عالمِ دنیا کے اندر ملائکہ کا دخل رہتا ہے اور جس طرح ملائکہ اہلِ دنیا کی شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں اور انہیں یہ قوت اور طاقت بھی ہوتی ہے کہ وہ اہلِ کشف کے خیالات میں خواب اور بیداری کی حالت میں ظاہر ہوں۔ جیسا کہ ان کے خیالات میں ملائکہ اور جنات ظاہر ہوتے ہیں ان نفوس قدسیہ کو بدلاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انتہیٰ

نیز فص یوسفی کی شرح میں لکھتے ہیں:

جان لیجئے کہ مرئی کا ظہور اپنی اصلی صورت کے علاوہ کسی اور صورت میں یا اپنی ہی صورت میں کبھی اس کے اپنے ارادے سے ہوتا ہے۔ اور کبھی رائے کے ارادے سے ہوتا ہے اور کبھی رائی اور مرئی دونوں کے ارادے سے اور کبھی ان دونوں کے ارادے کے بغیر ہوتا ہے۔

پہلے کی مثال یعنی مرئی کے ارادے سے ظہور کی مثال انبیائے کرام میں سے کسی نبی کے پاس فرشتے کا مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ظاہر ہونا اور انسانوں میں سے انسانِ کامل کا بھی بعض صالحین پر غیر کی صورت میں ظاہر ہونا۔

دوسرے کی مثال یعنی رائی کے ارادے سے ظہور کی مثال: فرشتوں اورانسانوں کی ارواح میں سے کسی روح کا ظہور کسی انسانِ کامل متصرف کے، اس کو اپنے عالم میں بلانے کی وجہ سے ہو۔ تا کہ اس معنی کا انکشاف ہو جائے جس کا جاننا اس روح کی آمد کے ساتھ ساتھ مخصوص ہو۔

تیسرے کی مثال یعنی رائی اور مرئی دونوں کے ارادہ سے ظہور کی مثال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاہنے اور اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔

چوتھے کی مثال یعنی رائی اور مرئی دونوں کے ارادہ کے بغیر ظہور کی مثال: زید کا عمر کو خواب میں دیکھنا ہے جو دونوں کے ارادے کے بغیر ہو۔

حاصل تحریر! صورتِ مرئی کے ظہور کے لیے مرئی کے ارادہ اور اس کی اطلاع کی شرط نہیں جیسا کہ اس کی تفصیل ابھی بھی گزر چکی۔

## فائدہ نمبر ۳۵

# زندہ اور وفات یافتہ بزرگوں سے اربابِ حاجات کی ندا توسل

حصن حصین کے مصنف شیخ القراء والمحدثین ابوالخیر محمد الجزری فرماتے ہیں: من کانت له ضرورة فليتوضا فيحسن وضوء ه ثم يدعو اللهم انی اسالک واتوجه اليک نبيک محمد نبی الرحمه يا محمد انی ا توجه بک الی ربی فی حاجتی هذه لتقضی لی اللهم فشفعه فی (رواه الترمذی والنسائی وابن ماجه و حاكم)

جس شخص کو کوئی ضرورت اور حاجت پیش آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دعا پڑھے:

اے اللہ! میں تجھ سے تیرے نبی محمدؐ نبی رحمت کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں۔۔ یا محمدؐ! میں آپؐ کے وسیلہ سے اپنی حاجت کی تکمیل کے خاطر اپنے رب کی جانب متوجہ ہوں تا کہ وہ میری اس حاجت کو پورا کردے۔ اے اللہ! میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما۔

اس حدیث کو امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے روایت کی ہے۔ شیخ الہند شاہ عبدالحق دہلوی ''مشکوٰۃ'' کی شرح ''اشعۃ اللمعات'' کے باب جامع الدعا میں لکھتے ہیں:

عن عثمان بن حنيف قال ان رجلا ضرير البصر اتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال ادع الله ان يعافينى فقال ان شئت دعوت وان شئت صبرت فهو خير لك قال فادعه قال فامره ان يتوضآ فيحسن الوضوء و يدعو بهذا الدعاء۔

اللهم انى اسالك واتوجه اليك بنبيك محمد نبى الرحمة انى توجهت بك الى ربى ليقضى لى فى حاجتى هذه اللهم فشفعه فىّ

رواه الترمذى وقال هذا حديث حسن صحيح غريب

حضرت عثمانؓ بن حنیف نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ آپؓ کو صحابی ہونے کی نعمت حاصل ہے اور آپ اشراف انصار میں سے ہیں۔ اور آپ کا شمار اہلِ کوفہ میں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے عرض

کیا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میری بینائی لوٹ آئے۔آپؐ نے فرمایا: اگر تم بصارت ہی چاہتے ہو تو میں دعا کرتا ہوں لیکن اگر تم صبر کرو تو تمہارے لیے ثوابِ آخرت کے لحاظ سے بہتر ہے اس لیے کہ اس کا اجر و ثواب جنت ہے اور حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : جب میں اپنے بندہ کو دونوں آنکھوں سے محروم کر کے ابتلا و آزمائش میں ڈال دیتا ہوں اور وہ صبر کر لیتا ہے تو میں اس کا بدلہ جنت دوں گا۔

نابینا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپؐ دعا فرمایئے۔ میں عافیت چاہتا ہوں ۔۔ آپؐ نے اس کی یہ گزارش عدم صبر، اضطرار قلب اور اس اختیار کی وجہ سے تھا۔آپؐ نے اس کو آنکھوں کی روشنی اور ثواب آخرت کے درمیان دیا تھا۔اسی لیے آپؐ اس سے راضی نہیں ہوئے اور نفسِ شریف دعا کے لیے آمادہ نہ ہوا تو اسے بھی دعا کرنے کا حکم صادر فرمایا لیکن چوں کہ آپؐ نے اس کو مضطر اور بے قرار دیکھا تو اس کو یہ دعا بتلائی اور اپنی ذات کو قبولیت دعا کے لئے وسیلہ اور شفیع ٹھہرایا۔

چناں چہ حضرت عثمانؓ بن حنیف فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کرے اور اس دعا کے ساتھ دعا کرے۔ پس اس نے شرائط و آداب اور کمالیت کی رعایت کے ساتھ وضو کیا اور یہ دعا پڑھی: اللھم انی اسالک ....... الخ

اے خداوند! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری جانب تیرے پیغمبر کے توسل سے متوجہ ہوں جن کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو رحمت کے پیغامبر ہیں اور جن کو تو نے سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی میں سے ایک نام نبیِ رحمت ہے۔یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپؐ کے وسیلے سے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں متوجہ ہوں تا کہ آپؐ میری حاجت براری کے لیے دعا فرمایئے۔اے خداوند! میرے حق میں آپؐ کی شفاعت قبول فرما۔

بعض روایات میں صراحت کے ساتھ یا محمد انی توجهت بک الی ربی موجود ہے۔اور فی کی زیادتی ایسی ہی ہے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا واصلح لی فی ذریتی۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کی ہے اور اس کے متعلق یہ نوٹ درج کی ہے کہ یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے۔

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس کے آخر میں یہ عبارت نقل کی ہے:۔

فقام وقد ابصر۔ دعا کے بعد وہ شخص کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں میں بینائی آ چکی تھی

اور ایک روایت ہے: ففعل الرجل فبرأ: اس نے عمل کیا تو وہ شفایاب ہو گیا۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اربابِ حاجات کے امداد طلب کرنے اور آپ کا وسیلہ اختیار کرنے کے باب میں کثرت سے اخبار وارد ہے مثلاً وسعتِ رزق، حصولِ اولاد، نزولِ باراں، زندگی کی خوش حالی اور اسی طرح کی دیگر نعمتوں میں۔

مذکورہ حدیث میں وارد ندا اور توسل کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات سے ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس کی مثالیں پائی گئی ہیں۔ چناں چہ شاہ عبدالحقؒ دہلوی "جذب القلوب" کے پندرھویں باب میں لکھتے ہیں:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ کی ذاتِ گرامی سے توسل و استمداد اور توجہ کے آثار اور امثال وارد ہیں۔ امام طبرانی نے عثمانؓ بن حنیف سے "معجم کبیر" میں روایت کی ہے کہ ایک شخص کو حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس کوئی ضرورت تھی اور آپؓ اس کی طرف نظر التفات نہیں فرما رہے تھے۔ وہ شخص ابنِ حنیف کے پاس آیا اور اپنی حاجت بیان کی اور اس کی تدبیر کی صورت تلاش کیا تو آپؓ نے اس سے کہا: اچھی طرح کامل وضو کر کے مسجد میں جاؤ اور دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر یہ دعا کرو۔

اللھم انی اسالک واتوجہ الیک بنبینا محمد صلی اللہ علیہ

وسلم نبی الرحمة یا محمدؐ انی اتوجه بک الی ربی لتقضی حاجتی۔

وہ شخص مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کے در پر حاضر ہوا تو دربان سامنے آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عثمان غنیؓ کے پاس لے آیا اور آپ نے اس کو اپنی مخصوص مسند پر بٹھایا اور اس کی ضرورت پوچھی اور جو کچھ اس کی حاجت تھی پورا کر دیا اور فرمایا آئندہ تمہیں جو بھی ضرورت پیش آئے تو مجھ سے کہو، میں اس کو پورا کروں گا۔

وہ شخص حضرت عثمان غنیؓ کے پاس سے خوشی خوشی لوٹا اور ابنِ حنیف کے پاس آ کر کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے میری حاجت پوری کرنے کے بارے میں حضرت عثمان غنیؓ سے سفارش کی ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے میری جانب اس طرح التفات کیا کہ اس کے قبل کبھی انہوں نے میری جانب اس طرح توجہ نہ کی۔

ابنِ حنیف نے کہا: خدا کی قسم! میں نے تمہارے متعلق عثمان غنیؓ سے کچھ نہیں کہا۔ سوائے اس کے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپؐ کی خدمت میں ایک اندھا شخص آیا اور آپؐ سے دعا کی درخواست کی کہ اس کی بینائی لوٹ آجائے۔ اس حدیث کو مکمل بیان کرنے کے بعد ابنِ حنیفؓ نے کہا۔

میں نے اس حدیث سے قیاس کیا کہ دعا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لینا حاجتوں کی تکمیل کا ذریعہ اور مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کا سبب ہے۔ انتہیٰ

''دلائل الخیرات'' کے مصنف مولانا محمد بن سلیمان الجزولی نے چھٹے حزب میں ایک دعا نقل کی ہے (جس کو انہوں نے تین مرتبہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل موجود ہے)۔

اللھم انی اسالک واتوجه الیک بحبیبک المصطفیٰ عندك یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بک الی ربک فاشفع لنا عند المولیٰ العظیم

يا نعم الرسول الطاهر ثلثا اللهم شفعه بجاهه عندك ثلثا۔انتہیٰ

اے اللہ! میں تجھ سے تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور توسل سے طلب کرتا ہوں جو تیرے نزدیک مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہیں۔ یا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپؐ کے رب کے حضور میں آپ کا توسل لے رہے ہیں۔ آپؐ مولائے عظیم کی بارگاہ میں ہمارے لئے شفاعت فرمایئے۔ اے طیب وطاہر بہترین رسولؐ۔

اے اللہ! ہمارے حق میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم محترم کی شفاعت قبول فرما ان کے اس جاہ ورتبہ کا صدقہ، جو انہیں تیرے نزدیک حاصل ہے۔

''دلائل الخیرات'' کی شرح ''مطالع المسرات'' میں لکھتے ہیں:

حدیث نبویؐ کا لفظ گزر چکا ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یا محمد! کے ساتھ ندا موجود ہے۔ اور عثمان بن حنیف نے بھی اسی لفظ ندا کے ساتھ یہ دعا اس شخص کو بتلائی جو حاجت مند تھا پس جب اس کی حاجت پوری ہوئی تو اس شخص کے سامنے نابینا کا وہ مکمل واقعہ سنایا جو عہدِ رسالت میں پیش آیا تھا۔

جیسا کہ طبرانی نے کہا ہے۔ اس اثر میں دلیل ہے کہ اس قسم کے واقعات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ ندائے توسل درست ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی میں، سند المقربین، سید المحبوبین، شیخ الشیوخ العالم غوث الاعظم، امام ربانی سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

یا حبیب الله خذ بیدی ما لعجزی سواك مستندی

یا حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے سہارا دیجئے۔ میرے عجز و درماندگی کے لیے آپؐ کے سوا کوئی بھی ماوی اور ملجا نہیں ہے۔ اور انہیں دلائل کی روشنی میں شرف الدین محمد بن سعید بن حماد البوصیریؒ ''قصیدۂ بردہ'' میں لکھتے ہیں:

یاأکرم الخلق مالی من الوذ به　　　سواك عند حلول الهادث العمم

اے مخلوقات میں سب سے زیادہ برگزیدہ نبیؐ! میرے لیے آپؐ کے سوا کوئی ماوٰی اور ملجا نہیں ہے جو بڑے بڑے حوادث کے نزول کے وقت، جس میں میں پناہ لے سکوں۔

اور انہیں دلائل کی روشنی میں عبدالرحمٰن جامیؒ "یوسف زلیخا" میں فرماتے ہیں۔

ز مہجوری برآمد جانِ عالم　　　ترحم یا نبی اللہ ترحم

رحم کیجئے، رحم کیجئے یا نبیؐ اللہ! آپ کے فراق میں ایک عالم کی جان نکل رہی ہے۔

اور انہیں دلائل کی روشنی میں مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "قصیدہ ہمزیہ" کی چھٹی فصل میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

وآخر لما رحه اذ ما　　　احس العجز عن کنه الثناء

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف اور حقیقت مدح وثنا سے عاجز آدمی کے لیے آخری علاج یہ ہے کہ

ینادی ضارعاً بخضوع قلب　　　وذلّ وابتهال والتجاء

وہ خضوع قلب، عاجزی، ذلت وخواری، اخلاص والتجا کے ساتھ پکار اٹھے کہ

رسول الله یا خیر البرایا　　　نوالک ابتغی یوم القضاء

اے اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور بہترین رسولؐ! میں حشر کے روز آپؐ کی عطاو بخشش کا طلب گار ہوں۔

اذا ما حل خطب مدلهم　　　فانت الحصن من کل البلاء

جب مجھ پر مصائب وآفات ہجوم کر بیٹھیں تو اس وقت ہر بلا ومصیبت سے محفوظ رہنے کے لیے آپؐ ہی کی ذات جائے پناہ ہے۔

الیک توجهی وبک استنادی　　　وفیک مطامعی وبک ارتجائی

میں آپؐ ہی کی جانب متوجہ ہوں اور آپؐ ہی کی پناہ کا متلاشی ہوں اور آپؐ ہی کی

ذاتِ اقدسؐ میرے لیے حرص وطمع اور امید کا مرکز ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی میں ہے کہ طریقۂ قادریہ کے علماء اور عرفاء دو رکعت نماز حاجت پڑھنے کے بعد یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کے نام سے ندا وتوسل کرتے ہیں (اور یہ نداء توسل غیر انبیاء یعنی صحابہؓ، اولیاء کے بارے میں ہے جیسا کہ تمام صوفیاء اور بعض فقہاء کا مذہب ہے۔)

دلائل واسناد کے ساتھ دوگانۂ قادریہ کی تفصیل طوالت کی حامل ہے اس لیے مستقل طور پر یہ بحث اگلے فائدہ میں آرہی ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی میں ہے کہ طریقۂ قادریہ کے بعض حضرات ختم قادریہ کا عمل کرتے ہیں اور اس میں شیئاً للہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی پڑھتے ہیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس ختم قادریہ کو اپنی کتاب ''الانتباہ'' میں درج کیا ہے اور اس میں طریقۂ قادریہ کے بعض حضرات حاجات کی تکمیل اور مہمات کی تحصیل کے لیے ایک سو گیارہ مرتبہ شیئاً للہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی پڑھتے ہیں۔ اس کی حکایت بیان کی ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے ترجمۂ کتاب ''منہج السالک الی اشرف المسالک'' میں آدابِ ذکر کے بیان میں نقل کیا ہے:

چوتھی بات یہ ہے کہ ذکر شروع کرتے وقت دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان شیخ کی توجہ اور ہمت سے مدد طلب کرنا ہے جن سے ذکر کی اجازت حاصل ہے۔ اور اگر زبان سے مرشد کو پکاریں اور ان سے فریاد چاہیں تو بھی جائز ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہو۔

اس موضوع پر شاہ صاحب کا کلام بڑا طویل ہے جس کے نقل کے لیے یہ مقام متحمل نہیں۔ انہیں دلائل کی روشنی میں مولوی نعیم الدین مجددی (اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی

کے ) مرشد مرزا مظہر جاناں سے متعلق ''رسالہ معمولات مظہریہ'' مطبوعہ ۱۲۷۵ھ مطبع نظامی، کانپور میں لکھتے ہیں:

کسی بھی مرض اور کسی بھی درد کے واسطے تعویذ کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی کسی شخص کو تعویذ دینا چاہیں تو ان کلمات کو تحریر کر کے عنایت کرتے اور فرماتے کہ بازو گلے میں باندھ دیں۔ وہ کلمات یہ ہیں:۔

بسم الله الرحمن الرحيم ۔اعوذ بكلمات الله التامات كلها من شر ماخلق بسم الله الذى لا يضر مع اسمه شىء فيالارض ولا فى السماء وهو السميع العليم ولاحول ولا قوة الا بالله العلى العظيم وصلى الله على خير خلقه محمد و آله واصحابه اجمعين ۔یا حضرت مجدد اللہ آپ سے راضی ہو۔ اس تعویذ والے شخص کو آپ کی پناہ میں دے رہا ہوں۔

انہیں دلائل کی روشنی میں شیخ خیر الدین رملی نے بھی ''فتاوی خیریہ'' میں نقل کیا ہے کہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کے لفظ میں اختلاف ہے بعض علماء، کفر کے قائل ہیں اور بعض جواز کے قائل ہیں۔ یعنی جس طرح اس لفظ کے کفریہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اسی طرح اس کے جائز ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن یہ اختلاف شیئاً للہ کے کفریہ کلمہ ہونے میں ہے نہ کہ ندائے توسل میں، اور یہ بعض فقہاء کا قول ہے جیسا کہ '' درالمختار'' کے مصنف لکھتے ہیں۔ اسی طرح شیئاً للہ کہنے کو کفر کہا گیا ہے۔

اس مسئلہ میں طحطاوی لکھتے ہیں:

مصنف کا قول جو اس کلمہ کے کفریہ ہونے میں ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کلمہ کا ادا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز طلب کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے مستغنی اور بے پرواہ ہے اور ہر کوئی اس کا محتاج اور فقیر ہے۔ اس مسئلہ میں راجح قول ''عدم تکفیر

''کا ہونا چاہیے کیوں کہ اس کلمہ کے لیے تاویل موجود ہے۔ ممکن ہے کہ وہ یہ کہے کہ اس قول سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے مانگتا ہوں۔

جائز ہونے یا نہ ہونے کا اختلاف مطلقاً توسل میں تھا نہ کہ لفظ شیئاً للہ میں۔ اور یہ قول بہت سے فقہاء کا ہے جو انبیاء کرام کے علاوہ اہلِ قبور سے توسل کا انکار کرتے ہیں پس ان کے نزدیک اولیاء وصلحاء سے ندا کے ذریعہ توسل جائز نہیں ہے جیسا کہ یہ تفصیل سابقہ فائدہ میں گزر چکی ہے۔

اس لفظ میں علماء کا جو اختلاف ہے اس کی تفصیل ''تنبیہ الضالین'' کے مصنف نے بھی مطبوعہ ۷۷ ویں صفحہ میں ''فتاوٰی خیریہ'' سے نقل کیا ہے۔

انہیں دلائل کی روشنی میں مولانا محمد سعید اسلمی (مدراسی) بھی ''رزینہ حاشیہ سفینہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اس فاسد زمانے میں بعض شر پسند مفسدوں کے برانگیختہ کرنے اور بہکانے کی وجہ لوگوں میں سے ایک مذہب پیدا ہو گیا ہے جو یا رسول اللہ کہنے یا اور کسی بزرگ کو ندائے توسل سے مخاطب ہونے کو شرک کہتا ہے۔ انتہیٰ

ان دلائل اور شواہد سے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ اموات کے لیے ادراک و شعور اور احساس قوی دلائل شرعیہ اور احادیث نبویہؐ سے ثابت ہے جیسا کہ سابقہ فائدہ گزرا۔

''زادالاخرت'' کے مصنف بھی آٹھویں فصل کے تیرھویں باب میں شرح صدور مجدد قرنِ نہم حافظ احادیثِ نبویؐ شیخ جلال الدین سیوطی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

دنیا میں جو امور اور واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اموات بھی ان سب کا احساس اور ادراک مشیت الٰہی اور اطلاع الٰہی کے موافق کر لیتی ہیں۔ انہیں یہ ادراک و احساس کبھی فرشتوں کی اطلاع دینے سے حاصل ہوتا ہے تو کبھی دیگر اموات کی اطلاع دینے سے حاصل

ہوتا ہے جوان کے بعد ان سے جا ملتے ہیں اور کبھی دوسروں کی وساطت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطلاع سے دنیاوی امور پر آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ انتہیٰ

• شیخ عبد الوہاب شعرانی "عہود محمدیہ" میں فرماتے ہیں:

میں نے سید علی الخواص کو یہ فرماتے سنا جب تم اللہ تعالیٰ سے کسی ضرورت اور حاجت کی تکمیل کی دعا مانگو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے مانگو اور عرض کرو: اللھم انی اسالک بحق محمد صلی الله علیه وسلم: اے اللہ ہم تجھ سے بحق محمد مانگ رہے ہیں ۔تو ہماری دعا قبول فرما۔

اس فریاد کو اللہ تعالیٰ کا فرشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور آپؐ سے عرض کرتا ہے کہ فلاں شخص نے آپؐ کے توسل سے دعا کی ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی حاجت پوری ہونے کے لیے دعا فرماتے ہیں تو وہ مقبول ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔

سید علی الخواص فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو وسیلہ بنا کر اللہ سے تمہارے مانگنے میں بھی ویسی ہی بات ہے کہ فرشتہ اس دعا کو ان بزرگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہے تو یہ حضرات بھی اس حاجت کی تکمیل کے لیے شفیع بن کر اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں۔ واللہ علیم حکیم

اور اسی طرح اللھم فشفعہ فی: (خداوند! میرے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما) کی دلیل سے ندائے توسل میں متوسل کی حاجت کی تبلیغ ہے۔ کیوں کہ اس حدیث کو ترمذی، نسائی ،ابن ماجہ اور حاکم اور طبرانی نے روایت کی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل ابھی گزری۔ (ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ ہر تینوں صحاح ستہ میں داخل ہیں)

نیز یہ حقیقت بھی اس مقام پر جان لینی چاہئے کہ جو بھی شخص فنا فی اللہ باقی باللہ کے مرتبہ پر فائز بزرگوں کو پکارے تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب دینے والا ہوگا۔ شیخ اکبر ثانی، عبد الکریم

جیلی، انسانِ کامل کے تیرھویں باب میں تحریر فرماتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر اپنے اسماء میں سے کسی اسم کی تجلی ظاہر کردے تو بندہ اس اسم کے انوار کے تحت فنافی اللہ ہو جائے گا۔ پس جب تم اللہ تعالیٰ کو اس اسم سے ندا کرو تو آپ کو بندہ جواب دے گا کیوں کہ اس پر اس اسم کی تجلی واقع ہوئی ہے۔

اسماء کی تجلیات کا پہلا مشہد یہ ہے کہ اللہ اپنے اسم موجود سے اپنے بندہ پر تجلی فرمائے تو اسی اسم کا اطلاق بندے پر کیا جائے گا اور اسم موجود سے بھی تجلی الٰہی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ ہر اسم واحد میں تجلی فرمائے۔ اور اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ بندہ پر اپنے نام اللہ میں تجلی فرمائے۔

پس بندہ اس تجلی کے ذریعہ فنافی اللہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے وجود کا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بندہ کے طور پر حقیقت سے ندا کرے گا کہ انی انا اللہ (بے شک میں خدا ہوں)

اور اس مقام میں اللہ تعالیٰ بندہ کا نام محو کر کے اپنا نام ''اللہ'' اس کے لیے ثابت کر دے گا۔ پس جب تم یا اللہ کہو تو یہ بندہ تمہیں جواب دے گا لبیک وسعدیک اور جب بندہ اس مقام سے ترقی کر جائے اور اللہ تعالیٰ اس کو قوت عطا فرمائے اور اس کو فنا کے بعد بقا باللہ کی منزل پر فائز کر دے تو ایسے میں جو بھی شخص اس بندے کو پکارے گا تو اللہ اس کا جواب دے گا۔ مثلاً جب تم یا محمد کہو تو اللہ جواب دے گا لبیک وسعدیک۔

انسان کامل میں بیان کردہ یہی وہ مذکورہ حقیقت تھی جس کے باعث ''بہجۃ الاسرار'' کے مصنف اور دوسرے اکابر والا قدر نے سلطان الاولیاء اور غوث البرایا سے نقل کیا ہے۔ اذا سالتم الله فاسلونی : جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو تم مجھ سے طلب کرو۔ انتہیٰ

حاصل کلام:

زندہ اور رحلت شدہ بزرگوں کی ارواح یکمشت اور اپنی ذات سے عالم الغیب نہیں ہیں کہ ان کو یہ نداء پہنچائے بغیر ہی وہ اس سے مطلع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کا وسیلہ لینے والے کی مشکل حل ہونے کے واسطے دعا کریں۔

نیز ان بزرگوں کی ارواح قاضی الحاجات نہیں ہیں کہ صرف ان کو محتاج متوسل کی ندا پہنچتے ہی محتاج کی حاجت پوری کر دیں۔ مرادات کا پہنچانا اور حاجات کا پورا کرنا یہ دونوں باتیں عالم الغیب والشہادات کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہی قاضی الحاجات ہے۔ اور ہر چیز کلیۃً اس کے قبضۂ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واللہ خلقکم وما تعملون :اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو خالق کل شئی :اللہ ہر شئے کا خالق ہے، وربک یخلق ما یشآء ویختار :اور تمہارا رب جو چاہے پیدا کرتا ہے اور وہی مختار ہے۔

غرض ہر شئے اور ہر کام کا خالق یعنی اللہ تعالیٰ ہی مشکلات حل کرنے میں اور حاجات پوری کرنے میں قادر، مختار اور صاحبِ قدرت ہے۔

اس حقیقت کے باوجود اللہ تعالیٰ ندائے توسل کے وقت فرشتے کے ذریعہ یا فرشتے کی وساطت کے بغیر ہی بزرگوں کی ارواح پر وسیلہ لینے والے کی حاجت پہنچا دیتا ہے اور ان کی دعا سے حاجت پوری کرتا ہے۔

یا متوسل کی حاجت کو بزرگوں تک پہنچانے کے بعد کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر کے تکلیف دور کر دیتا ہے یا ان بزرگوں تک بغیر حاجت پہنچائے کہ کسی نہ کسی صورت کو پیدا کر کے حاجت پوری کرتا ہے۔ یا مطلق حاجت ہی پوری نہیں کرتا۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شر لکم واللہ یجعلکم وانتم لا تعلمون۔

ممکن ہے تم کسی امر کو ناپسندیدہ اور ناگوار خیال کرو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی امر کو مرغوب اور پسندیدہ خیال کرو اور وہ تمہارے حق میں شر ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔............☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر ۳۶

# دوگانۂ قادریہ

واضح ہو کہ دوگانۂ قادریہ شریعت کے منافی اور خلاف نہیں ہے اور یہ نماز قوی دلائل اور اسناد سے ثابت ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ؒ "اخبار اخیار" میں سلطان الاولیاء سید عبدالقادر جیلانی کے احوال میں رقم طراز ہیں:

شیخ جیلانی فرماتے ہیں جب تم اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگو تو میرے وسیلہ سے طلب کرو تا کہ تمہاری خواہش منظور ہو سکے۔

اور فرماتے ہیں جو شخص کسی مصیبت و تکلیف کے وقت مجھ سے استعانت طلب کرے تو اس سے وہ تکلیف دور ہو جائے گی اور جو شخص کسی شدت اور پریشانی میں میرے نام سے ندا کرے تو اس سے وہ پریشانی رفع ہو جائے گی۔ اور جو شخص کسی ضرورت و حاجت میں میرے وسیلہ سے اللہ کی بارگاہ میں دعا کرے تو اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔

اور فرماتے ہیں جو شخص دو رکعت نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے اور عراق کی جانب گیارہ قدم چلے اور میرے نام سے ندا کرے اور اپنی ضرورت و حاجت کو درگاہِ خداوندی سے طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی ضرورت و حاجت کو پوری کر دے گا۔ انتہیٰ

نیز شاہ صاحب "زاد المتقین" میں لکھتے ہیں:

دوگانہ جو "صلاۃ الاسراء" کے نام سے موسوم ہے اور اس سلسلۂ عالیہ میں متعارف اور مشہور ہے اس کے تعلق سے ایک مرتبہ بات اٹھی تو شیخ عبدالوہاب متقی نے فرمایا: ہمارے

مرشد شیخ علی متقی اس دوگانہ کوادا نہیں کرتے تھے اور شیخ محمد بکری جو اس سلسلۂ عالیہ سے منسلک اوروابستہ تھے، وہ بھی اس کے قائل نہ تھے۔ فقیر نے عرض کیا کہ اس کا ذکر ''بہجۃ الاسرار'' میں موجود ہے۔ پس مذکورہ کتاب طلب کی گئی تو فقیر نے اس کی نقل بتلائی۔ اس پر شیخ نے فرمایا: شاید ان بزرگوں تک یہ نقل اور سند نہیں پہنچی ہوگی۔

جامع علوم ظاہری و باطنی مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی نے دوگانۂ قادریہ کے منکرین کی تردید اور ان کے شکوک وشبہات کے ازالہ میں پہلے ہی ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور دوسروں کو جنبشِ قلم کی تکلیف سے بچالیا ہے۔ لہذا فقیر مذکورہ رسالہ سے من وعن یہاں نقل کررہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　حامداً و مصلیا و مسلما!

مشہور اکابر علمائے کرام اور اولیاء عظام جو اسلام کے ارکانِ شریعت کے اقطاب ہیں، یہ حضرات عالی مقام اس بات پر متفق ہیں کہ سید الاصفیاء امام العلماء سید ابو محمد محی الدین عبدالقادر حسنی حسینی جعفری جیلانی رضی اللہ عنہ، شریعتِ مطہرہ کے شعائر کی تنفیذ و اقامت میں اور کتاب وسنت کے احکام پر عمل کرانے میں اس قدر انہاک واشتغال اور مبالغہ فرماتے تھے کہ جس مرید سے بھی شریعت کی پیروی میں ذرا سی سستی اور غفلت دیکھتے تو اس کی اصلاح اور تادیب میں اس قدر توجہ اور ہمت سے کام لیتے تھے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کے مواعظ چالیس سال کے علوم وحقائق کے افادہ سے لبریز ہے اور آپ کے فتاوٰی اور درس پندرہ علوم کے افاضہ سے تیس سال جاری رہے۔

مفسرین، محدثین، فقہاء اور اصولیین میں مشاہیر اور برگزیدہ علمائے کرام جن میں کچھ حضرات امیر المؤمنین کے لقب سے سرفراز ہے اور جن میں سے بہت سارے حضرات

عمدہ اور لطیف تصانیف کے مصنف ہیں جن کی فہرست بڑی طویل ہے۔ یہ تمام شیخ جیلانی کے شاگرد و تلمیذ تھے۔

اور یہ بات مکمل ثقہ راویوں کی روایت کے ذریعہ متصل صحیح الاسناد سے ثابت ہے جب آپ کی قابل احترام شخصیت امام احمد بن حنبل کی زیارت کے لیے تشریف لے گئی تو امام عالی مقام مزار شریف سے باہر نکل آئے اور آپ کو خلعتِ نورانی پہنایا اور معانقہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں علم شریعت اور علم حقیقت میں آپ کا محتاج ہوں۔

یہاں ان باتوں کو بیان کرنے کا مقصد اور منشاء یہ ہے کہ جناب مقدس (حضرت غوث پاک) جو ظاہر اور باطن دونوں حیثیتوں سے شریعت مطہرہ کے حامی ہیں ان کے ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو رکعت نماز پڑھے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ اخلاص پڑھے اور سلام پھیرنے کے بعد درود شریف پڑھے اور بغداد کی سمت گیارہ قدم چلے اور میرے نام کا وسیلہ لیتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں اپنی ضرورت و حاجت بیان کرے تو بفضلہٖ تعالیٰ اس کی حاجت ضرور پوری ہوگی۔

حضرت غوث پاک کے اس ارشاد گرامی کو امام، حافظ، علامہ، عارف شیخ نور الدین شطنونی نے ''بہجۃ الاسرار'' میں اور شیخ، امام، فقیہ، محدث، عارف، جامع شیخ عبداللہ یافعی نے ''خلاصۃ المفاخر'' میں اور شیخ، امام حافظ علامہ مجد الدین شیرازی ''الروض الناظر'' میں اور شیخ، امام مقدام شیخ الاسلام شیخ محمد بن سعید زنجانی نے ''نزھۃ الخواطر'' میں اور شیخ، امام، حافظ، علامہ شیخ شہاب الدین قسطلانی نے ''الروض الزاھر'' میں اور شیخ امام عارف ربانی علامہ حقانی شیخ ابو بکر عبداللہ بن نصر نے ''انوار الناظر'' میں اور شیخ عارف بحر معارف سید عبدالقادر عیدروس نے ''الدر الفاخر'' میں اور ان کے علاوہ دیگر مشائخ اور علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

حاصلِ کلام!

یہ دوگانہ نماز اور عراق کی سمت گیارہ قدم چلنا دنیا جہاں کے علماء اور مشائخ کا مشہور عمل ہے اور آج تک اس مبارک عمل پر کسی نے بھی حرف گیری اور نکتہ چینی نہیں کی۔ان دنوں ایک مجہول الحال جاہل شخص کی طرف سے خلل وفساد سے بھرپور مراسلہ حاصل ہوا جس کی عبارت انتہائی رکیک وابتر اور اس کا معنی بہت ہی بے ہودہ اور بے مغز بلکہ کفر سے قریب تر ہے۔اسی لیے اس کی تردید ضروری سمجھی گئی تاکہ دوسرے جاہل اشخاص بھی اس قسم کی حرکت نہ کرسکیں۔

اولاً تو بندہ اس کی سراسر گمراہ کن عبارت لکھتا ہے پھر اس کے بعد اس کی تردید کرتا ہے مذکورہ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

غیر اللہ کی نذر اور عراق کی سمت چلنا کفر کے انواع میں سے ایک ہے۔(مدارج السالکین) نماز کے بعد عراق کی طرف چلنا کفر ہے۔اس بات کا قائل اور فاعل ایک عظیم حرمت میں گھرے ہوئے ہیں۔(شرح المناوی)۔مشائخ عظام پر منکرات کے افتراء اور تہمت میں سے ایک افتراء نماز کے بعد عراق کی سمت چلنا ہے۔یہ عمل کفر ہے اور قرآن پاک کی آیات سے مستنبط ہے۔(مدارج السالکین)

جو شخص بھی نماز کے بعد اس اعتقاد کے ساتھ چلے کہ یہ شیخ جیلانی کی زیارت ہے پس وہ کافر ہے اور اس کے کفر پر فتویٰ ہے (شرح المشارق) جو بھی شخص نماز کے بعد شیخ جیلانی کے لیے عراق کی جانب چلنے کو حلال سمجھے گا پس وہ کافر ہے۔(شرح مشیدی)

اس کی روایات ختم ہوئیں جو لغویات اور حشویات ہیں۔اس عبارت کے اندر جو خطا ورکاکت اور کند ذہنی وکم فہمی موجود ہے وہ اس درجے کی ہے کہ جو شخص بھی تھوڑی بہت طالب علمی سے متصف ہوگا وہ اس پر ہنس پڑے گا۔اور اس کے معنی میں اس کا بے ڈھنگا پن اور خطا

کاری اس سے بھی زیادہ ہے۔

النذر بغیر اللہ اس کا یہ قول بے مغز اور خطا پر مبنی ہے اور درست عبارت لغیر اللہ ہونا چاہئے۔ اور یہ عبارت اس مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا معنیٰ بہت ہی مہمل اور بے ہودہ ہوگیا۔ کیوں کہ اس دوگانہ میں شیخ جیلانیؒ سے توسل ہے اور غیر خدا کے واسطے ہرگز نذر نہیں ہے۔ پس اس جگہ میں یہ مضمون لے آنا محض بیکار اور باطل ہے اور اس کا یہ قول بھی کہ عراق کی سمت چند قدم چلنا انواع کفر میں سے ہے۔ انتہائی باطل ہے۔

مخفی نہ رہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اور آپؐ کے اصحابؓ اور آپؐ کے کامل تابعینؒ حضرات کا وسیلہ اختیار کرنا یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر تمام علماء اور مشائخ متفق ہیں اور یہ قرآن و حدیث کے بے شمار دلائل اور شواہد سے ثابت ہے۔

عراق کی سمت چند قدم چلنا شیخ الکل سے نزدیکی اور قرب اور ان سے توسل کی علامت ہے اور آں جناب بے نظیر کی جانب توجہ کی نشانی ہے اس عمل کی حقیقت محض تحصیل سعادت اور اکتسابِ قربت ہے۔ ایسے فعل کو جو ترکِ اولیٰ نہیں ہے کفر کہنا، کفر کی جانب سرعت کے ساتھ دوڑنا ہے۔ کیوں کہ علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو چیزیں ضروریاتِ دین میں سے ہوں تو ان کا انکار کفر ہے یا ایسی معصیت جس کا گناہ ہونا نص قطعی سے ثابت ہو تو اس کو حلال قرار دینا کفر ہے۔ ہاں! بعض غیر محقق فقہاء نے بہت سے کبائر کو کفر کہا ہے لیکن مذاہبِ اربعہ کے محقق فقہاء نے ان اقوال کی تردید کردی ہے اور ہم جس مسئلہ کو موضوع بحث بنائے ہوئے ہیں وہ وہ ترکِ اولیٰ میں بھی داخل نہیں تو پھر اس کے گناہ کبیرہ یا صغیرہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ایسی کتابیں جن میں اس قسم کی روایات درج ہوں وہ ضلالت کا سبب ہیں اور ایک عالم کو گم راہی میں جھونک دینے کا باعث ہیں۔ اور اس کتاب کا نام "مدارج السالکین" کے بجائے مدارج الھالکین زیادہ لائق اور مناسب ہے۔

ہزل وحشو سے لبریز ان کتابوں کے مؤلفین اوراس سراپا ضعیف عبارت کا لکھنے والا کیا صحیحین کی مشہور اور صحیح حدیث کو بھی نہیں جانتا۔؟ کیا اس کو کسی عالم سے بھی نہیں سنا ہے کہ ایک گناہ گار شخص ایک بزرگ عالم کی ملاقات کے عزم سے اس کے قریہ کی جانب چل پڑا اور اثناء راہ میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے نزدیک رحمت اور عذاب کے فرشتے آ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو حکم ملا کہ اس گناہ گار کے گھر سے اس کی موت کی جگہ تک پیمائش کی جائے اور اس جگہ سے اس عالم کے قریہ تک پیمائش کی جائے اگر وہ اپنے گھر سے قریب ہو تو عذاب کے فرشتے اٹھالے جائیں اور اگر وہ عالم کے قریہ سے قریب ہو تو رحمت کے فرشتے اٹھالے جائیں۔ چناں چہ جب فرشتوں نے ناپا تو عالم کے قریہ سے ایک بالشت نزدیک تھا اس لیے رحمت کے فرشتے اس کو اٹھالے گئے۔

اگر کوئی شخص مذکورہ نماز کا انکار کرے تو وہ اس آیت کی رو سے ابوجہل کا ساتھی متصور ہوگا کیوں کہ وہ بھی نماز کا مانع تھا۔ ارء یت الذی ینھی عبداً اذا صلیٰ: بھلا اس شخص کا حال تو بتلا جو ہمارے ایک خاص بندے کو منع کرتا ہے جب وہ بندہ نماز پڑھتا ہے۔

روایات کے ذریعہ نمازِ حاجت کا ثبوت ہے اور حدیث، فقہ، اور تصوف کی مستند اور معتبر کتابوں میں مرقوم ہے جن کی تعداد بڑی طویل ہے اس میں شک نہیں کہ مذکورہ دوگانہ نماز حاجت ہی ہے اور اس میں نمازِ حاجت کی نیت کی جاتی ہے۔ اس کے قطع نظر نفل نمازوں کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور یہ دوسری بات ہے کہ نفل کو کسی مقررہ وقت کے ساتھ قید کرنا بدعت ہے۔ لیکن اس جہت سے بھی دوگانہ قادریہ نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحب شمار ہوگی۔ احادیث میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی کوئی کام مغموم اور محزون کردیتا تو آپؐ جلدی سے نماز میں مشغول ہوجاتے۔ چناں چہ بعض محدثین کرام نے نوافل کو شمار کرتے ہوئے اس نماز کو صلوٰۃ الہم (نمازِ حزن) کہا ہے۔

اس غبی کا یہ قول کہ مشائخ عظام پر منکرات کے افتراء پر جو جرأت کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے۔ نماز کے بعد عراق کی سمت چلنا، اس فعل کا مرتکب کافر ہے اور نصوص قرآنیہ سے مستنبط ہے۔ (مدارج السالکین)

اس عبارت میں لفظ ما اجراھم بھی غلط ہے ما جرّاھم ہونا چاہیے اور لفظ مشائخ میں الف لام ہونا چاہئے۔ اور کلمہ صلوٰۃ میں الف غلط ہے۔ اور الاستنباط من نصوص القرآن کا جملہ مہمل ہے اور یہ مشہور حدیث خود اس کی تکفیر کا سبب بنتی ہے۔ من قرا القرآن برایه فقد کفر جس نے اپنی رائے اور عقل سے قرآن کی تفسیر کی تو اس نے کفر کیا۔

حاصل کلام!

ان روایت کی لغویات اور حشویات کی کوئی حد نہیں ہے اس قسم کے جہلاء کو یہ حق کہاں سے ملا ہے کہ گمراہی سے بھرپور یہ اقوال کے اظہار سے عوام کو گمراہی میں ڈال دیں۔

خیالاتِ ناداں خلوت نشین　　　　بہم برکند عاقبت کفر و دین

خلوت نشین نادان کے خیالات، آخر کار دین اور کفر کو گڈمڈ کر دیں گے۔

ان کو چاہیے کہ اس قسم کے فاسد خیال سے باز آجائیں اور خود کو دنیا والوں کے سامنے مضحکہ خیز نہ ٹھہرائیں۔ والسلام علی من اتبع الھدی وصلی اللہ علی سید الوری و آلہ وصحبہ اھل المجد والعلیٰ۔ انتھیٰ

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ ۳۷

# نداء اور دعا کے درمیان فرق

مولانا سید علوی شافعی تریمی ''مصباح الانام'' کی تیسری فصل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

نجدی وہابی کی خرافات اور بے ہودہ باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس مشہور قصیدہ بردہ کے مصنف شاعر العلماء، عالم الشعراء علامہ امام بوصیری کے فکر و خیال کا انکار کیا ہے جو انہوں نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

یااکرم الخلق نالی الوذ به　　　　سواك عند حلول الحادث العمم

اے تمام مخلوق میں سب سے زیادہ برگزیدہ و بزرگ! میرے لیے آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی پناہ میں لوں، بڑے حوادث کے نزول کے وقت۔

بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ شرک اکبر ہے۔ کیوں کہ غیر اللہ سے دعا ہے اور یہ مغالطہ عوام کے ذہنوں میں بٹھا دیا ہے لیکن اس کا یہ کہنا کہ یہ دعا ہے۔ یہ قول کذب اور افتراء پر مبنی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دعا نہیں بلکہ نداء ہے۔ اور ندا دعا سے علاحدہ ایک دوسری شئے ہے اس لیے کہ جب مخلوق سے کوئی چیز طلب کی جائے تو اس کو شریعت مطہرہ میں اور مسلمانوں کے عرف میں دعا نہیں کہتے۔ جیسا کہ اس کو محدث زین العابدین عراقی شافعی اور علامہ ابن رشد مالکی اور شیخ الاسلام زکریا انصاری اور دیگر مشہور ائمہ کرام نے دلیل پیش کی ہے۔

ندا کو دعا کا روپ دینے سے نجدی کا مقصد اور منشاء بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عوام میں ندا کو دعا کے نام سے شہرت دی جائے اور اس کے تعلق سے لوگوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات داخل کیے جائیں تا کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء و مرسلین کا توسل

اختیار نہ کریں۔

اس مقام پر یہ حقیقت جان لینی چاہئے کہ دعا عبادت کا مغز اور اس کا لب لباب ہے۔اور دعا حضور رفیع الدرجات کے حضور میں منت وسماجت اور تضرع کے ساتھ گڑگڑ کر حاجات وضروریات پوری ہونے کے لیے فریاد کرنا ہے۔اس قسم کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوسکتا۔اور آپ ہرگز ایک مسلمان کو اس جیسے انسان کے سامنے تضرع اور آہ وبکا کے ساتھ دعا کے لیے اپنے ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے نہیں پائیں گے اور نہ آپ کسی ایسے مسلمان کو پائیں گے جو کسی انسان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ اس کی مغفرت کرے گا اور اس پر رحم کرے گا اور اس کی ضروریات وحاجات کو پوری کرے گا۔

بلکہ یہ تمام چیزیں یعنی دعا، حاجات کی تکمیل، مغفرت اور رحم وکرم اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کے ساتھ خاص ہے۔ایک مسلمان کا مقصد نداء سے صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب اس کے انبیاء اور مرسلین سے ان کے اسماء کے ساتھ توسل اختیار کرے اور نداء، دعا سے علاحدہ دوسری شئے ہے اور دعا نداء سے علاحدہ دوسری چیز اور عبادت ہے۔

اسی لیے اقناع میں مرقوم ہے کہ حنبلی فقہاء نے کہا کہ جو شخص اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسائط اور وسائل ٹھہرائے اور ان وسائل سے دعا کرے اور ان کے اوپر توکل کرے اور ان سے سوال کرے تو کافر ہو جائے گا اور اس پر سارے علماء کا اجماع ہے۔

حرمین شریف کے مفتی علامہ عبدالوہاب مصری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک یہ آدمی اپنے اور اللہ کے درمیان وسائط اور وسائل ٹھہرا رہا ہے اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ اللہ کے سوا معبود ہیں اور ان کی طرف اپنے امور ومعاملات سونپ رہا ہے کہ وہ عطا کرنے والے ہیں اور قدرت والے ہیں۔

اور یہ بات معلوم اور مشہور ہے کہ مسلمانوں میں ایک مسلمان بھی خواہ وہ عامی ہو یا

عالم ایسا نہیں ہے جو اس قسم کے عقائد وافکار اپنے دل ودماغ میں رکھتا ہو۔

میرا استدلال یہ ہے کہ اسی سبب سے اقناع کے مصنف اور ان کے علاوہ دیگر فقہاء نے یہ نہیں کہا کہ جو شخص بھی اپنے اور خدا کے درمیان وسائل اور وسائط ٹھہرائے اور بارگاہِ خداوندی میں ان سے نداء کرے اور ان کا توسل اختیار کرے بلکہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ جو شخص بھی اپنے اور خدا کے درمیان وسائل اور وسائط ٹھرائے اور ان سے دعا کرے اور ان پر توکل کرے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ دعا اور توکل یہ دونوں عبادت ہے۔ پس جو شخص بھی عبادت کو معبود (اللہ تعالیٰ) سے پھیر کر مخلوق کی طرف قائم کردے تو وہ یقیناً کافر ہے۔ اس لیے کہ اس نے اللہ کے ساتھ ایک دوسرا الٰہ قرار دیا اور اس سے دعا کی اور اس پر توکل واعتماد کیا۔ ہر ذی عقل اور صاحبِ فہم کو یہ بات معلوم ہے کہ غیر اللہ کے لیے نداء جائز ہے۔ پس نداء کفر نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ عبادت کے سواء ایک علاحدہ شئے ہے اور اگر نداء عبادت ہو جائے تو ہر شخص کافر ہو جائے گا جو غیر اللہ کو نداء کرے اور یہ بات کوئی نہیں کہے گا۔ بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نابینا شخص کو اچھی طرح وضو کرنے کے بعد یہ مشہور دعا پڑھنے کا حکم دیا جس کے اندر نداء موجود ہے۔ یا محمد! انی اتوجه بک الی ربک فی حاجتی لتقضی! یا محمد! بے شک میں اپنی حاجت براری کے لیے آپؐ کے وسیلے سے آپؐ کے رب کی جانب متوجہ ہوں تا کہ میری حاجت پوری ہو جائے۔

پس! آپ ہی غور فرمایئے کہ نداء اگر شرک اکبر ہے تو پھر کیوں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسم مبارک کے ساتھ نداء کا حکم دیا یا محمد انی اتوجه بک۔

اور ایک دوسری صحیح حدیث ہے کہ لوگ قیامت کے دن انبیاء ومرسلین سے ہر نبی کے نام کے ساتھ ندا کرتے ہوئے ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے اور ان سے پناہ

طلب کریں گے۔

اور ایک حدیث میں وارد ہے کہ جب تم میں سے کسی شخص کا جانور کسی کی زمین میں قابو سے نکل جائے تو چاہئے کہ تین مرتبہ نداء دے: یا عباد اللہ اجسواء: اے اللہ کے بندو اس کو پکڑ لو۔ پھر ارشاد فرمایا فان للّٰہ فی الارض حاضرا یحبسھا بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض حاضرین بھی ہیں جو اس کو پکڑ لیتے ہیں۔

اور دوسری حدیث میں ہے جب تم مدد کے طالب ہو تو تین مرتبہ کہو: یا عباد اللہ اعینونی :اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔

پس نداء اگر عبادت ہوتی جیسا کہ بے علم افراد نے زعم کیا ہے تو نابینا شخص کو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نداء کرنے کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ حدیث ابھی گزری ہے۔ اور نہ ہی جانور کے مالک کو حکم دیا جاتا کہ وہ کہے یا عباد اللہ احبسوا اے اللہ کے بندو! اس کو روک لو۔ اور نہ ہی مدد کے متلاشی کو حکم دیا جاتا کہ وہ یہ کہے: یا عباداللہ اعینونی !اے اللہ کے بندو! میری اعانت کرو۔ اور نہ ہی یہ خبر دی جاتی کہ لوگ قیامت کے دن انبیاء کرام کو اُن کے ناموں کے ساتھ نداء دیتے ہوئے اُن سے شفاعت کے طلب گار ہوں گے۔

مذکورہ دلائل اور براہین سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بے شک نداء، دعا نہیں ہے۔ اور ہم نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ''معرفۃ الاللہ بین المسلمین'' کی پہلی فصل کے خاتمہ میں بیان کردی ہے۔ لہذا اس کی جانب رجوع فرمایئے تاکہ آپ غلطی میں مبتلا نہ ہوسکیں۔

اور جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان الذین تدعون من دون اللہ عبد امثالکم : بے شک وہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو وہ بھی تمہاری طرح بندے ہیں اور فلا تدعوا مع اللہ احداً ۔پس اللہ کے ساتھ کسی کی بندگی نہ کرو اور اس جیسی دیگر قرآنی

آیات میں کفار سے خطاب ہے، مسلمانوں سے نہیں۔ کیوں کہ مسلمانوں نے نص قرآنی سے پہچان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک وسہیم محال اور ممتنع ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو پکاریں گے اور انہوں نے یہ حقیقت حق و درستگی کے ساتھ جان لی ہے کہ معبود ایک ہی ہے اور اس کا ثانی اور اس کا ساجھی محال ہے اور معبودِ باطل کو الٰہ سے موسوم نہیں کرتے ہیں کیوں کہ وہ عبادت کا مستحق ہو ہی نہیں سکتا۔ پس معبود حق ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ اور کوئی دوسرا معبود نہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلی فصل میں گزر چکی۔ آپ اس کی جانب رجوع کریں تو انشاء اللہ ہدایت پائیں گے۔

نجدی کا یہ کہنا ہے کہ جس کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے علاوہ دیگر انبیاء اور اولیاء اللہ کو نداء دی تو یہ بھی اس شخص کے مانند اور مشابہ ہو گیا جس نے اصنام کو نداء دی یا اس شخص کے مانند و مشابہ ہو گیا جس نے عیسیٰؑ، عزیزؑ اور فرشتوں کو نداء دی۔

اس کے اس قول کا فاسد ہونا مخفی نہیں ہے کیوں کہ اصنام، اہلِ شفاعت نہیں ہیں اور عیسیٰؑ اور عزیزؑ کے بارے میں اللہ نے کفار کے مقولہ کی خبر دی ہے، ارشاد خداوندی ہے

وقالت اليهود عزيز ابن الله وقالت النصارى مسيح ابن الله ذلك قولهم بافواههم اور یہودیوں نے کہا کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ساری باتیں وہ اپنے منہ سے بکتے ہیں۔ (یعنے ان کی کوئی اصلیت اور حقیقت نہیں ہے)۔ اور فرشتوں کے بارے میں قبیلہ خزاعہ اور کنانہ اور ان کے علاوہ کفار مکہ نے کہا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان ساری باتوں سے پاک وصاف اور بلند و بالا ہے۔ الحمد للہ! مسلمانوں کا دامن اس قسم کے عقائد سے پاک وصاف ہے۔

پس! اگر کتاب وسنت میں ایسی بات آئی ہو کہ اگر کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے اور اس کے انبیاء اور مرسلین اور ان کی ربانی تعلیمات کی تصدیق کرے اور وہ نبی یا ولی کو شفاعت

کے لیے نداء کرے تو وہ صرف نداء سے کافر ہو جائے گا۔

اس قسم کی بات کہیں ہو تو بیان کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔ اور یقین ہے کہ ہرگز تم اس طرح کی کوئی بات قرآن وحدیث میں نہیں پائیں گے۔ والحمدللہ رب العالمین۔

نیز مولانا سید علوی شافعی تریمی ''مصباح الانام'' کی چوتھی فصل میں لکھتے ہیں کہ نجدی کے خرافات اور ھفوات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے توسل، استغاثہ اور بزرگوں کے نام سے نداء اور صلحاء واخیار اور اولیاء اللہ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تحصیل تبرک کا انکار کیا ہے۔

شیخ محمد حیات مدنی فرماتے ہیں:

اعمالِ حسنہ سے توسل اور صلحاء واخیار سے دعا کی درخواست جائز ہے چناں چہ علامہ ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں اس کے جواز پر دلیل پیش کی ہے اور اموات کے توسل کے مسئلہ میں علامہ ابنِ تیمیہ نے زعم کیا ہے کہ یہ ممنوع ہے۔ لیکن بعض صحابۂ کرامؓ کے عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بعض محتاجوں کو بعض صحابہؓ نے حکم دیا کہ وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لیں۔ پس! حاجت مند شخص نے ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کی تو اس کی ضرورت پوری ہوگئی۔ جیسا کہ امام طبرانی نے ذکر کیا ہے۔

اور عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جب عمل صالح سے توسل جائز ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش نود ہوتا ہے، اس عمل کے جاہ ومرتبہ کے باعث جو اس کے نزدیک ہے تو نبوت ورسالت سے بھی توسل جائز ہونا چاہئے۔ اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت وعظمت تو وہ ہے جس کے لیے اللہ کے نزدیک عظیم شرف وعزت حاصل ہے۔ جس

میں کسی کا اختلاف نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لیتا ہے تو وہ صرف آپ کی ذات سے توسل کا ارادہ نہیں کرتا جس میں نوع انسان شریک ہے بلکہ وہ آپ کی ذات قدسی صفات کے ساتھ ساتھ آپ کی نبوت و رسالت کا ارادہ کرتا ہے جو نبوت کے سارے کمالات پر فوقیت رکھتی ہے۔

لہذا اس بات کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یا آپ کی نبوت سے توسل اختیار کریں اور علامہ ابن تیمیہ نے جو فرق بیان کیا ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اور حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ توسلوا بجاهی فانه عندا لله عظیم ۔میری نبوت کے واسطے سے توسل اختیار کرو۔ بے شک یہ مقام اللہ کے نزدیک بہت ہی عظیم اور بلند و بالا ہے۔اور کتاب ''نہج السعادۃ'' میں مرقوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا توسلوا بی وباهل بیتی الی الله لا یرد متوسل بنا ،بارگاہِ خداوندی میں میرا اور میرے اہلِ بیت کا وسیلہ لو۔ بیشک جو بھی ہمارے وسیلہ لینے والا ہے اس کی دعا رد نہ ہوگی۔اور ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل ثابت ہے۔اور ان کی توبہ اسی وقت قبول ہوئی جب کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لیا، اس حدیث کو محدث ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔واللہ اعلم

علامہ ابن حجر کی کتاب ''الجوہرا لمنظم'' کے حوالہ سے شیخ محمد حیات مدنی کا کلام مکمل ہوا:

نیز مولانا سید علوی شافعی تیمی مذکورہ فصل میں رقم طراز ہیں:

قاضی عیاض شافعی فرماتے ہیں کہ شفاعت کی حدیث میں ہے: اذا سالتنی بحقه

فقد غفرت لک :جب تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے مانگو تو میں تمہاری مغفرت کروں گا۔

اور نماز حاجت میں ہے:اللھم انی اسالک واتوجه الیک بنبیک محمد صلی الله علیه وسلم نبیٔ الرحمة یا محمد انی ا توجه بک الی ربی فی حاجتی هذه لتقضی له:
اس حدیث کوامام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

اور حدیث الاعمیٰ میں ہے کہ نابینا کو اس دعا کے ساتھ ندا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور یہ فقرہ زائد بھی درج کیا ہے۔ فقام و قد ابصر . پس نابینا جب کھڑا ہو گیا تو اس کی آنکھوں میں روشنی آ چکی تھی۔

اور اس حدیث سے یہ ثبوت فراہم ہو رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد بھی توسل صحیح ہے۔ علاوہ ازیں اس دعا کو حضرات سلف نے اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد استعمال کیا ہے۔ اور اس کے راوی حضرت عثمان بن حنیفؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک آدمی کو یہ دعا سکھلائی۔ اس نے اس پر عمل کیا تو اس کی ضرورت پوری ہوی۔ اس حدیث کو امام طبرانی اور امام بیہقی نے روایت کی ہے۔

امام طبرانی نے قوی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا:بحق نبیک والانبیاء الذین من قبلی :اے اللہ تیرے نبیؐ (محمدؐ) کے وسیلہ سے اور ان انبیاء کے وسیلہ سے جو مجھ سے پہلے گذر چکے ہیں۔ (نبیک کے لفظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں توسل کا ثبوت ہے تو الانبیاء الذین من قبلی کے جملہ سے آپؐ کے وفات کے بعد توسل کا ثبوت ہے۔ مترجم)

علامہ ابن حجر نے ''الجوہر المنظم'' میں بڑی طویل بحث کی ہے وہ دیکھ لی جائے۔

مہمات ومسائل اور امور عظیمہ میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے نداء کرنے کے مسئلہ میں نجدی کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ ندا، دعا ہے اور دعا عبادت کا جوہر اور اس کا خلاصہ ہے۔ یہ طرزِ فکر اس کے علم ومعرفت میں قلت وکمی کے سبب سے ہے۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری اور علامہ زین الدین عراقی شافعی اور امام ابن رشید مالکی نے اس مسئلہ کی عمدہ وضاحت کردی ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں بیان کیا گیا ہے تاہم اس کا مختصر خلاصہ چند لفظوں میں ہے کہ:

جب تم کسی زندہ یا مردہ شخص کو آواز دو تو اس کو نداء کہا جائے گا اور جب تم اپنے رب تعالیٰ کو نداء دو تو اس کو دعا کہا جائے گا۔ لہذا یا اللہ، یا ولی اللہ، یا مخلوق میں سے کسی کو یا فلاں کہہ کر نداء دو تو ان کے درمیان فرق اور امتیاز ہے اور اس کو حضرات علماء نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے: یا عباد الله اعینونی اور دوسری روایت میں اعیونی وارد ہے۔

اور ہم نے پوری شرح وبسط کے ساتھ اپنی کتاب ''السیف الباتر'' میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب اور اس موضوع پر دوسری کتابیں مطالعہ کریں۔ اور امام علامہ عارف باللہ سید عبداللہ بن ابراہیم میرغنی ساکن طائف نے بھی اس مسئلہ پر ''**تحریص الاغبیاء علی الاستغاثۃ بالانبیاء والاولیاء**'' کے نام سے بڑی انوکھی تالیف تحریر کی ہے۔ انتہی

اس فصل میں اور دوسری فصلوں میں مسئلہ نداء اور اس کی اسناد سے متعلق مذکورہ مصنف کی بڑی عمدہ بحث موجود ہے۔ لیکن ان کی تفصیلات کا یہ محل نہیں۔

حاصل کلام!

ان دلائل و براہین کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ دونوں جماعتوں کے بعض لوگ نداء غائب کے مسئلہ میں مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا باقر آگاہ مدراسی اور دیگر بزرگانِ دین عالی قدر پر جولعن طعن کررہے ہیں۔ یہ سب بے اصل ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

## فائدہ نمبر (۳۸)

# وحدۃ الوجود

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ وحدۃ الوجود حق اور واقع کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اس کے ثبوت میں دلائلِ عقلیہ اور نقلیہ موجود ہیں۔ جیسا کہ یہ مسئلہ شیخ علی مہائی گجراتی کی کتاب ''**ادلة التوحيد**'' میں شرح وبسط کے ساتھ موجود ہے۔ انتہی۔

صوفیاء نے عالم کو حق تعالیٰ کا جو عین کہا ہے، اس قول سے جمیع وجوہ کے ساتھ عینیت مراد نہیں ہے بلکہ عالم ایک وجہ سے حق تعالیٰ کا عین ہے تو ایک وجہ سے حق تعالیٰ کا غیر ہے، جیسا کہ زید جو نوعِ انسان کا ایک فرد ہے حقیقت کے اعتبار سے نوع کا عین ہے اور تعیّن کے اعتبار سے غیر ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی ''الطاف القدس'' میں فرماتے ہیں۔

''ظہور'' ظاہر اور مظہر کے درمیان ایک نسبت ہے اور اس نسبت کا حکم دوسری تمام نسبتوں کے حکم کا غیر ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر جمیع اعتبار سے مظہر کا عین نہیں ہے اور جمیع کے اعتبار سے مظہر کا غیر بھی نہیں ہے۔ مانند نوعِ انسان بہ نسبت افرادِ انسان۔

اگر نوع (حیوان ناطق) جمیع وجوہ کے ساتھ اس فرد (مثلاً زید) کا عین ہوتا تو یہ فرد (مثلاً زید) دوسرے فرد (مثلاً عمر) پر محمول ہونا چاہئے۔ جیسا کہ نوع یعنی حیوانِ ناطق زید وعمر پر محمول ہوتا اور اگر جمیع وجوہ کے ساتھ اس فرد کا غیر ہوتا تو (مثلاً زید انسان ہے) **ھذا انسان** صحیح نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ **ھذا حجر** (زید حجر ہے) صحیح نہیں ہے۔

نوع انسان ونوع فرس، حیوان کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور حیوان وشجر، نامی کی طرف نسبت کرتے ہوے اور نامی وجماد جسم کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور جسم ومجرد، جوہر کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور جوہر وعرض، وجود عام کی طرف نسبت کرتے ہوئے یہی کیفیت رکھتے ہیں۔ (یعنی **من کل الوجوہ** عین بھی نہیں غیر بھی نہیں) لہٰذا یہ امر بدیہی ہے کہ ان مقامات میں ایک دوسرے پر محمول ہونے کا مصداق اور ایک دوسرے کے مغایر ہونے کا مصداق دونوں پائے جاتے ہیں۔ اور اس صورت میں دونوں قبیل کے احکام کی گنجائش ہوتی ہے۔ ناقص عقلیں کبھی ان (مصداق حمل وتغایر) کو جمیع وجوہ کے ساتھ عین شئے کی قبیل سے قرار دیتی ہیں جیسے ملاحدہ۔

اور جب عینیت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو اس عقیدہ کی تنقیض کر دیتی ہیں اور کبھی ان کو جمیع وجوہ سے غیر شئی کی قبیل سے قرار دیتی ہیں۔ جیسے اکثر متکلمین اور جب غیریت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو متحیر ہو جاتی ہیں۔

عقول سلیمہ جانتی ہیں کہ عالم اور حق تعالیٰ کے درمیان عینیت اور غیریت کی نسبت کے علاوہ ایک اور ہی نسبت ہے۔ خصوصیاتِ عالم میں سے جو بھی خصوصیت ظاہر و باہر ہے ساحتِ وجود عام اس کے غبار سے پاک ہے۔ جیسا کہ جلد کی سیاہی، قد کی کوتاہی، زبان کی لکنت، نوعِ انسان کو ملوث نہیں کرتی، ہر چند کہ کالا، کوتاہ قد اور صاحب لکنت انسان ہی ہے اور جو بھی چیز مطلق ہونے کی حیثیت سے اطلاق کے مرتبہ سے ظاہر ہوی ہو اس کو خصوصیت

کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے چنانچہ نوع ہونے، کلی ہونے، اور مطلق ہونے کو اس فرد کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے۔ (یعنی ایک فرد لنگڑا ہو تو کہہ نہیں سکتے کہ نوع لنگڑی ہے، کلی لنگر ہے، مثلاً زید لنگڑا ہو تو کہہ نہیں سکتے کہ حیوان ناطق لنگڑا ہے) ہر چند کہ مطلق مقید میں ہے۔ (جیسے حیوان ناطق زید میں ہے)

جب ان انواع مختلفہ میں قسم قسم کے خواص ہاتھ لگ جاتے ہیں تو (الاشیاء تعرف باضدادھا۔ اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) کہ حکم کے مطابق عقل ان امور متغائرہ کی سند سے مختلف انواع کے ثبوت کا یقین کر لیتی ہے۔ اور ہر ایک کو دوسرے سے فرق کر کے پہچان لیتی ہے۔ برخلاف وجود عام کے کہ اس کا کوئی غیر محسوس اور معقول نہیں ہے کہ عقل اس کے اندر تصرف کر کے اس میں اور اس کے غیر میں فرق کر سکے۔ اس کے باوجود یعنی وجود عام کا کوئی غیر نہ ہونے کے باوجود، وجود عام پر لطافت پر لطافت اور بساطت پر بساطت چڑھی ہوی ہے۔ لہٰذا حیرت کے سوا کوئی چیز عقل کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اسی لئے فلاسفر نے جوہر اور عرض کے درمیان حقیقت مشترکہ کا اثبات نہیں کیا اور وجودِ عام کو جنس اعلیٰ شمار نہیں کیا۔ شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔

مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی ''مکتوب مدنی'' میں فرماتے ہیں:

''صوفیاء نے عالَم کو حق تعالیٰ کا عین قرار دیا تو اس سے ان حضرات نے وجودات خاصہ کی نفی کا ارادہ نہیں کیا جو مختلف مراتب کی جانب وجود کے تنزل سے حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے معنی تنزل اور ظہور کے افادے کا ارادہ کیا ہے۔ جیسے ایک معقولی کہتا ہے کہ زید اور عمر ایک ہیں تو اس سے مراد نوع میں مماثلت ہے نہ کہ ان دونوں کے درمیان ہر وجہ سے اتحاد ہے اور کہتا ہے کہ انسان اور فرس ایک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اور فرس یہ دونوں حیوانیت میں مشترک ہیں اور کہتا ہے کہ بہادر اور شیر ایک ہیں تو اس سے اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ شجاعت میں دونوں ایک ہیں۔

اسی طرح صوفیاء عالم کو حق تعالیٰ کا عین کہتے ہیں تو اس سے وجودِ منبسط میں تعیّن کلی اور حق تعالیٰ کے ساتھ وجود منبسط کا قیام مراد لیتے ہیں۔ بالکلیہ تمایز کی نفی مراد نہیں لیتے۔

کسی صوفی نے کہا ہے،

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد | گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

وجود کا ہر مرتبہ ایک حکم رکھتا ہے۔ اگر فرقِ مراتب کا لحاظ نہ کرو تو تم زندیق ہو۔

مولانا عبد الرحمٰن جامی اور تحفہ مرسلہ کے مصنف اور دیگر صوفیائے کرام نے غیریت کو اعتباری قرار دیا ہے۔ اس سے ان حضرات کی مراد اعتبارِ واقعی اور حقیقی ہے۔ معتبر کا اعتبار مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب مکتوبِ مذکور میں رقمطراز ہیں:

یہ نہیں کہا جائے گا کہ صوفیاء اس بات کو لازم قرار دیتے ہیں کہ حقائق امکانیہ اعتبارات ہیں اور وجود کے ساتھ اضافات لاحقہ ہیں۔ اس لئے کہ ہم کہیں گے کہ صوفیاء کہتے ہیں۔ بے شک آگ، پانی کا غیر ہے اور پانی، ہوا کا غیر ہے اور انسان گھوڑے کا غیر ہے۔ اگرچہ کہ وجود ان سب (آگ، پانی، ہوا، انسان، گھوڑا) کو شامل ہے۔ لامحالہ انہوں نے اعتبارات اور اضافات سے ایک ایسا معنیٰ مراد لیا ہے جو اس تغائر کا مزاحم نہ ہوگا جو اختلافِ احکام کا منشاء ہے۔

اور یہ معنیٰ و مفہوم وہی ہے جس کی تعبیر کثرت، حقیقی اور وحدت، اعتباری سے کی گئی ہے جب کہ ہم اس کی حقیقت کی کثرت مراد نہیں لیتے بلکہ احکام کی تمیز اور آثار کا اختلاف اور حقائق کا تغیر مراد لیتے ہیں۔ جو کہ وجوداتِ خاصہ ہیں اور اصل وجود میں ان کا اختلاف مراد نہیں اور ہرگز ہرگز وجود واحد منبسط کی جانب سے اپنے موجودہ ڈھانچوں کے ساتھ ان کا عدمِ رجوع بھی مراد نہیں لیتے ہیں۔

نیز شاہ صاحب مکتوب مذکور میں فرماتے ہیں:

اور ویسے ہی میرے نزدیک مولانا عبدالرحمٰن جامی کا کلام مسلم ہے۔ کیوں کہ ان کا مقصود حقائق اور ان کے متعلقات کے اصل ہونے کی نفی ہے اور بے شک حقائق اور ان کے متعلقات، وجودحق تعالیٰ کے لئے اعتبارات اور اضافات ہیں۔ اس معنی و مفہوم میں کہ ان کے اندر وجودِ حق ظاہر اور متعین ہے فرقِ اعتباری کے معنی و مفہوم میں نہیں۔ انتہی۔

نیز شاہ صاحب مکتوب مذکور میں فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ وحدۃ الوجود کے قائل صوفیاء کا یہ قول عقل و کشف کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اس لئے کہ جب تم کہتے ہو کہ معرکہ قتال میں جسم ہی متحقق ہے۔ پس وہی قاتل ہے اور وہی مقتول ہے اور وہی قتل کا آلہ ہے اور وہی سوار ہے اور وہی سواری ہے اور وہی زین ہے اور وہی تلوار ہے اور وہی نیزہ ہے اور وہی کمان ہے اور وہی تیر ہے اور وہی تیر چلانے والا ہے اور وہی نشانہ ہے۔ اور وہی شکست دینے والا اور وہی شکست خوردہ ہے اور وہی حملہ کرنے والا ہے اور وہی حملہ کیا گیا ہوا ہے۔''

سوائے اس کے کہ جسم ان اسماء میں سے کسی بھی اسم کا مستحق نہیں بنا ہے اگر بنا ہے تو ایک کیفیت خاصہ اور معنیٔ خاص کے ذریعہ مستحق بنا ہے۔ اگر ہم ان کیفیات کے جسم سے متصل ہونے کو قطعِ نظر کر کے ان پر غور وفکر کریں تو وہ معدوم ہوں گی اور ان کیفیات سے ان کے آثار کا صدور بھی نہ ہوگا اور اگر جسم کے ساتھ ان کا انضمام ہو جائے تو وہ کیفیات موجود ہوں گی اور ان کے آثار کا صدور بھی ہوگا اور جسم ان کیفیات کا محل ہے۔ اور ان کیفیات کا حامل بھی ہے (جسم) اپنے وجودِ خارجی سے قبل عقل و تقدیر میں ان معانی کے لئے قابل اور مستعد بھی ہے۔ اور یہ کثیر صورتیں معدوم محض ہیں اگر جسم سے قطع نظر کرتے ہوے ان کی جانب ملاحظہ کیا جائے تو ان صورتوں کے لئے کوئی تحقق اور وجود نہیں ہے۔ اور یہ تمام موہوم

ہیں۔اور اگران کو جسم کے انضمام کے ساتھ ملاحظہ کیا جائے تو یہ تمام صورتیں موجود ہیں۔اور جب جسم تلوار کی صفت وکیفیت سے متصف ہو جائے اور کبھی نیزہ کی صفت سے تو جسم اسباب کا یعنی بڑھئی، لوہار، لکڑی، لوہا، آگ، بھٹی، ہتھوڑی، تیشہ اور آرہ وغیرہ کا مقتضی ہوگا۔ یہاں تک کہ معدوم موہوم (تلوار اور نیزہ) اور موجود (جسم) کے درمیان ایک نسبت پیدا ہوگئی۔ جس کی اینیت معلوم اور کیفیت مجہول ہوگی اس نسبت کی وجہ سے۔

یہ معدوم (تلوار و نیزہ) وجودِ خارجی سے متصف ہوگا اور اس وقت تلوار اور نیزہ کے وجود کا معنی وجود (جسم) کے ساتھ معدوم (تلوار و نیزہ) کا ارتباط ہے۔اس طرح کہ اس کے لئے وجود سے اسم کا اشتقاق صحیح ہوتا ہے اور عمومی طور پر جسم صور کثیرہ کے لئے متحمل ہو جاتا ہے۔پس جب جسم تلوار کی صفت سے متصف ہو گیا تو تلوار کے احکام قطع و برید وغیرہ سے آراستہ بھی ہو جائے گا۔اور ایک تعینِ خاص کے ساتھ متعین ہو جائے گا۔اور اپنی بعض متحمل صورتوں میں ظاہر ہوگا۔

پس اس وقت کہا جائے گا کہ جسم ایک مظہر خاص میں ظاہر ہوا ہے اور وہ تلوار ہے۔ اس وقت سارا کلام صحیح ہو گیا جس سے کسی عاقل کو انکار ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے یہ تو صرف لفظی مناقشات ہیں جو وضع اور عرف کی جانب لوٹتے ہیں اور ہمارے نزدیک ان مناقشات میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

جب تم جسم کے بارے میں اس قدر سمجھ چکے ہو تو پس وجود بذریعہ حمل مواطاۃ اس اطلاق کے لئے اولیٰ ہے پھر موجود جس کا معنی ہے ہر وہ شئی جو وجود سے متصف ہے بلاشک و شبہ وہ صفتِ انتزاعیہ ہے۔

لہٰذا ہمیں اس صفتِ انتزاعیہ سے بحث کرنا چاہئے کہ کیا اس صفتِ انتزاعیہ کے لئے خارج میں، انتزاع کا کوئی سبب ہے یا یہ صفت انتزاعیہ۔

انیاب الغول (بھوت کے دانت) کے مرتبے میں ہے (یعنی اس کا کوئی سبب نہیں ہے) اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عقل خارج میں انتزاع کے سبب اور منشا کا حکم کرتی ہے اور انیاب الغول کے احتمال ثانی کو منع کرتی ہے۔ اور جب یہ جسم کا حکم ہو تو یہی بطریق اولی وجود حقیقی کا حکم ہوگا جو خارج میں منشاء وانتزاع ہے۔ انتہی۔

اس موضوع پر مکتوب نگار کی اور بھی بحث موجود ہے۔ یہ مقام اس کے نقل کا متحمل نہیں۔

اسی سے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ وجود مـا نـحـن فیـه میں ہستی کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ اور وجود حقیقی ایک ایسی حقیقت ہے جو ان تین صفات سے متصف ہے۔

اول یہ کہ حق تعالیٰ کی ہستی ازلاً اور ابداً اس کی اپنی ذات ہی ہے۔

دوم یہ کہ موجودات کا قیام حدوث و بقاء کے اعتبار سے اسی کی ذات سے ہے۔

سوم یہ کہ اس کا غیر وقوع اور امکان کے اعتبار سے خارج میں منتفی نہیں ہوگا۔

اور یہ انتفاء تحقیق اور حصول کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ بعض حکماء اور متکلمین کا موقف ہے۔ اس لئے کہ تحقیق اور حصول معانی مصدریہ میں سے ہیں اور معانی مصدریہ خارج میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ موجوداتِ ذہنیہ میں سے ہیں۔ لہٰذا اس معنی میں لفظ وجود کا اطلاق حق تعالیٰ کی ذات پر جائز نہیں۔ جیسا کہ مولانا مولوی رفیع الدین نقشبندی قندھاری نے "سلوکِ قادریہ" میں تحریر کیا ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ ظاہر کا ظہور مظاہر میں تین قسم پر ہے۔

اول مجرد کا ظہور مجرد میں جیسے حق تعالیٰ کی ذاتِ واحد کا ظہور کثیر اسمائے الٰہیہ میں۔

دوم مجرد کا ظہور شئی مادّی میں جیسے جان واحد کا ظہور جسم کے کثیر اجزاء میں۔

سوم     شئی مادّی کا ظہور شئی مادّی میں جیسے مختلف رنگوں اور شکلوں والے کثیر آئینوں میں شخصِ واحد کا ظہور۔

ان تینوں ظہور میں ظاہر تغیر و تبدل اور تقسیم و تجزی اور اس کے حلول و اتحاد کی گنجائش نہیں ہے۔ امام ربانی مکتوبات کی جلد سوم کے ۸۹ ویں مکتوب میں لکھتے ہیں:

''یہ فقیر ان کے اطلاقات سے ہمہ اوست کا معنی سمجھتا ہے وہ یہ ہے کہ حادث کی یہ تمام متفرق جزئیات ایک ذاتِ تعالیٰ کا ظہور ہیں۔ اس رنگ میں کہ مثلاً زید کی صورت جو متعدد آئینوں میں ظاہر ہوی ہے زید کی ایک ذات کا ظہور ہے۔ یہاں کونسی جزئیت اور اتحاد ہے۔ اور کون سا حلول اور تلوّن، زید کی ذات ان تمام صورتوں کے باوجود اپنی اصلی حالت کی خالصیت پر برقرار ہے اور آئینوں کی یہ صورتیں نہ کچھ بڑھی ہیں نہ کچھ گھٹی ہیں۔''

اس جگہ میں جہاں زید کی ذات ہے ان صورتوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ تا کہ حلول و سریان جزئیت واتحاد کی نسبتوں میں سے کسی نسبت کو اس کی طرف منسوب کر سکیں۔

**الاٰن کما کان** کے راز کو اسی جگہ سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس مرتبہ میں ہے وہاں عالم کو قبل ظہور جیسے گنجائش نہیں تھی بعد از ظہور بھی وہاں گنجائش نہ ہوگی۔

پس اللہ تعالیٰ **لا محالہ الاٰن کما کان** ہی ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۳۹)

# وجود، وحدت الوجود اور وحدۃ الشھود کے معنی میں اختلاف کے بیان میں

واضح ہو کہ وجود کی ماہیت میں اختلاف ہے۔ ''رشحات'' کے مصنف ملاّ عبدالغفور کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حکماء اور صوفیاء کو اس وجود کے بارے میں اختلاف ہے جو موجودات کے آثار کا مبدا ر ثابت ہوا ہے۔ وہ کون سا وجود ہے؟

شیخ رکن الدین علاؤ الدولہ سمنانی اور صوفیاء کی ایک قلیل جماعت اور حکماء و متکلمین کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ وجود حق تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت کا نام ہے جو موجودات پر افاضہ کی گئی ہے۔ اور فیض وجودی وجود عام اور نفس الرحمٰن وغیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ اور شیخ محی الدین ابنِ عربی اور آپ کے متبعین اور متقدمین و متاخرین میں اصحاب تقویٰ وارباب تحقیق صوفیاء کی اکثریت اور حکماء و متکلمین کی اقلیت کی یہ رائے ہے کہ وہ وجود جو مبداء آثار بنا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ کا وجود ہی ہے جو اپنی حقیقت کا عین ہے، غیر نہیں۔

پس سارے ممکنات، وجود واجب سے موجود ہیں یعنی ذات حق کو اشیاء کے ساتھ ایک قسم کی معیت کا تعلق واقع ہے کہ یہ معیت مجہول الکیفیت ہے۔ انبیاء اولیاء اور حکماء میں جو ارباب تحقیق ہیں ان میں سے ایک فرد بھی اس معیت اور اس کی حقیقت کے راز کے درپے نہیں ہوا ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ہے کہ جو کچھ افراد اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق معیت

کے راز پر مطلع اور واقف ہوئے ہیں اور جو بھی تمثیل ذاتِ حق کی معیت کے ساتھ مشابہہ ہے اس کے ساتھ کسی قدر مناسبت رکھتی ہے۔ نہ کہ معیت الٰہیہ فی الواقع ایسی ہی ہوگی جیسے معروض کے ساتھ عارض کی نسبت جیسے (کوزہ کی معیت مٹی کے ساتھ اور مٹی کی معیت کوزہ کے ساتھ) اور بعض کے نزدیک وجود امر انتزاعی ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ وجود امر انتزاعی ہے جس سے ماہیات متصف ہوتے ہیں اور بنانے والے نے ماہیئت کو ماہیئت اور وجود کو وجود نہیں بنایا بلکہ ماہیئت کو موجود بنایا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ قول بذاتِ خود درست تو ہے لیکن وجود کی معرفت کو اسی میں حصر کرنے کے اعتبار سے اور وجود حقیقی کی بحث میں ذکر کرنے کے اعتبار سے غلط ہے۔ بلاشک وشبہ ہم ایک امر انتزاعی کا ادراک کرتے ہیں اور اس کو وجود کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ماہیات سے موصوف کرتے ہیں اور وجود کی صفت سے متصف کرنا جعل جاعل (حق تعالیٰ) کے آثار میں سے ایک اثر اور جاعل کے لئے مسبّب ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ جاعل نے ماہیت کو بنادیا اور اپنی ذات سے ماہیت کو صادر کردیا اور اس کے صدور کے بعد دیکھنے والوں نے ظہور فاعلیت اور قابلیت وغیرہ میں سے بعض احوال کو دیکھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں ایک صورت مرتسم ہوگئی جو وجود کے نام سے موسوم ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قول بھی بذاتِ خود درست ہے لیکن اس میں وجود معرفت کو حصر کرنے کے اعتبار سے غلط ہے۔ پس ہم خارج میں قطعی طور پر باہم متفرق اور ایک دوسرے سے ممتاز امور کا ادراک کرتے ہیں اور انہیں اسمائے مختلفہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بلاشک وشبہ امور متمائزہ جعل وجاعل ہی سے ہیں۔

وجود کے اسی اختلاف میں مولانا شاہ ولی اللہ مکتوب مدنی میں فیصلہ فرماتے ہیں۔

حق وصواب یہ ہے کہ بے شک یہاں وجودات خاصہ ہیں جن کا نام ہم نے ماہیات رکھ دیا جو دوسرے دو وجودوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک وجود وجدانی ہے جو موجودات کی شکلوں اور صورتوں میں پھیلا ہوا ہے۔اور یہ وجودِ وجدانی، وجوداتِ خاصہ پر متقدم ہے اور وجودات خاصہ، وجود کے بعض عموم کے لئے تنزلات اور تعینات ہیں۔اور وجودو ماھیات کے درمیان اینیت کے معلوم اور کیفیت کے مجہول کے ارتباط سے وجودات خاصہ حاصل ہوتے ہیں۔اور یہی ماہیات وجود منبسط کے شئوں اور حالات اور اس کے صور علمیہ ہیں۔

اور ان میں سے دوسرا وجود منتزع ہے جو اجمالاً وجوداتِ خاصہ کے ملاحظہ سے منتزع ہے۔ان دونوں وجودات کے قائل افراد میں سے ہر ایک نے حق وصواب کو تو پالیا لیکن ایسی چیز پر اکتفاء کر کے جو بیمار کو شفاء نہ دے اور سوزشِ دروں کو نہ بجھادے غلطی کر بیٹھے۔

صوفیاء کا کہنا ہے کہ جو شئی خارج میں ہوگی اور اس کے اوپر آثار خارجیہ مرتب ہوں گے تو وہ اس بات سے خالی نہ ہوگی کہ خارج میں اپنے حصول میں اور اس کے اوپر آثارِ خارجیہ کے درست ہونے میں یا تو کسی ضم ضمیمہ کے انضمام کی جانب محتاج ہوگی یا محتاج نہ ہوگی اگر محتاج ہوگی تو وہ شئی ممکن ہے اور اگر محتاج نہ ہوگی تو واجب ہے

اور ہم نے اپنے ذوقِ ووجدان سے ادراک کیا ہے کہ بے شک ضمیمہ وہی وجود ہے جو موجودات کی شکل اور صورتوں میں پھیلا ہوا ہے۔اور وہ ایک ایسی شئی ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور اپنے غیر قیام کا باعث ہے۔اور لوگوں کے نزدیک آثارِ معلومہ میں سے کسی نوع کے ساتھ مختص اور فی نفسہ متعین نہیں ہے۔لیکن وجود منبسط کے لئے علماً وعیناً کئے

تنزلات ہیں۔

پس ان ہی تنزلات کی وجہ سے آثارِ خاصہ معلومہ سے متعین اور مختص ہوگیا ہے۔اوراس کے تنزل کے مراتب میں سے پہلا مرتبہ بالذات، اپنے نفس کے لئے اس کی تجلّی ہے۔ایسی شانِ کلی کے ساتھ کہ کوئی بھی شان کوئی بھی حالت قطعاً اس سے خارج نہ ہو۔

پھر وجود کا تنزل اس شانِ کلی کی تفاصیل کی جانب علمی ہے عینی نہیں۔ پھر وجود کا تنزل مذکور تفصیل میں عینی ہے جیسے علمی تھا۔انتہی ۔

یہ ہے وہ اختلاف جو وجود کے معنی میں صوفیاء نے کیا ہے۔لیکن وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے معنی میں اختلاف یہ ہے جس کو مولانا شاہ ولی اللہ نے مکتوب مدنی میں تحریر کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

جان لیجیے ! بے شک وحدۃ الوجود اور وحدہ الشہود دو لفظ ہیں جن کا اطلاق دو مقام میں ہوتا ہے۔کبھی یہ لفظ سیر الی اللہ کے مباحث میں استعمال ہوتے ہیں۔پس کہا جائے گا کہ اس سالک کا مقام وحدۃ الوجود ہے اوراس سالک کا مقام وحدۃ الشہود ہے۔

وحدۃ الوجود کا معنی سیر الی اللہ کے مباحث میں ایسی حقیقتِ جامعہ کی معرفت میں ڈوب جانا ہے۔جس میں عالم کا تعین اس حیثیت سے ہوا ہے کہ جس سے ایسی تفریق اور تمیز کے احکام ساقط ہو جائیں گے۔جن پر خیر وشر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جن کی عقل وشریعت دونوں خبر دیتے ہیں اوران کی مکمل تشریح کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس میں بعض سالکین حلول کا شکار ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس مقام سے خلاصی عطا فرماتا ہے۔

اور وحدۃ الشہود کا معنی جمع اور تفریق کے احکام میں جمع کرنا ہے۔پس جان لینا چاہئے کہ اشیاء ایک اعتبار سے واحد ہیں اور دوسرے اعتبار سے کثیر اور مبائن ومتفرق ہیں اور یہ مقام مقام اول (وحدۃ ولوجود) سے ارفع اور اکمل ہے۔اوراس اصطلاح کو میں نے شیخ

آدم، نبوری قدس سرہ، کے بعض متبعین سے حاصل کیا ہے

اور کبھی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے الفاظ بعینہ اشیاء کے حقائق کی معرفت میں کئے جاتے ہیں۔ پس صوفیاء نے قدیم کے ساتھ حادث کے ارتباط کی وجہ میں غور وفکر کیا تو وجودیہ حضرات کے نزدیک یہ بات ثابت ہوی کہ بے شک عالم ایک ہی حقیقت میں جمع شدہ چند اعراض کا نام ہے۔ جیسے کہ (اگر آپ موم سے) سے انسان کی صورت گھوڑے کی صورت، گدھے کی صورت بنائیں تو موم پر وہ صورتیں اتر آتی ہیں اور موم کی طبیعت تمام حالتوں میں باقی رہتی ہے لیکن موم کو تماثیل کے نام سے یعنی انسان، گھوڑے اور گدھے کے نام سے موسوم نہیں کیا جائے گا۔ اگر کیا جائے گا تو اس کے اوپر مرتسم ہونے والی صورتوں کی وجہ سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ صورتیں حقیقت میں یہی تماثیل ہیں لیکن ان کے لئے وجود نہیں ہے۔ مگر ایک ضمیمہ کے انضمام کے ساتھ ان کا وجود قائم ہے اور وہ ضمیمہ موم ہے۔

اور شہودیہ حضرات کے نزدیک یہ بات ثابت ہوی کہ بے شک اشیاء عالم، اسماء اور صفات کے عکس ہیں۔ جو نیستی کے ایسے آئینوں میں منطبع ہوئے ہیں جو ان اسماء کے مقابل ہیں۔ جیسا کہ قدرت کی مقابلہ میں عدم ہے جو عجز ہے۔ پس جب قدرت کی شعاع، عجز کے آئینہ میں منعکس ہوتی ہے تو وہ قدرت ممکنہ بن جاتی ہے۔ تمام صفات کو اسی پر قیاس کرلیا جائے اور وجود بھی اسی اسلوب اور نہج پر ہے۔

مذہب اول وحدۃ الوجود سے موسوم ہے اور مذہب ثانی وحدۃ الشہود سے موسوم ہے۔

اصل الاصول کے مصنف حضرت شاہ عبدالقادر فخری میلا پوری ۲۳ ویں اصل میں سیر وسلوکِ معنوی اور مرتبہ توحید حالی کے مباحث میں فرماتے ہیں۔

حضرات صوفیاء کو مرتبہ توحید حالی دو قسم سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک قسم یہ ہے کہ احدیت ذاتی کی سطوت میں یہ ساری کثرتیں مقہور اور مخفی ہوجاتی ہیں اور حقیقت واحدہ نظر

آتی ہے۔ مثلاً اگر سونے کے تمام زیورات کو پگھلا دی جائیں تو خالص سونا بغیر صورت کے نظر آئے گا اور اگر لوہے کے تمام اسلحہ اور زرہیں پگھلا دیں تو محض لوہا نظر آئے گا اور تمام سمندری موجیں، حباب، برف اور اولہ کی صورتیں برطرف ہوگئیں تو صرف سادہ سمندر نظر آئے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت واحدہ کو ان کثرتوں میں مشاہدہ کرے بغیر اس کے یہ کثرتیں سالک کی نظر سے مرتفع ہوں مثلاً کلّی کا مشاہدہ افراد کے ضمن میں اور سونے کا مشاہدہ زیور میں اور لوہے کا مشاہدہ اسلحہ میں اور سمندر کا مشاہدہ امواج اور بلبلوں میں اور مٹی کا مشاہدہ برتنوں میں۔

وجودی حضرات کو ان کے اپنے سلوک میں اولاً اور دوسری قسم پیش آتی ہے۔ اس کے بعد وہ پہلی قسم کے شہود پر فائز ہوتے ہیں۔

پس یہ حضرات جانتے ہیں کہ وہ صورت جو ہم کو قسم اول میں مشہود ہوئی یعنی کثرت میں (زیورات) وحدت (سونے) کا نظارہ ہی حقیقت ہے۔ کیونکہ اس حقیقت واحدہ کو کثرتوں کے ساتھ معیتِ ذاتی حاصل ہے۔ اور دوسری قسم میں جو بات نظر آئی اور وہ صورت جو آخر میں شہود ہوئی یہ دیکھنے میں فقط اخفاء اور پردہ ہے۔ مثلاً نور آفتاب کی سطوت میں ستاروں کا پوشیدہ ہونا۔

شہودی حضرات کو بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور وہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ جو صورت ہم کو اولاً مشہود ہوئی عشق و محبت کے غلبہ کی وجہ سے تھی۔

در و دیوار میں آئینہ شد از کثرتِ شوق ہر کجامی نگرم روئے ترا می بینم

کثرتِ شوق کے باعث در و دیوار میرا آئینہ بن گئے ہیں، جہاں کہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے ہی کو دیکھ رہا ہوں۔

ورنہ حقیقت واحدہ کو کثرتوں کے ساتھ کسی طرح ملابست اور مخالطت نہیں ہے۔

(کیوں کہ حقیقتِ واحدہ عالم کے ساتھ نسبت تبائن رکھتی ہے۔) اور وہ صورت جو آخر میں مشہود ہوئی حقیقت نفس الامری ہے اور اس مرتبہ سے ترقی واقع ہوئی۔

اور اسی طرح وجودی حضرات جب فنائے تام کی منزل پر پہنچتے ہیں تو ان کو قسم اول کا مشہود میسر آتا ہے، جب منزل بقا (یعنی فرقِ ثانی جس کو فرق بعد الجمع کہتے ہیں) سے سرفراز ہوتے ہیں، قسم ثانی کے شہود سے نیچے اتر آتے ہیں۔ پس کہتے ہیں کہ وہ تجلی ذاتی الٰہی، سیر الی اللہ اور فنافی اللہ رہی ہے۔ اور یہ تجلی صفاتی اور اسمائی، سیر فی اللہ اور بقاباللہ ہے۔

اور شہودی صوفیاء کو بھی یہی حالت پیش آتی ہے تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ذات بمت کا شہود حقیقی اور نفس الامری تھا اور یہ کثرت میں وحدت کا شہود صرف ہماری نظر میں ہے۔ واقعی اور حقیقی نہیں ہے جیسے کوئی شخص سورج کے دائرہ پر نظر کرے۔ پھر دوسری اشیاء پر نظر ڈالے۔

اور شیخ ولی اللہ محدث دہلوی جو سلسلہ احمدیہ کے خلفاء میں قابلِ اعتماد خلیفہ ہیں ''ہمعات'' میں راہ جذب کے بیان کے بعد فرماتے ہیں:

اور جب وحدت کی یہ قسم سالک پر منکشف ہوگئی (یعنی فنائے تام کی منزل پر پہنچ جائے) تو اس نے راہِ جذب طے کرلیا۔ خواہ توحیدِ وجودی کا معتقد ہو یا معتقد نہ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص (شہودی) پہلے توحید صفاتی کو پالیتا ہے اور ایک زمانے کے بعد اس منزل سے گزر کر توحیدِ ذاتی کے مقام پر پہنچتا ہے اور اس معاملہ کی توجیہہ اس طرح کرتا ہے کہ میں پہلے مغلوب ہو چکا تھا اور واجب کی قیومت کو ممکن کی طرف نسبت کرتے ہوئے متحد سمجھا ہوا تھا۔ جیسا کہ کوئی شخص عالمِ خواب میں درندے کو مثلاً شیر، بھیڑیئے، ریچھ وغیرہ کو دیکھتا ہے۔ حالاں کہ وہاں کوئی درندہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کی قوتِ غضبیہ ہے جو درندوں کی شکل وصورت میں ظاہر ہوئی ہے اور جب اس مقام سے ترقی کر گیا

اور تنزیہ کے درجے میں پہنچا تو اس کو تشبیہ کے بھنور سے رہائی سمجھا اور دوسرے (وجودی) کو یہی صورت پیش آئی تو اس نے اس معاملہ کی توجیہہ اس طرح کی کہ یہ ظہور اور سریان امر محقق ہے اور وہ دوسری پوشیدگی صرف نظر میں پوشیدگی ہے۔

پھر شیخ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں۔

یہی طریق امر متفق علیہ ہے۔ اور اولیائے کاملین میں سے ایک ولی بھی ایسا نہیں ہے جس نے راہ سے سلوک طے نہ کیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے درمیان اس کی تعبیر میں اختلاف ہو۔

**عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمیل یشیر**

ترا حسن تو ایک ہی ہے۔ ہماری تعبیرات مختلف ہیں لیکن ہر تعبیر اسی صاحبِ حسن و جمال کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

لیکن قوی المعرفت اور ذکی الذہن شخص ہی ان اولیائے کرام کے کلام کا خلاصہ سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا تعبیرات کے فرق و اختلاف کو ان ہی حضرات کے خلاصہ کلام کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ شاہ صاحب کی بحث مکمل ہوی۔

نیز مولانا فخری میلاپوری مذکورہ اصل میں فرماتے ہیں:

وحدتِ شہود کا معنی یہ ہے کہ ان وجودات خاصہ کے درمیان کوئی جہت جامعہ نہیں ہے بلکہ تمام وجودات حقائق مختلفہ ہیں اور تمام آثار فاعل حقیقی سے فیض پانے والے ہیں جو اس کی ذات کا مقتضاء ہے اور فاعل حقیقی جمیع وجوہ سے ان وجوداتِ خاصہ کا غیر ہے۔ (پس وجود عام اور عالم کے درمیان نسبتِ تبائن ہوی)

لیکن اکابر اولیاء اللہ کو توحید عالی کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ حضرات کرام آثار میں ان آثار کے فاعل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس یہ چیز عشق و محبت کے غلبہ و استیلاء اور غلو کی

وجہ سے ہے۔ مثلاً کوئی شخص سورج کے دائرے پر نظر کرے یہاں تک کہ اس کی حسِ مشترک میں قرصِ شمس کی صورت مرتسم و منقش اور مضبوط و استوار ہو جائے۔

پس وہ شخص اس کے بعد جس چیز کو بھی دیکھے گا تو اس کا پہلا شہود قرص شمس ہوگا۔ پس وہ کہہ اٹھے گا، میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر اس کے قبل سورج کو دیکھا ہے۔

پھر جب بعض صوفیاء کی نظر اپنی ذات پر پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں **سبحانی ما اعظم شانی** ۔(میری ذات پاک ہے اور میری شان بڑی عظیم ہے) **لیس فی جیبی سوی الشمس** (میری قمیص میں سورج کے سوا کوئی نہیں ہے) اور بعض نے **اناالشمس** (میں سورج ہوں) کہہ دیا۔

عقل کی ضرورت اور بداہت سے معلوم ہے کہ شمس ہرگز اشیاء کا عین نہیں ہوا ہے۔ بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ وحدت الشہود کا یہی معنی لوگوں کی زبان پر مشہور ہے۔ لیکن میں ان اکابرین کے تعلق سے یہ گمان نہیں کرتا کہ انہوں نے اس طرح کہا ہوگا۔ بلکہ گمان یہ ہے کہ کسی ایسے شخص نے کہا ہوگا جو ان کے مذہب کو قلم بند کرنے کے درپے تھا۔

اللہ تعالیٰ ہی ان کی مراد اور معنی کو بہتر جانتا ہے اس لئے کہ توحید حالی کو اگر وحدۃ الشہود کہا جائے اس پر اعتراض وارد ہوگا کہ بلاشبہ توحید حالی کا حاصل ہونا صرف خواص صوفیاء ہی کے لئے ہے اور یہ انتہائی کمال ہے جس پر تمام صوفیاء کا اتفاق ہے۔ پس اگر بات ایسی ہی ہو تو یہ بات لازم آئے گی کہ ان بزرگوں کے ریاضات و مجاہدات شہودِ غیر حقیقی کا ثمرہ دیں گے جو حسّی غلطیوں کی قبیل سے ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

**والذین جاھد وافینا لنھدینھم سبلنا**

ترجمہ: جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھا دیں گے۔

**فحشاهم عن ذلک** ترجمہ :وہ بزرگ اس سے پاک ہیں۔

نیز مولانا فخری میلاپوری کے کلام کا خلاصہ یہ ہے جو انہوں نے اصل مذکور میں کیا ہے وجودات خاصہ کے درمیان ایک جہت جامعہ ہے جس کو آپ چاہیں تو وجود منبسط بھی کہہ سکتے ہیں یا وجود عام بھی کہہ سکتے ہیں۔وجوداتِ خاصہ کے ساتھ موجود منبسط کی نسبت اور اس کا ربط و تعلق اگر چہ **بحکم وللله المثل الاعلیٰ** محسوسات کی مثال سے اعلیٰ وارفع ہے لیکن یہ مثال سمجھنے کے لئے (وجودات خاصہ کے ساتھ وجود منبسط کی نسبت اور اس کا ربط و تعلق) افراد میں صورت نوعیہ کے ظہور کے مانند ہے۔ یا موج وحباب کے ساتھ پانی کی نسبت کی طرح ہے۔ یا زیورات کے ساتھ سونے کی نسبت کے مثل ہے۔ یا برتنوں کے ساتھ مٹی کی نسبت کے مانند ہے۔ کیوں کہ **مامن کثرۃ الاوقد ضبطها الوحدۃ** (کوئی کثرت ایسی نہیں جس کے ساتھ وحدت کا ربط وضبط نہ ہو)

اور کل متعین مسبوق باللا تعین (ہر متعین مسبوق ہوتا ہے اور غیر متعین سابق) کے حکم کے مطابق تعین چاہئے۔ضروری ہے کہ یہ وجودات خاصہ، وجود منبسط کے اشراقات اور ظلال ہوں۔ یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجود منبسط کے تنزلات اور ظہورات ہوں، یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجود منبسط کے تعینات اور تقیدات ہوں۔اس کے لئے ساری تعبیرات کا خلاصہ یہ ہے کہ وجودِ منبسط اصل ہے۔اور وجوداتِ خاصہ جو حقائقِ اشیاء ہیں اس کی فروع ہیں۔لہٰذا یہ خصوصیات قوالب موہومہ کی منزل میں ہوں گے۔اور وجود منبسط کے سوا کوئی بھی ثابت اور متحقق نہیں ہے۔کیوں کہ موجود کو جب ہم ماہیت سے الگ کر لیں اور وجود کو ماہیت سے کھینچ لیں تو اس وقت میں جمیع الوجوہ کوئی نہیں رہتا۔مثال کے طور پر ہم مٹی سے ایک گھڑا بنالیں اور تصور میں گھڑے کی صورت مٹی سے جدا کر لیں تو اس صورت کو کوئی تحقق اور ثبات نہیں رہتا اور وہ صورت ایک وہم سے زیادہ نہ ہوگی اور کوزے سے صورت کے انتزاع

کے وقت جب ہم غور سے دیکھیں تو ہر اثر اور صورت مٹی ہی سے ہوگی۔لیکن مٹی کثیر صورتوں کی متحمل ہے۔اگر ہم چاہیں تو اس کو چار گوشہ یا کرّہ یا اور کسی دوسری شکل میں ڈھال سکتے ہیں۔اور یہ تمام اشکال مٹی کے لئے قالب کی منزل میں ہیں۔اور ہر ایک شکل اپنی ذات کی حد میں امر موہوم ہوتی ہے کہ مٹی کے ساتھ اس کو ایک نسبت حاصل ہوتی ہے۔اور اسی نسبت کی وجہ سے مٹی کا نام سبو ہو جاتا ہے۔اور سبو کی خصوصیات اور احکام مٹی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔پس صوفیاء جو کہتے ہیں کہ عالم وہم اور خیال ہے اور اعیان ثابتہ یعنی ممکنات کی حقیقتیں وجود کی بو باس بھی نہیں رکھتیں۔جیسی عبارتوں سے مراد یہ ہے کہ یہ عالم کی صورتیں ایسے وجود کے ساتھ موجود نہیں ہیں، جو وجود منبسط کے علاوہ ہو، اور وجود منبسط ان تمام صورتوں کو شامل ہو، اور وجود حقیقی کی اضافت عالم کیصورتوں کی جانب محض وہم اور خیال ہو۔اس معنی و مفہوم میں نہیں کہ حقائق اشیاء کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔

آگ، ہوا، پانی، مٹی، گھوڑا اور انسان کی کوئی حقیقت ہی نہیں اور مکلّف کے لئے طاعت و معصیت، جزا و سزا اور جنت و دوزخ نہ ہوگی۔ **معاذالله من ذلک**

لیکن ان عبارتوں کی مراد، معانی کی وقت و باریکی کی وجہ اور عبارات کی ضیق و تنگی کے باعث کما حقہ واضح نہیں ہوتی اور مقصود کے خلاف ہونے کا وہم پیدا کرتی ہے۔

شیخ قدس سرہٗ کا یہ ارشاد حق محسوس اور خلق معقول ہے۔اسی مقام کی خبر دے رہا ہے

حاصلِ کلام! وجود حقیقی ایک فائض البرکات ذات ہوگی اور لا موجود الا اللہ متحقق اور ثابت ہوگا۔

## مثنوی

۱ عدم ہائیم ہستی ہائے ما  تو وجودِ مطلقی فانی نما

۲ نیست رانمود ہست انحتشم  ہست رانمود و بر شکلِ عدم

۳ بحر راپوشید و کیف کرد آشکار  باورا پوشید و نمودت غبار

۴ خاک را بینی بیالا اے علیل!  باورانی جز بتعریف و دلیل

۵ کف ہمی بینی روا نہ ہر طرف  کف بجز دربااندارد منصرف

۶ کف بحس بینی و دربا از دلیل  فکر پنہاں آشکارا قال و قیل

۷ نفی را اثبات می پند اشتیم  دیدۂ معدوم بینی داشتیم

۸ جرم سر گشتہ از ضلال  چوں حقیقت شدنہاں پیدا خیال

۹ اے عدم راچون نشاند اندر نظر  چوں نہاں کردآن حقیقت از بصر

۱۰ آفریں اے اوستادِ سحر باف  کہ نمودی معرضاں رادردصاف

### ترجمہ :

۱) ہم درحقیقت معدوم ہیں مگر موجود ہیں بظاہر تو (درحقیقت) سراپا وجود ہے (مگر) فانی جیسا (بظاہر)

۲) اس مہتمم بالشان ذات (اللہ تعالیٰ) نے معدوم کو وجودِ (ظاہری) بخشا اور موجودکو بہ شکل عدم بنایا یعنی نگاہوں سے اوجھل کردیا۔

۳) سمندرکو چھپادیا اور جھاگ کوظاہرکیا، (یادرہے کہ سمندرصرف پانی کا نام نہیں

ہے جو نظر آتا ہے) ہوا کو پوشیدہ کیا اور گرد وغبار کو تیرے (دیکھنے کے) لئے آشکار کیا۔

۴) اے بیمار آنکھ والے (اس گرد وغبار میں) تم صرف مٹی ہی کا اوپر سے نظارہ کر سکتے ہو نہ کہ ہوا کا۔ ہوا کا وجود دلیل وتعریف کے بغیر ثابت ہے۔

۵) جھاگ کو (سطح آب پر) ہر سمت بہتے ہوئے تم دیکھ سکتے ہو جھاگ کے لئے سمندر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

۶) جھاگ آنکھوں سے دکھائی دیتا اور دریا دلیل کے ذریعہ جانا جاتا ہے۔ فکر اور سوچ چھپی رہتی ہے (مگر) بحث وگفتگو سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

۷) ہم نفی کو اثبات سمجھ بیٹھے ہیں یعنی معدوم کو موجود سمجھ گئے ہیں ہم (حقیقت کو) نہ دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہیں۔

۸) بے شک ہم سراسر گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ جب حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو وہم وگمان پیدا ہوتے ہیں۔

۹) اے شخص تو جب عدم کو نظر میں رکھا یعنی اپنے معدوم ہونے کا احساس تجھے نہیں رہا اور جب وہ حقیقت (مطلقہ) تیری نگاہ سے پوشیدہ ہو گی یعنی تو خدا کے وجود کو فراموش کر بیٹھا (تو تیرا وہی حال ہوگا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔)

۱۰) مبارک ہو اے استاذ فن کب تو نے منہ موڑنے والوں کے لئے تلچھٹ پاک کیا ہے یعنی تو نے کبھی بھی حقیقت آشکار نہیں کیا اور معاملہ صاف نہیں کیا۔

اس کے بعد یہ بات جان لینی چاہئے کہ امام ربانی نے مکتوبات کی جلد اول کے ۱۶۰ ویں مکتوب میں جو بحث کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ :

مشائخ طریقت تین گروہ میں منقسم ہیں۔ پہلا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم حق تعالیٰ ان سے خارج میں موجود ہے اور اس کے اندر اوصاف کمال میں سے جو بھی ہے تمام کا

تمام حق تعالیٰ کی ایجاد سے ہے۔

دوسرا گروہ عالم کو حق تعالیٰ کا ظل اور سایہ جانتا ہے لیکن یہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم، خارج میں موجود ہے لیکن، وہ ظلیت کے طریق پر ہے۔ اصالت کے طریق پر نہیں اور عالم کا وجود، حق تعالیٰ کے وجود سے قائم ہے۔ جیسے سایہ کا قیام۔ اصل کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ یعنی خارج میں بس ایک ہی موجود ہے اور عالم کے لئے خارج میں کوئی تحقق اور ثبات نہیں ہے۔ یہ گروہ بھی عالم کو حق تعالیٰ کا ظلّ کہتا ہے اور یہ طبقہ واصلین، کاملین کا ہے۔ حسبِ تفاوت درجات وصل کمال

امام موصوف کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

پہلے گروہ کو ایجادیہ کہتے ہیں اور یہ طبقہ متکلمین کی طرح ''ہمہ از وست'' کا قائل تھا اور مخلوق وخالق، مصنوع وصانع، نقش ونقاش، کوزہ وکمہار اور تصویر ومصور کی طرح جانتا تھا۔

دوسرے گروہ کو شہودیہ کہتے ہیں اور یہ ''ہمہ بدوست'' کا قائل ہے اور مخلوق وخالق کو عکس وشخص کی طرح جانتا ہے۔ جیسا کہ عکس شخص کے بغیر قائم نہیں رہتا۔ اسی طرح عالم، حق تعالیٰ کے غیر قائم نہیں رہ سکتا۔

ان دونوں گروہوں کے نزدیک وجود ممکن، جمیع وجوہ سے وجود واجب (حق تعالیٰ) کا بغیر ہے۔

تیسرے گروہ کو وجودیہ کہتے ہیں اور یہ ''ہمہ اوست'' کا قائل ہے۔ پہلا گروہ صرف ایجاد کا قائل ہے، دوسرا گروہ ایجاد کے اقرار کے باوجود انعکاس کا قائل ہے اور تیسرا گروہ ایجاد وانعکاس کے اقرار کے ساتھ ساتھ صورتوں میں وجود کی معیت کا قائل ہے اور اس کے نزدیک وجود کے انضمام کے بغیر صورتوں کے لئے کوئی ظہور اور کوئی نشان اور علامت نہیں ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ:

وجودیہ کے نزدیک وجوداتِ خاصہ کے درمیان ایک جہتِ جامعہ ہے اور یہی وجودعام ہے اور یہ وجودعام (حق تعالیٰ) جو ہر قیوم اور جنسِ اعلیٰ ہے اور وجوداتِ خاصہ اپنے جمیع اجزاء کے ساتھ وجودواحد کی ذات میں اعراض مجتمعہ ہیں اور اس جنسِ اعلیٰ (وجود عام) کی نسبت وجودات خاصہ کے ساتھ مشہور چار نسبتوں میں سے عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔

اور شہودیہ ایجادیہ اور بہت سارے متکلمین کے نزدیک وجوداتِ خاصہ کے درمیان کوئی جہت جامعہ نہیں ہے اور اس جنسِ اعلیٰ (وجود عام) کی نسبت وجودات خاصہ کے ساتھ مذکورہ نسبتوں میں نسبت تباین ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ علمائے ظاہر کے نزدیک عالم، وجود اصلی کے ساتھ موجود ہے۔ اور علمائے باطن کے نزدیک خواہ وجودی ہوں یا شہودی عالم، وجود ظلّی کے ساتھ موجود ہے۔ امام ربانی اور شیخ ابن عربی دونوں وجود اصلی کی نفی میں متفق ہیں اور وجود ظلّی کے اثبات میں بھی متفق ہیں اور وجود ظلّی کو وہم اور خیال تصور کرتے ہیں اور خارج میں احدیت مجردہ کے سوا کسی کو موجود نہیں مانتے ہیں۔ امام ربانی وجودِ ظلی کو خارج میں ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے مکتوبات کی جلد دوم کے پہلے مکتوب میں لکھا ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ موجود ظلی کے مسئلہ میں امام ربانی کے اقوال اور آراء مختلف ہیں مکتوبات کی جلد دوم کے مکتوب اول وغیرہ میں لکھتے ہیں کہ: عالم، وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی ہے۔ اور مذکورہ جلد کے ۴۴ ویں مکتوب اور دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ عالم، ایک وہم محکم اور خیال استوار کے ساتھ موجود ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کے تعلق سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''مکتوب مدنی'' میں

فرماتے ہیں:

عالم کے بارے میں مجدد الف ثانی کے اقوال اور آراء مختلف ہیں۔ جیسا کہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ عالم وجود ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہے۔

ایک دوسرا قول یہ ہے کہ عالم، وہم اور خیال میں موجود ہے۔ مگر اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مرتبہ میں عالم کو استواری اور مضبوطی عطا کی ہے جس کی وجہ سے وہ وہم محکم اور خیال استوار ہو گیا۔

نیز مکتوب مذکور میں فرماتے ہیں۔

اسی طرح مجدد الف ثانی کے اقوال اور آراء کا یہ اختلاف کہ بے شک عالم، وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی وہم محکم کم نفع والا اختلاف ہے، جب کہ مقصود یہ ہے کہ بے شک موجودات خاصہ اس طرح متحقق اور ثابت ہیں کہ ان سے ان کے آثار ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ خواہ آپ اس ثبات و تحقق کو وجود خارجی سے موسوم کریں یا اس کو وہم محکم اور خیال استوار سے تعبیر کریں، دونوں برابر ہیں۔

اور اگر آپ مجھ سے حق خالص سے متعلق سوال کریں تو میں یہ کہوں گا کہ بے شک ذات الٰہی جس طرح کہ وہ ہے۔ بہت ہی جلیل اور عظیم ہے اس سے کہ وہ خارج میں ہے یا اعیان میں۔ اس لئے کہ خارج نفس رحمانی کا نام ہے اور اعیان میں کہنا بھی خارج کے طرف اشارہ ہے۔

ہاں! حق تعالیٰ کے لئے خارج میں تجلی عظیم ہے۔ اس تجلی کی شرط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خارج میں یا پس پردہ ہونے کی صفت سے متصف ہوتا ہے۔

اور اگر آپ مجھ سے ان سارے اقوال سے متعلق سوال کریں گے تو میں ان کا انکار نہیں کروں گا مگر تعبیر کی جیت سے یا شئی کو غیر موزوں اور غیر محل میں ذکر کرنے کی جہت سے

انکار کروں گا۔ ورنہ صاحب کشف ایسی چیز بیان نہیں کریں گے جس کی اصلاً کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔

نیز جاننا چاہئے کہ شیخ ابن عربی اور امام ربانی کے درمیان اسماء کی اصلیت اور ممکنات کی فرعیت کے مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے اور ان دونوں اکابرین کا وجدان اور فہم ایک ہی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک بزرگ نے اس مقدمہ کو دوسری عبارت سے تعبیر کیا ہے۔ اور امام ربانی نے سہو بشری اور ذہول علمی کی وجہ سے شیخ ابن عربی کی عبارت کو اپنے فہم و وجدان کے خلاف محمول کیا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کی وجہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "مکتوبِ مدنی" میں اس طرح وضاحت فرماتے ہیں کہ:

جو شخص اس مرتبہ میں اسماء کی اصلیت اور ممکنات کی فرعیت کی تعبیر کا ارادہ کیا ہے اس کے لئے دو عبارتیں ہیں۔ اور وہ دونوں بھی صحیح ہیں۔

شیخ ابن عربی کی تعبیر یہ ہے کہ حقائق ممکنات یہی اسماء اور صفات ہیں جو علم میں متمیز اور متفاوت ہیں۔

اور امام ربانی کی تعبیر یہ ہے کہ حقائق ممکنات عکوس ہیں، ایسے اسماء اور صفات کے جو اعدام میں منطبعہ ہیں۔ یہ ایسے اعدام میں جو اسماء کے مقابل ہیں۔

اور ان دونوں تعبیرات کے اندر صرف معمولی سا فرق ہے اور اشیاء کی حقائق ماھی علیہ کی تفتیش کے وقت اس کی پروا نہیں کی جاوے گی۔

اور امام ربانی کی تعبیر (ان حقائق الممکنات عکوس الاسماء واصفات المنطبعة فی الاعدام المقابلة) شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین کی تعبیر کی مخالف نہیں ہے۔

اس معنی و مفہوم میں شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین کی تصریحات اور تلویحات

کثرت سے موجود ہیں اور ہم نے مسئلہ کی مختلف وجوہات کی جانب اشارہ کردیا ہے۔ لہٰذا شیخ کے کلام کو نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اوران کی تصریحات کو مسلسل نقل کر کے بحث کو طویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور شیخ ابن عربی کی یہ تعبیر (**حقائق الممکنات ھی الاسماء**) اس مفہوم میں ہے کہ اسماء ہی وجود میں اصل ہیں۔ اوران کے لئے طرف مقابل میں ظلال وعکوس ہیں جن کو اعیان ممکنات سے موسوم کیا جاتا ہے یا اس مفہوم میں ہے کہ بے شک عارف کے لئے اسماء میں سے ایک رب ہے اور وہی عارف کی حقیقت ہے جس کی جانب عارف رجوع کرتا ہے۔

یہ مفہوم امام ربانی کی تعبیر کے خلاف نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں تو امام ربانی کے کلام سے ان کے کلام پر بہت ساری دلیلیں قائم کردیں۔

امام ربانی کے کلام کا عمل یہ ہے کہ انہوں نے شیخ ابن عربی اوران کے متبعین کے بعض مقالات کو دیکھ کر اوراپنے وجدان وفہم کے خلاف پر محمول کردیا اور یہ لغزش علمی وذہول فہمی ہے منزلِ کشفی نہیں۔ علمائے کرام علمی لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اگر ان کے کلام میں بھی کچھ علمی لغزشیں اور فہمی خطائیں پائی جاتی ہیں تو ان امور کی وجہ سے ان کے مراتب اور بلند درجات علیا مجروح نہیں ہوسکتے۔ شاہ ولی اللہ کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

اصحاب عقائد نے کہا ہے کہ مجتہد سے خطا اور صواب دونوں کا صدور ہوتا ہے۔ جب علامہ امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان اور تمام عظیم الشان مجتہدین کی خطا اوران کے درجات علیا اور مقامات رفیعہ کے لئے کوئی نقصان اور ضرر کا باعث نہیں بن سکتی ہے تو امام ربانی جو مقلد حفیہ ہیں، کی خطا غلطی ان کے مقام رفعت کے لئے کیوں کر نقصان اور ضرر کا باعث ہوسکتی ہے۔

حاصل کلام!

وجودیہ اور شہودیہ کے درمیان کثیر مباحثات ہیں اور ان مباحث میں طویل مقابلے ہیں جس کی ترجمانی یہ مختصر کتاب نہیں کر سکتی۔

تفتیش و تنقیح اور بحث و مباحثہ کے بعد واقعی جب عالم ہر دونوں (شہودیہ اور وجودیہ) کے نزدیک موجود ظلی ہے (موجود اصلی نہیں) تب تو ہر دونوں کی جائے رجوع اور مطمح نظر ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب ''مکتوب مدنی'' میں یہ فیصلہ فرماتے ہیں۔

ہمارے نزدیک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مکشوف پوری طرح صحیح ہیں، لیکن اس قول کو وحدۃ الشہود (ان العالم عکوس الاسماء والصفات انطبعت فی مرایا اور عدم الماللتک السماء والصفات)

شیخ ابن عربی نے امام ربانی کی تعبیر کو غلطی اور سہو پر محمول نہیں کیا ہے۔ بلکہ شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین حتیٰ کہ حکماء نے بھی سہو پر محمول نہیں کیا ہے۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ اس تعبیر کا خلاصہ مجازات اور استعارات (جو صعوبتِ فہم اور دقتِ فکر کو واجب کر دیتی ہیں۔) کی تخلیص اور تہذیب کے بعد یہ ہے کہ حقائق امکانیہ، انتہائی ضعیف اور انتہائی ناقص ہیں۔ اور حقیقتِ وجودیہ انتہائی کامل اور انتہائی قوی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ممکن ہے کہ حقائق امکانیہ کے تعلق سے یہ بات کہی جائے کہ بے شک وہ (حقائقِ امکانیہ) اعدام ہیں۔ جس میں وجودات (اسماء) کی صورتیں ظاہر ہوئیں اور یہ قول متفق علیہ ہے جس میں کسی قسم کا اخفاء اور اشتباہ نہیں ہے۔

وحدۃ الوجود کے مسئلہ میں اور بھی دوسری تفصیلات ہیں جن کو فقیر (مصنف فصل [illegible]) کے فتویٰ ''غایۃ التحقیق'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

نیز یہ بھی جان لینا چاہئے کہ وجودیہ، شہودیہ، ایجادیہ اور علم کلام کے علماء یہ تمام اہل سنت جماعت میں شامل ہیں۔ اور اہل سنت کے اختلافات میں ایک دوسرے پر عیب اور نکتہ چینی نہیں کرنا چاہئے زبان نبوت نے ارشاد فرمایا علماء کا اختلاف رحمت ہے، اور اہل سنت کے ہر مکتبہ فکر کے افراد کو ان ان کے موقف پر چھوڑ دینا چاہئے۔ **فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا** :تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ تم میں کون زیادہ ہدایت کی راہ پر گامزن ہے۔ ان اختلافات میں مجتھد ہی کو کسی ایک جانب کے حق وصواب ہونے کا یقین نہیں ہے تو ایک مقلد کو یہ بات کہاں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس موضوع کی تفصیل پانچویں مقدمہ میں دیکھی جائے۔ اس اختلافی مسئلہ میں بعض لوگ علمائے کرام اور صوفیائے عظام پر جو لعن طعن کر رہے ہیں اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔

نیز یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ ''الطاف القدس'' کے مصنف شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے شاگرد رشید شاہ شرف الدین صاحب مصنف ''قول الفصل'' قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں وجودیہ کی غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ''ہمہ اوست'' کہہ دیا۔ پھر عبودیت اور ربوبیت کے لوازم کے درمیان یہ فرق اور دوری دیکھی تو حیران رہ گئے۔ اس غلطی کا حل دو سہو کے بیان پر موقوف ہے۔

ایک سہو جو وجود عام کے ساتھ وجودات خاصہ کی نسبت کی معرفت میں ہوا اور دوسرا سہو جو ذات بحت کے ساتھ وجود عام کی نسبت کے درمیان ہوا۔

سہو اول کا بیان یہ ہے کہ ظہور ایک نسبت ہے ظاہر اور مظہر کے درمیان اور اس نسبت کا حکم ساری نسبتوں کے حکم کے علاوہ ہے۔ کیوں کہ ظاہر جمیع اعتبار سے مظہر کا عین نہیں ہے اور جمیع اعتبار سے مظہر کا غیر بھی نہیں ہے۔ نوع انسان کے مانند یہ نسبت افراد انسان۔

اگر نوع (مثلاً حیوان ناطق) من جمیع الوجوہ اس فرد (مثلاً زید) کا عین ہوتا تو چاہئے کہ یہ فرد (زید) دوسرے فرد (بکر) پر محمول ہو جائے۔ جیسا کہ نوع محمول ہوتا ہے۔ اور اگر نوع، من جمیع الوجوہ اس فرد کا غیر ہوتا تو ھذا انسان صحیح نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ ھذا حجر صحیح نہیں ہے۔ نوع انسان و نوع فرس، حیوان کی بہ نسبت،، اور حیوان و شجر نامی کی بہ نسبت اور نامی و جماد جسم کی بہ نسبت اور جسم و مجرد، جوہر کی بہ نسبت اور جوہر وعرض وجود عام کی نسبت یہی حکم رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر یدیہی ہے کہ ان مواضع کے اندر حمل کے مصداق اور تغائر کے مصداق ہر دونوں پائے جاتے ہیں، اور اس صورت میں ہر دو قبیل کے احکام کی گنجائش ہوتی ہے۔

عقول قاصرہ کبھی ان کو (مصداق حمل و تغائر) من جمیع الوجوہ عین شئی کی قبیل سے قرار دیتی ہیں (جیسے ملاحدہ) لیکن جب عینیت کے لوازم نہ پائے جائیں تو اس عقیدہ کو توڑ دیتی ہیں اور کبھی ان کو من جمیع الوجوہ غیر کے قبیل سے قرار دیتی ہیں (جیسے اکثر متکلمین) لیکن جب غیریت کے بعض لوازم نہ پائے جائیں تو حیران رہ جاتی ہیں۔

عقول سلیمہ جانتی ہیں کہ عینیت اور غیریت کی نسبت کے علاوہ ایک نسبت ہے جو اشیاء کی خصوصیات سے پیدا ہونے والی ہے۔ ان کے اثر سے وجود عام کا دامن پاک و صاف ہے۔ جیسے جلد کی سیاہی قد کی کوتاہی اور زبان کی لکنت نوع انسان کو ملوث نہیں کرتی۔ ہر چند کہ کالا شخص، پست قد اور صاحب لکنت، انسان ہی ہے۔ اور جو بھی چیز من حیث المطلقیت، اطلاق کے مرتبہ سے ظاہر ہو جائے تو اس کو خصوصیات کے ساتھ اس کو منسوب نہ کرنا چاہئے۔

جیسا کہ نوع۔ (حیوان ناطق) ہونے، کلی ہونے اور مطلق ہونے کو اس فرد (زید) کے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ ہر چند کہ مطلق (حیوان ناطق) مقید (زید) میں ہے۔ جب ان انواع مختلفہ کے اندر خواص متنوعہ ہاتھ لگ جاتے ہیں تو عقل امور متغائر کو دلیل بنا

کر الاشیاء تعرف باضدادھا کے حکم کے مطابق مختلف انواع کے ثبوت کا یقین کر لیتی ہے۔ اور ہر ایک نوع کو دوسری نوع سے جدا کر لیتی ہے۔ برخلاف وجود عام (حق تعالیٰ) کے کہ اس کا غیر معقول اور محسوس نہیں ہے کہ اس کے اندر عقل تصرف کر سکے اور پھر غیر سے پہچان سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ لطافت میں لطافت اور بساطت میں بساطت ہے حیرت کے سوا عقل کو کوئی شئے میسر نہیں ہوگی۔

اسی لئے فلاسفہ نے جوہر اور عرض کے درمیان حقیقت مشترکہ کا اثبات نہیں کیا ہے اور وجود عام کو جنس اعلیٰ نہیں شمار کیا ہے۔ اس کا سبب فلاسفہ کی عقل کے نزدیک وجود عام کا عدم حضور ہے۔ ہم خود جانتے ہیں کہ ایک حقیقت دو جسم کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ کبھی قیام کے لباس میں بذات خود ظہور کرتی ہے اور جوہر کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اور کبھی قیام کے لباس میں اپنے غیر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور عرض کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی معنی کی رنگینوں اور عجائب میں سے یہ بات ہے۔ عالم مثال (علم) میں جوہر کا (شیر) اعراض ہونا۔

اور خیال کی منزل میں جوہر (کوہ محسوس) کا عرض (کوہ معلوم) ہونا اور موجود خارجی پر صورت ذہنیہ کا صادق آنا۔ (اس طرح کہ یہ یہی ہے جس کو میں فراموش کیا تھا)۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں ہیں جو مخفی اور مستور ہیں۔

لیکن اصحابِ ذوق، ذوق کے حاسہّ سے بطریق حضور شئی لذاتہٖ (جیسے ہم خود اپنے آپ کو دیکھیں) شئی کا ادراک کر لیتے ہیں اور بطریق حضور شئی بذاتہٖ (جسے ہم سورج کی روشنی میں پہاڑ کو دیکھیں) شئی کا ادراک کر لیتے ہیں۔ بطریق حضور شئی فی ذاتہٖ (جیسے آئینہ میں تعینات خارجیہ) شئی کا ادراک کر لیتے ہیں۔ اور حقیقت کو کئی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے جانتے ہیں اور اس کے ذریعہ اشیائے ناآشنا سے آشنا ہوتے ہیں۔ غرض ظاہر و مظہر میں ظہور نسبت کا کچھ حصہ اصحاب ذوق کی عقل میں پایا جاتا ہے۔

سہو ثانی کا بیان ہے کہ وجود عام اور ذات بحت کے درمیان ایک معلوم الاینیت اور مجہول الکیفیت نسبت ہے، جمیع وجوہ کے ساتھ نہ تنزل ہے اور نہ جمیع وجوہ کے ساتھ ظہور ہے۔

پس ان حقائق سے ہر حقیقت مفصلہ کے ثبوت پر جو بھی اشکال پیدا ہوتا ہے وہ اس جگہ (یعنی) وجود عام اور ذات بحت کے درمیان نسبت کی جگہ) سننے کے قابل نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس مرتبہ میں داخل کرنے کے قابل ہے۔

حضرات صوفیاء میں سے ایک جماعت نے جب اپنی ذات میں دیکھا تو ان کو وجود عام مشہود ہوا۔ جس کو انہوں نے وجود سے تعبیر کیا۔ اور انہوں نے اس میں اس درجہ لطافت اور بساطت کو پالیا جو عقل و دانش کے دائرہ میں سما نہیں ہو سکتی تو اسی کو مبدأ المبادی (حق تعالیٰ )یقین کر لیا۔

اور ان کو لطافت و بساطت سے جو کچھ بھی حاصل ہوا اسی وجود پر منطبق کر دیا، اور اس معرفت میں ابد الدہر رہ گئے اور حقیقت کو نہیں جان سکے۔

ہنوز ایوانِ استغناء بلند است، ایوان استغناء ابھی تک بلند ہے۔

جو بھی شخص علامہ قیصری کے مقدمہ کا مطالعہ کرے گا وہ اس مذہب کو بخوبی جان لے گا۔ اس غلطی کا سبب وجود عام پر رک جانا ہے اور اس کے کئی وجوہ میں سے ایک وجہ پر اکتفا کر لینا ہے۔ اور اس کی حقیقت اور ماہیت تک رسائی حاصل نہ کرنا ہے۔ اگر وجود عام کی کنہہ اور ماہیت تک رسائی حاصل کر لیتے تو اس کو مبداء المبادی نہیں کہتے۔

صوفیاء کی ایک جماعت (مانند شیخ ابن عربی اور شیخ صدرالدین قوینوی) کا وجود عام کے ماوریٰ پر بھی گزر ہوا تو انہوں نے ذات بحت کو مبدأ لمبادی اور اول الاوائل سمجھ لیا۔ اور وجود عام کو صادر اول اور موجودات کی شکلوں اور صورتوں کو وجود منبسط کہہ دیا۔ لیکن احکام

تفصیلہ کے معاملہ میں وجود عام اور ذات بحت دونوں خلط ملط کردیا۔ اور ایک ہی نام (یعنی اسم موجود) سے موسوم کردیا۔ اور تسامح اور تساہل کی وجہ سے ہر ایک کے احکام کی تعبیر کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا۔

بعض حقائق کو بعض کے ساتھ خلط ملط کردینا اور شئی الطف کو اپنے مقام سے ہٹادینا اور کئے حقائق کو ایک ہی اسم سے موسوم کرنا صوفیاء کی قدیم رسم ہے۔ **ولین هذا اول قارورة کسرت** (محاورہ ہے: یہ پہلی بوتل نہیں جو توڑ دی گئی ہو) یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اس جماعت کے بعض متبعین حضرات (مثلاً تحفہ المرسلہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنف اور مولانا عبدالرحمٰن جامی وغیرہ) کو اس تسامح اور تساھل کی وجہ سے ایک اشتباہ واقع ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ خیال کیا کہ وجود ایک ہی ہے جو اعتبارات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوگیا۔ مختلف حقائق کے ساتھ تعلق کی وجہ سے وجود عام ہے اور صرافت کی وجہ سے ذات بحت ہے۔

اس اشتباہ کی وجہ عدم تفرقہ ہے۔ اس نسبت کے درمیان جو مختلف حقائق کو وجود عام کے ساتھ ہوتی ہے اور اس نسبت کے درمیان جو وجود عام کو مبدأ المبادی کے ساتھ ہوتی ہے۔

اور ایک گروہ (شہودیہ) جس کا ذوق اور وجدان تجلی اعظم سے پیوستہ تھا برہان عقلی کے ذریعہ صفات تنزیہ کو واجب میں اثبات کیا ہے (جیسے متکلمین) یا شرائع کی تقلید میں صفات تشبیہ اعتقاد کیا ہے۔

ان خواص کو نہ وجود عام میں پائے اور نہ اس چیز میں جو اہل معرفت نے ذاتِ بحت کے لئے درمیان میں لاکر اس کا مصداق سمجھئے ان دونوں نسبتوں کے انکار کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اتنی بات ثابت شدہ سمجھے کہ ذات بحت کے ساتھ تجلی اعظم کے انتساب کے اعتبار سے اور ذات بحت ان انوار و عکوس کہ ساتھ جو تجلی اعظم سے پھیلے ہوئے ہے بہت سارے احکام رکھتی ہے۔اور شرائع میں انہیں احکام کا بیان ہوتا ہے۔اور وجدان، برہان اور تقلید شرائع کو اس میدان سے باہر گذر نہیں ہے اور ان کے نزدیک ان کے ماوراء کی کوئی خبر نہیں۔ **واللہ اعلم بحقیقتہ الامور**۔شہودیہ اور وجودیہ کی بحث کا خلاصہ مکمل ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

# فائدہ نمبر (۴۰)

# تیرھویں صدی ھجری کے اھل علم میں سے چند علماء جو وحدۃ الوجود کے قائل ھیں۔

کیا عرفاء کرام اور کیا علمائے عظام اور کیا شیعہ حضرات اور مشہور حکماء وحدۃ الوجود کے قائل ہزاروں ہیں۔جن میں سے چند اکابرین کی تفاصیل مولانا فقیہہ علی مہایمی کی کتاب ''اجلۃ التائید شرح ادلۃ التوحید'' اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتاب ''نفحات'' اور مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''اخبار اخیار'' اور مولانا شاہ عبدالقادر فخری کی کتاب ''اصل الاصول'' اور ان کے علاوہ دوسرے اہل قلم حضرات کی تصانیف میں تلاش کیجئے۔

قائلانِ وحدۃ الوجود کے اقوال و آراء کی کثرت ان کے نقل میں مانع ہو رہی ہے۔لہٰذا ناچار فقیر بعض علمائے کرام متاخرین کے چند اقوال اس کتاب کے آخر میں نقل کر رہا ہے جو تیرھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

بحر العلوم ملک العلماء مولانا عبدالعلی ''شرح سلّم'' میں فرماتے ہیں۔کہ

''ہم اس کتاب کو اس حکمت حقہ کے ذکر سے منور کرتے ہیں جو پیغمبروں اور سچی خبر

دینے والے رسولوں پر وحی کی گئی تھی اور اولیائے عظام پر جن انکشاف کیا گیا ہے۔ معلوم کر رکھو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ موجود ہے اور وجود بحت ہے اور بالذات موجود ہے۔ اور اللہ کے ماسوا کسی شئی کا وجود نہیں اور پورے موجودات عالم اللہ تعالیٰ کے شیئون اور تعینات ہیں۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ کا ظہور ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ واجب بھی ہے اور جاعل بھی اور سارے متعینات ممکن اور مجعول ہیں۔ پس کثرت میں واحدہ کا ظہور ہوا ہے اور کثرت صرف بالاعتبارات تعین واحد کی مغائر ہوتی ہے۔ اور اعتبارات ( کثرت ) کا وجود بھی تعین واحد سے ہی مستعار ملا ہوا ہے۔ اور موجود در حقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے اور۔

اللہ سبحانہ وجود مطلق ہے۔ لیکن ان معنوں میں نہیں کہ اطلاق اللہ سبحانہ کے لئے قید بن جائے۔ وہ کلی ہے اور نہ جزئی اور نہ ہی کثیر اور نہ ہی اس کے سوا اس کے ساتھ کوئی شئی ہے اور نہ ہی وجود میں اس کا کوئی شریک ہے، وہی ہے حق اور فی حد ذاتہ منزہ اور واجب لذاتہ ہے۔ اور وہ خالق مشبہ ہے تعینات عدمیہ کے ساتھ اور نہ واجب، ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی ممکن واجب ۔پس اللہ تعالیٰ تشبیہ اور تنزیہہ دونوں کا جامع ہے۔ وہ فقط منزہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اشعریہ کا مذہب ہے۔ اس لئے کہ یہ تقید ہے اور وہ فقط مشبہ بھی نہیں ہے جیسا کہ مجسمہ کا مذہب ہے۔ اس لئے کہ یہ تحدید ہے اور اللہ تعالیٰ تقید اور تحدید دونوں سے بری ہے۔

سید الاولیاء رئیس الاتقیاء، امام المتقین ، زمین پر اللہ کے خلیفہ، طالبین کے ہادی، شیخ اکبر ولایت محمدیہؐ کے خاتم شیخ محی الملۃ والدین ابن عربی قدس سرہٗ نے اللہ تعالیٰ ان کے کلام کی لذت سے ہمیں بہرہ ور کرے۔

اگر تم صرف تنزیہ کے قائل ہو تو تم اللہ تعالیٰ کو قیہ سے مقید کر دو گے یعنی خدا کے ظہور کے منکر بن جاؤ گے۔ حالاں کہ خدا نے خود اپنے آپ کو ظاہر کی صفت سے متصف کیا ہے۔ اگر تم صرف تشبیہ کے قائل ہو جیسا کہ مجسمہ کا عقیدہ ہے کہ خدا مجسم و مشبہ ہے تو تم خدا کی حد

بندی کردو گے حالاں کہ خدا کسی بھی حد بندی میں محدود نہیں ہے۔

اگر تم تنزیہ اور تشبیہ دونوں کے قائل ہو یعنی عین تشبیہ میں خدا کے منزہ ہونے اور عین تنزیہ میں مشبہ ہونے کے قائل ہو تو تم معرفت الٰہی میں صائب الرائے بن کر امام اور سردار کہلاؤ گے۔

ایسے میں تم یہ کہنے کے قابل بن جاؤ گے کہ جو بھی شخص اللہ کے وجود کے لئے جوڑ ٹھرائے گا یعنی وہ اس بات کا قائل ہو کہ وجود متعدد و متبائن ہیں۔ اللہ کے لئے ایک وجود علاحدہ ہے اور ممکن کے لئے ایک وجود علاحدہ ہے تو اس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھرایا، لہٰذا وہ مشرک ہے اور یہ شرکِ خفی ہے اور جو شخص اس لئے وجود کے واحد و فرد ہونے کا قائل ہو کہ وجود نفس ذات حق ہے اور واحد ہے اور اس کے مظاہر کی کثرت اس کی وحدت کے منافی نہیں ہے تو وہ شخص موحد ہے۔

تم اس قسم کی تشبیہ سے بچنا کہ خود کو ایک موجود اور خدا کو موجود دوم سمجھو بلکہ مظاہر مشبہ میں تشبیہ کے قائل ہونا چاہئے اور اگر تم مفرد ہو یعنی تشبیہ کو تنزیہ سے الگ کرنے والے ہو تو ایسی تنزیہ سے خود کو بچائے رکھو، ماحصل یہ کہ تمہیں عین تشبیہ میں تنزیہ کے اور عین تنزیہ میں تشبیہ کے قائل ہونا چاہئے۔

تم عین حق نہیں ہو اس لئے حق وجود مطلق ہے اور تم مقید و متعین، ظاہر ہے کہ مقید مطلق کا عین نہیں ہو سکتا، بلکہ تم عین حق ہو بحسب حقیقت، اس لئے کہ حق تمہارے اندر متعین ہے اور تم حق کو عین۔ موجودات میں سہل طور پر تعین کی قید سے بری بھی اور متعین میں ظاہر بھی دیکھتے ہو۔ انتہی کلامہ الشریف آپ کا قابل شرف کلام پورا ہو گیا۔

منکرین کا کہنا ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود متعدد وجوہ سے خلاف عقل ہے اولاً یہ کہ اس سے واجب اور ممکن کا اتحاد لازم آتا ہے جو یقیناً محال ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے تمام موجودات کا

حقیقت میں متحد ہونا لازم آتا ہے۔ جو یقیناً محال ہے۔ ثالثاً یہ کہ اس سے کثرت میں واحد کا ظہور ہونا لازمی آتا ہے اور یہ بداہتہً محال ہے۔

ان اشکلات واحتمالات کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اولاً تو یہ مسئلہ انبیائے کرام کے نزدیک وحی کے نور سے اور اولیائے کرام کے نزدیک مکاشفہ کے نور سے منکشف ہوا ہے۔ لہٰذا عقلِ متوسط کی مخالفت میں (اصل مسئلہ) کو کوئی ضرر نہیں، لیکن عقل نورانی اس کی مخالفت نہیں کرتی، ثانیاً وجوب مطلق مع امکان افراد کے لئے کئی شواہد ہیں۔ جس طرح دو نقیض کا مفہوم ہے۔ مفہوم واجب ہے اور اس کے افراد یعنی دونوں نقیض میں سے ہر ایک ممکن ہے۔ اور تمام موجودات حقیقت میں مخالف ہونے کے لئے اب تک کوئی دلیل قائم نہیں ہوی اور دعویٰ بداہت بلا دلیل صحیح نہیں، حقائق کی تنقیح کی دشواری کا تم بھی اعتراف کرتے ہیں اور کثرت میں واحد کا ظہور ممتنع نہیں ہے۔ تم میں سے اکثر طبعی کے وجود کے قائل ہیں اور کثرتِ محضہ سے امر واحد کے عدم انتزاع میں بداہت کا دعویٰ کرنے والے بھی تمہارے اندر موجود ہیں۔ پس اس سے تمام موجودات کے درمیان ایک امرِ مشترک کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو وجود کو اسی امر مشترک سے منتزع کرتا ہے اور وہی امر واحد وجود حقیقی ہے اور وہ وجود واجب ہے اور عدم کے قابل نہیں۔

اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وجود، واجب الوجود اور تمام حقائق کی حقیقت اور عالم اس کے شئیون ہیں، اور وہ وجود ایک خاص قید سے منزہ ہے۔

نیز منکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ وحدۃ الوجود شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بات بھی غلط ہے۔ کیوں کہ قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ اس کی تائید میں ہیں۔ ان ہی دلائل سے ایک دلیل کلمہ توحید ہے۔

اس طرح اصول دین میں تاویل کرنا باطل ہے۔ جو مقبول نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اوران کفار نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس ان ہی میں سے ایک پیغمبر آ گیا اور کہنے لگے کہ یہ شخص خوارق میں ساحر اور دعوے نبوت میں جھوٹا ہے اور کیا یہ شخص سچا ہوسکتا ہے ! کہ اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے۔

یہ آیت کریمہ اس موقعہ پر نازل ہوی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ۔ ایک کلمہ کہو جس کی وجہ سے تم نجات پاؤ گے اور عرب وعجم کے مالک بن جاؤ گے۔ انہوں نے کہا بلکہ دس کلمات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو لا الہ الا اللہ: پس وہ فرار ہو گئے اور کہا، اتنی مخلوقات کے لئے ایک ہی الٰہ کیسے ہوسکتا ہے اور کیوں کر کثیر خداؤں کا ایک ہی خدا اقرار دیا جائے دوسروں نے کہا: ہم نے تو یہ بات اپنے پچھلے مذہب میں نہیں سنی۔ ہو نہ ہو یہ اس شخص کی گھڑت ہے، چلو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر قائم رہو۔ یہ کوئی مطلب کی بات ہے جیسا کہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس قصہ کو بیان کیا ہے۔ وہ اہل لسان تھے۔ پس انہوں نے جو کچھ سمجھا وہی مراد مدلول ہے۔ نیز رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فہم کا انکار نہیں کیا۔ ان دلائل میں سے ایک دلیل اللہ کا قول ہے، وہی ہے جو آسمان میں الٰہ ہے ورزمین میں الٰہ ہے اور یہ دلیل بھی ہے۔ بے شک اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا، جنہوں نے اپنی قوم سے کہا: ایک الٰہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الٰہ نہیں جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر یہ پیغام دے کر بھیجا، تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ میں تمہارے لئے ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں۔ اسی طرح ہودؑ، شعیبؑ اور صالحؑ علیہ السلام نے فرمایا جیسا کہ سورہ اعراف میں قصہ بیان کیا گیا اور بے شک الٰہ حق سے مراد قول غیر مسموع ہے۔ پس بلاشبہ ایسا قول ہے جو رسولوں کے عدم بیان کی وجہ سے ہے۔ ان کی مراد اصول دین میں ہے اور کلام کا آغاز خطاب میں لے آنے سے تاویل کیا گیا۔ یہ دلیل

بھی ہے اللہ کا ارشاد ہے: جولوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ فی الواقع اللہ سے بیعت کرر ہے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک صحابہ کرام کے ہاتھوں پر تھا۔ اور یہ دلیل بھی ہے، اللہ کا ارشاد ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے کے لائق کوئی اور معبود بھی ہے۔ بلکہ یہ قوم حد سے تجاوز کی ہوی ہے۔ اور یہ دلیل بھی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اگر تم رسی کو لٹکا دو تو وہ بھی اللہ ہی پر جا گرے گی۔ اور یہ صحیح حدیث ہے اور یہ حدیث قدسی بھی دلیل ہے۔ بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں۔ جب محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، یہ بھی صحیح حدیث ہے۔

حاصل کلام!

مسئلہ وحدت الوجود کی صحت و اثبات پر نور وحی شاہد ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

**اللھم ثبت قلبی علی الایمان مدة الحیوة الدنیا وبما لمماة بتصدق بنبیک و حبیبک و مصطفک واٰلہ الکرام واصحٰبہ العظام صلوٰت اللہ علیہ وعلیھم اجمعین۔**

سندالعلماء مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی "**تحفه اثنا عشریه**" میں فرماتے ہیں:

چودھواں عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کسی شئے میں حلول نہیں کرتا اور نہ ہی کسی بدن میں داخل ہوتا ہے۔ تمام غالی شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ائمہ کے بدن میں حلول کرتا ہے۔ حتی کہ ابو مسلم مروزی صاحب الدعوۃ کے بدن میں بھی جس کے قائل زرامیہ ہیں۔

طرفہ طرازی یہ ہے کہ شیخ ابن مطہر حلی نے ان ساری باتوں کو جاننے کے باوجود کتاب ''نہج الحق'' میں حلول کے قول کو صوفیائے اہل سنت جماعت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ حالاں کہ یہ سبھی حضرات حلولیہ کو کافر قرار دیتے ہیں اور یہ تمام باتیں مسئلہ وحدت الوجود (جو انتہائی دقیق اور غامض ہے) کو نا سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ حلول کو محمول کیا گیا۔ اس جگہ ان کے علماء کی دقیقہ شناسی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ جیسا کہ یہی معاملہ دیگر مطالب غامضہ کا بھی ہے جو ائمہ حضرات کے کلام میں واقع ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کو غلط سمجھ کر مسخ اور تبدیل کر دئے ہیں۔ شیعہ کے بعض غالی فرقے مثلاً بنانیہ، نصیریہ اور اسحاقیہ وغیرہ حلول کے بجائے اتحاد کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ حالاں کہ اتحاد مطلقاً باطل ہے اور اس کا بطلان تو روشن بدیہات میں سے ہے۔ شیخ ابن مطہر حلی نے کمال دقیقہ شناسی کے زعم کے ساتھ اتحاد کے قول کو بھی سالکین اہل سنت کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ حالاں کہ ان بزرگوں کی مراد اس اتحاد سے ان معنوں میں سے ایک ہے نہ کہ حقیقی اتحاد مراد ہے۔

معنی اول یہ کہ تجلی کا نور ظاہر ہونے کے وقت میں بندے کی انانیت کی مضمحل اور زائل ہونا ہے جس طرح کہ آفتاب کی روشنی ظاہر ہونے کے وقت میں چراغ کی روشنی مضمحل اور زائل ہو جاتی ہے اور اسی حالت کا پیش آنا اور نور و تجلی کا ظاہر ہونا قرآن مجید اور اقوال عترت سے ظاہر ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تو اس پہاڑ کے پرخچے اڑا دئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اور اللہ کا یہ ارشاد : جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو منجانب اللہ آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں یعنی فرشتے، ان پر بھی برکت ہو اور جو اس کے پاس ہے یعنی موسیٰ ان پر بھی برکت ہو، یہ دعا بطور تحیہ و سلام کے ہے اور رب العالمین پاک ہے۔ اور اقوال عترت طاہرہ میں سے حضرت صادق کا قول، جو ابو بصیر کے مراسلہ میں ہے۔ کلینی کی روایت سے پیچھے گزر چکا ہے، کہ بے شک

مومنین دنیا میں یوم قیامت سے قبل خدا کو دیکھ لیں گے۔اور اس معنی کی توضیح وتشریح شیخ ابن فارض مصریؒ نے ''قصیدۂ تائیہ'' میں کیا ہے۔

اسی مفہوم کو شیخ ابن فارض مصری علیہ الرحمہ نے اپنے ''قصیدۂ تائیہ'' میں واضح کیا ہے۔صوفیائے کرام کے نظریۂ اتحاد کا ثبوت ایک ایسی حدیث سے ہے جس کی روایت ضعیف نہیں ہے۔اور وہ اشارہ کررہی ہے بندے کے محبوب ہونے کے بارے میں جو نوافل یا ادائے فرائض کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور تنبیہ الاشارہ کا مقام کنت له سمعا سے نور آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہے اور وہ حدیث قدسی یہ ہے:

میرا بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو اس کا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اسکا پیر ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلنے لگتا ہے۔

معنیٔ دوم یہ کہ خود کو آئینہ قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کے مظاہر میں سے ایک مظہر سمجھیں اس طرح کہ بعض احکام مظہر سے منسوب ہوں گے اور بعض منسوب نہ ہوں گے۔لیکن جو وصف کہ ظاہر کی پاکی ونزاہت میں عیب ونقص کا باعث ہو مظہر سے آگے نہ بڑھے اور جو وصف کہ مرتبۂ ظاہر کا عنوان جو مظہر کی طرف نقول نہیں کرے اور یہ معانی و مفاہیم بھی قرآن کریم اور اقوال عترت سے پوری طرح ظاہر ہے۔

جس کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کی ، بے شک جو لوگ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کررہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کررہے ہیں اور حضرت امیرؑ کا ''خطبة البیان'' اور ''خطبة الفتخار'' فرقۂ امامیہ کی کتابوں میں مشہور ومعروف ہے اگر شیخ حلی اتحاد کے ان صحیح معنوں سے

دانستہ طور پر لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ دوسرے ذی فہم شیعہ ان معنی کو سمجھے ہوئے ہیں اور عقل وفہم کی ترازو میں عمدہ طور پر تولے ہیں۔

خواجہ نصیر طوسی کا کلام ''شرح مقامات العارفین'' میں اور صدراء شیرازی کا کلام ''شواہد ربوبیت واسفار'' میں اور ابن ابی جمہور کا کلام اور اس فرقہ کے دوسرے متاخرین کا کلام ملاحظہ کرنا چاہئے۔ اور اگر ان اشخاص پر بھی اعتماد نہ ہو کہ ان کا کلام تصوف، فسلفہ اور شریعت کے درمیان مخلوط ہے۔ تو مقداد اور شارح قواعد اور صاحبِ کنز العرفان فی تفسیر الاحکام کا کلام نقل کرتا ہوں۔

''شرح الفصول فی علم الاصول'' میں حضرت مقدادؒ سالک کو پیش آنے والے احوال کے ذکر فرماتے ہیں کہ: اتحاد سے مراد یہ ہے کہ سالک بغیر کسی تکلیف کے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کرتا رہے اور کہتا ہے کہ اسی سے ساری مخلوقات اور موجودات قائم ہیں۔ اس حیثیت سے کل ایک ہی ہوگا کیونکہ سالک جب اللہ تعالیٰ کی تجلی اور نور سے دیکھنے والا ہو جائے گا تو اس کو سوائے اللہ کی ذات کے کوئی نظر نہیں آئے گا۔ نہ رائی اور نہ مرئی۔

نیز مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی ایک عالم کے جواب میں فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجمع کمالات ومناقت، قیم احکامِ شریعت مولوی نور اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ آپ کے جذبہ حفاظت شریعت واصلاح ودین میں اضافہ فرمائے۔

بعد از ابلاغِ سلام مسنون۔ فقیر عبدالعزیز عرض کرتا ہے کہ آپ کا مکتوب گرامی مسئلہ توحید وجودی وشہودی کے استفسار سے متعلق اور میاں رمضان شاہ کے وحشت ناک اقوال کی تردید وانکار سے متعلق موصول ہوا۔

مہربانِ من!

حقیقت الامر یہ ہے کہ عظیم صوفیائے متقدمین نے اس مسئلہ میں اس طرح سے توضیحات اور اشارات کی ہے کہ تاویل کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ کبھی حکایت کے ذریعہ تاویل ہوسکتی ہے اور کبھی سُکر و مستی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ خود آپ ہی نے چند بزرگوں کے ارشادات نقل فرمایا ہے۔ طبقۂ سلف گزر جانے کے بعد اور پانچ سو صدی ہجری کے بعد صوفیائے کرام دو فرقوں میں بٹ گئے اور ایک کثیر جماعت نے ان اشارات کو حقیقت پر محمول کیا۔ اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ وجوب، امکان، قدیم، حادث، مجرد، جسمانی، مومن، کافر، نجس اور طاہر کے مراتب و درجات میں ایک ہی وجود ظاہر ہے لیکن ہر مظہر علاحدہ حکم رکھتا ہے، اور ان مظاہر کے احکام میں فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ مومن کے لئے نجات کا حکم ہے تو کافر کے لئے قتل و قید کا حکم ہے اور تمام صفات متضادہ میں اسی طرح قیاس کر لینا چاہئے۔

وجود کا ہر مرتبہ ایک حکم رکھتا ہے۔ لہٰذا فرقِ مراتب نہ کیا گیا تو زندیقیت ہے۔

اور یہی فرق ظاہر شریعت کے احکام میں قائم ہے۔ اسی لئے تو منکوحہ عورت حلال ہے اور اجنبی عورت حرام اور باپ کی تعظیم و تکریم واجب ہے اور کافر معاند واجب التحقیر ہے اور جو شخص صرف وحدت الوجود کو پیش نظر رکھتے ہوئے شریعت کے احکام میں فرق نہ کرے تو خلافِ شرع اور الحاد و زندیقہ ہے۔

اور اسی طرح وجود جو ذاتِ حق کا عین ہے صوفیاء کے نزدیک مظاہر مختلفہ میں ظہور کے باوجود مرتبہ واحدیت میں نقائص سے پاک اور منزہ ہے اور کمالات سے متصف ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ مراتب کثرت کا نقصان اس پر عائد نہیں ہوتا، جیسا کہ آفتاب کی شعاعیں نجاسات پر واقع ہونے کے باوجود آفتاب نجس نہیں ہوتا اور انسان کی حقیقت کلیہ کسی مسلمان، کافر، صالح، فاسق، عالم اور جاہل میں ظہور کرنے کے باوجود خود کوئی نقص اور

نقصان قبول نہیں کرتی اور بہت سے نامور صوفیائے کرام اور علمائے کرام نے یہی موقف اختیار کیا ہے، اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جیسا کہ سلسلۂ قادریہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ صدرالدین قونوی اور شیخ عبدالکریم جیلی اور شیخ عبدالرزاق جھجانوی اور شیخ امان پانی پتی رحمہم اللہ کی کتابیں اور سلسلہ کبرویہ میں مولانا رومی اور شمس تبریزی کی کتابیں، اور سلسلہ سہروردیہ میں شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اور سلسلۂ چشتیہ میں سید محمد گیسودراز اور سید جعفر مکی رحمہما اللہ کی کتابیں اور سلسلہ نقشبندیہ میں اور سلسلہ نقش بندیہ میں خواجہ باقی باللہ اور عبیداللہ احرار اور مولانا نورالدین جامی اور مولانا عبدالغفور لاری کی کتابیں نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔

ان کے علاوہ شیخ عبدالرزاق کاشی، شمس الدین قنباری قیصری اور سعید الدین فرغانی وغیرہ بھی اسی مسلک کے پیروکار اور موید گذرے ہیں اور ان بزرگوں کی کتابیں بھی مشہود اور موجود ہیں، اور آنجناب کے مطالعہ میں آئی ہوں گی۔

صوفیائے کرام کی دوسری جماعت نے ان اشارات کو تاویل حکایت یا سکر و مستی پر محمول کرتے ہوئے وحدت الوجود کا انکار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ بعض اوقات وجود کی وحدت سالک کی نگاہوں میں نظر آتی ہیں بغیر اس کے کہ حقیقت میں وحدت ہو جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں تمام سیارے بے نور نظر آتے اور دکھائی نہیں دیتے حالاں کہ نفس الامر میں ان کا وجود ہے اور وہ روشنی بھی رکھتے ہیں لیکن دن کے وقت میں آفتاب کی روشنی کے غلبہ کے باعث ان کی روشنی مضمحل ہو جاتی ہے اور یہی حالت و کیفیت چراغ کی ہوتی ہے۔ جب کہ وہ مشعل کے آگے رہے۔

اسی لئے جو حضرات توحیدِ خالص کے نظریہ سے لوٹ چکے ہیں ان کے نزدیک توحید صرف شہود اور نظر میں ہے بغیر اس کے کہ وجود میں ہو۔ جیسا کہ شیخ علاؤالدین سمنانی اور

دیگر صوفیائے متقدمین کا یہی مسلک ہے اور امام ربانی مجدد الف ثانی اور ان کے متبعین کا بھی یہی موقف ہے اور ان حضرت نے بھی اس عقیدہ کے اثبات میں بہت ساری کتابیں لکھی ہیں اور آپ کو بھی معلوم ہی ہوگا۔

حاصل کلام ! ہم لوگ وجودی اور شہودی کے اختلاف کے بعد پیدا ہوئے ہیں طرفین میں سے کسی ایک جانب کی صحت و درستگی کا جزم و یقین حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا ہمارے لئے یہی ایک راہ ہے کہ جس طرح مذاہب اربعہ میں حق کو دائر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں مذہبِ حنفیہ صواب پر مبنی ہے اور خطا کا احتمال ہے اور مذہبِ شافعیہ و مالکیہ اور ان کے علاوہ دیگر مذاہب خطا ہیں اور صواب کا احتمال ہے۔

اسی طرح ان دونوں مذاہب (وجودی و شہودی) میں سے کسی ایک مذہب کی دلیل راجح معلوم ہو تو دوسرے مذہب کو غلط اور گمراہ خیال نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ دوسرے مذہب کو غلط سمجھنے سے نامور علماء و مشائخ کی کثیر جماعت کا کافر اور گمراہ ہونا لازم آئے گا۔

ہاں ! اگر کسی ایک مذہب کی تقلید میں غلو کرے اور فرق مراتب کو نظر انداز کر دے اور جادۂ اعتدال سے قدم باہر رکھے اور عابد کو معبود، حادث کو قدیم، ملوث کو منزہ، حرام کو حلال اور نجس کو طاہر خیال کرے تو یقیناً ایسے اشخاص ملحد و زندیق قرار پائیں گے۔

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ توحید وجودی اور توحید شہودی کے فرق کے باعث جو اختلاف امت میں پیدا ہوا وہ سنی و رافضی یا سنی و خارجی کے اختلاف کے مانند نہیں ہے کہ فریقین جانبین سے ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر قرار دیں بلکہ شہودی اور وجودی کا اختلاف تو مذاہب اربعہ کے اختلاف کی طرح ہے۔

ہاں ! اگر کوئی وجودی شخص جادۂ اعتدال سے قدم باہر رکھتے ہوئے الحاد و زندیقہ کی نوبت و مصیبت پیدا کر دے تو وہ یقیناً گمراہ اور گمراہ کن ہے۔ اور اسی طرح کوئی شہودی شخص

اعتدال کی روش ترک کرتے ہوئے علماء اور صوفیا کے گروہ کثیر کو گم راہ اور کافر کہنے لگے تو وہ یقیناً مطعون اور قابل سرزنش ہے۔

یہ ہے اس اختلافی مسئلہ کی تفصیل، اب میاں رمضان شاہ کے احوال ملاحظہ کیجئے:
اگر وہ احکام شریعت کے پابند ہیں اور لوگوں کو نماز، روزہ، تلاوت قرآن، ذکر، خوف، رجا، تقویٰ اور اصلاح کی دعوت دے رہے ہیں تو الحاد و زندقہ سے بہت دور ہیں۔ معاذ اللہ! اگر وہ شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کر رہے ہیں اور لوگوں کو اباحت اعمال اور الحاد و زندقہ کی تلقین کر رہے ہیں۔ تو یقیناً گم راہ کہنے کے قابل اور کافر قرار دینے کے لائق ہیں۔

فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں چند ایسے وجوہ ہوں جو تکفیر کے موجب ہیں اور ایک ہی وجہ ایسی ہے جس سے عدم تکفیر کا پہلو نکلتا ہے تو مفتی کے لئے ضروری ہے کہ اسی پہلو کو اختیار کرے جب کہ قائل خود وجہ کفر کی وضاحت کیا ہو۔

فتاویٰ عالمگیری اور دیگر مستند فتاویٰ میں مرقوم ہے، جب کسی قول اور مسئلہ میں چند ایسے اسباب اور وجوہ پائے جاتے ہوں جس سے تکفیر لازم آرہی ہے اور ایک وجہ ایسی ہے جس سے تکفیر لازم نہیں آتی تو مفتی کو چاہئے کہ اسی ایک مانع تکفیر وجہ کو اختیار کرتے ہوئے کسی مسلمان کو کافر قرار نہ دے الا یہ کہ قائل خود اپنے ارادے کی وضاحت کر دے۔ جس سے تکفیر لازم آرہی ہے تو ایسی صورت میں تاویل بے سود ہے۔ پھر اگر قائل کی نیت میں مانع تکفیر وجہ موجود ہو تو وہ مسلمان ہے اور اگر موجب تکفیر وجہ ہو تو مفتی کا فتویٰ نفع نہیں دے گا۔

**واللہ یحق الحق وھو یھدی السبیل۔ السلام علیکم وقلبی لدیکم۔**

نیز مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی ایک سائل کے جواب میں لکھتے ہیں کہ وحدت الوجود حق اور واقع کے مطابق ہے، کیوں کہ اس کے ثبوت کے لئے دلائل عقلیہ اور نقلیہ موجود ہیں۔ جیسا کہ شیخ علی مہایمی گجراتی کی کتاب ''**ادلۃ التوحید**'' میں شرح وبسط

کے ساتھ مذکور ہے۔

علمائے متکلمین اس مسئلہ کو رد کرنے کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ مسئلہ وحدت الوجود پر کمالِ وقت و باریکی کے باعث بہت سارے عقلی اور نقلی شبہات وارد ہوتے ہیں اور ان شبہات کا حل متکلمین کو میسر نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اس مسئلہ کا انکار کیا اور یہ سطحی متکلمین کی حالت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا تعلق اسرار و رموز سے ہے اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے پر شریعت کا انحصار نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح اور تلقین عوام کے حق میں الحاد کا دروازہ کھول دیتی ہے اور ان کے لئے اباحت اعمال، شرور و فساد اور تکالیف شرعیہ میں مداہنت کا باعث ہے۔ جیسا کہ مسئلۂ وحدت الوجود کی اسی دقت و باریکی کی وجہ سے اس کا اظہار و بیان اور تشریح و تلقین ممنوع اور محذور ہے۔ اسی لئے متکلمین نے اس باب میں کفِ لسان کو واجب ضروری سمجھا جیسا کہ حدیث شریف ہے۔

جب قضا و قدر کا ذکر ہو تو سکوت اختیار کرو اور جب میرے صحابہؓ کا تذکرہ ہو تو ان کی ذوات کو ہدفِ تنقید و بحث نہ بناؤ اور جب نجوم کا ذکر ہو تو خاموشی اختیار کرو۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوی کہ اس دقیق مسئلہ مس تحقیق و تفتیش اور تفصیل کے درپے ہونا گویا خود کو گم راہی میں مبتلا کرنا ہے اور دوسروں کو بھی ضلالت کے بھنور میں جھونک دینا ہے اور یہی متکلمین محققین کا موقف ہے۔ اس سکوت و احتیاط کے باوجود ان حضرات نے اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر اجمالاً بحث کی ہے۔ جیسے امام غزالی، امام رازی اور ان کے علاوہ اور بھی اس فن کے دوسرے امام اگر اس مسئلہ کی تفصیل و تشریح دیکھنی ہو تو کتاب ''تنبیہ المجوبین'' کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

حاصل کلام !

حقیقت تو یہ ہے کہ مسئلہ ابتداء میں دلائل و براہین کی روشنی میں منکشف نہیں ہوا بلکہ محض موہبت و معرفت سے منکشف ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا منکشف ہونا کسب و تحصیل پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس کے انکشاف کو حالات و کیفیات کے ورود ہونے پر منحصر سمجھنا چاہئے۔

ہاں اگر کسی شخص کو اولیاء اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں کلام کرنا منظور ہو تو اس کو چاہئے کہ ان بزرگوں کے بارے میں بداعتقاد نہ ہو جائے اور رسائل توحید ملاحظہ کرے تاکہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے واقفیت حاصل کرے۔ ان کے بارے میں اعتقاد فاسد نہ پھیلائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسا آدمی اس مسئلہ کو کسب و تحصیل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرے۔ ورنہ یہ مسئلہ عقل و فہم اور فکر و نظر کی راہ سے سمجھ میں آنے والا نہیں، اسی لئے تو کہا گیا: **ھو طور وراء طور العقل**۔

وہ مقام ہی عقل سے ماوراء ہے۔

اور یہ ارشاد بھی ہے کہ قلندر جو بھی کہتا ہے مشاہدے کے بعد ہی کہتا ہے۔

ایک عامی شخص جو اس مرتبہ کو نہیں پہنچا ہے اور نہ عالم متکلم ہے، وہ اس بات کا مکلّف ہے کہ متشابہات قرآن پر ایمان کی طرح اجمالاً یہ جان لے کہ حضرات صوفیاء نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صواب ہے اور میری عقل ان حقائق و اسرار تک نہیں پہنچ پا رہی ہے۔

نیز جاننا چاہئے کہ علمائے متکلمین کی وہ جماعت جو معتمد اور مستند ہے اس نے صراحتاً مسئلہ وحدت الوجود کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ سکوت اختیار کیا ہے اور اس کے اظہار و بیان سے اپنی زبان و قلم کو روک لیا ہے، انہیں اسباب و وجوہ کی بناء پر جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ہاں! علمائے متکلمین کے مقلدین اور متبعین نے ان کے سکوت کو انکار خیال کیا ہے جیسے علامہ تفتازانی اور قاضی عضد اور دیگر متاخرین۔

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس باب میں امام غزالی اور امام رازی اور ان کے ہم مثل

علماء ہی لائق تقلید ہیں نہ کہ متاخرین کا گروہ۔

نیز مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی ''رسالہ مُحیہ'' میں فرماتے ہیں: اب میں مقصود میں بحث کا آغاز کرتا ہوں۔ بادشاہ معبود پر اعتماد کرتے ہوئے جب کہ وہی مقصود ہے اور وہ مشہود بلکہ وجود کے دائرہ میں موجود ہے۔

مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے دوسرے باب میں فرماتے ہیں لوگ وحدۃ الوجود کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے عرض ہے کہ اس باب میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ مخلوقات حق تعالیٰ کا عین نہیں ہیں' اگر چہ کہ ان کا وجود اور قیام اسی کی ذات پاک سے قائم ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے صفات سے سمجھنا چاہئے کہ صفات حق تعالیٰ کے عین ہیں اور نہ غیر بلکہ اس کی ذات سے قائم ہیں۔ اسی طرح دوسری مخلوقات صفات کے عین ہیں اور نہ غیر۔ بلکہ ان کے مظاہر ہیں۔ صفات اگر چہ بذات خود مظاہر سے مستغنی اور بے نیاز ہیں، لیکن باوجود مظاہر مختلفہ (جو مخلوقات سے عبارت ہیں) سے استغناء کے حکمت الٰہیہ اسی چیز کی متقاضی رہی کہ صفات کا ظہور مظاہر ہی کے ذریعہ ہو۔

اکابر صوفیاء کے مقصود کا معنی اور ان کی مراد کا مفہوم یہی ہے۔ لیکن ملحدین وقت بزرگوں کے اقوال وارشادات کو ان کے مقصود اور مراد کے خلاف عمل کرتے ہوئے تحریف اور تلبیس کی راہ ہموار کئے ہوئے ہیں

لہٰذا وحدت الوجود کے تعلق سے اس قدر علم آگہی کافی ہے۔ لیکن اپنے اوقات کو اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ کے ذریعہ صرف کرنا نہ صرف بے فائدہ ہے بلکہ حضرات انبیاء کرامؑ کی طاعت کے کمالات وبرکات سے محروم ہونے کا موجب ہے۔

نیز مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی ''صراط مستقیم'' کے بابِ اول میں لکھتے ہیں:

حاصل کلام!

بساط وجود پر حق تعالی کی قیومیت کا انبساط اور ان حقائق متکثرہ کا قیام اسی ذات متوحد ولاشریک سے سمجھا جائے گا۔ اور آیت **هو الاول والآخر والظاهر والباطن** اور آیت **وهو بكل شئی محیط** اور حدیث "**و لو دليتم بحبل الى الارض السابعة السفلى لهبط على الله** اسی عظیم حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے۔

سبحان اللہ حب عشقی اور جذب تجلی علمی کی کیا خوب تاثیر ہے کہ جس کے فیض سے یہ مشتِ خاک یعنی انسان مقامِ مقدس یعنی بارگاہِ الٰہی میں کس قدر قابل عظمت ہوگیا اور رب الارباب کی مجلس میں یہ حقیر مٹی کس قدر بلند مرتبہ ومقام سے سرفرازی ہوی۔ عشق ہی کی بدولت جسم خاکی افلاک پر پہنچ گیا اور کوہ رقص و وجد میں آ گیا اور چالاک ہوگیا۔ اے عاشق طور میں جان عشق کی برکت ہی سے آئی اور وہ مست ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے۔

وحدت الوجود سے متعلق بات کرنا اور معارف الٰہیہ میں لب کھولنا اور ان ابیات کے مضامین کی تشریح اسی مقام کے لوازم سے ہے۔

نے بلند و پست آواز میں جو کچھ کہہ رہی ہے اگر میں اس کو فاش کر دوں تو دنیا والے مجھ پر برہم ہو جائیں، جملہ معشوق ہے اور عاشق پردہ، اور زندہ معشوق اور عاشق مردہ۔

حاصل کلام !

اس مختصر سے رسالہ میں مزید دوسرے اقوال وارشادات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور طعن و تشنیع کرنے والے زیادہ تر لوگ مولانا شاہ اسمٰعیل دہلوی کے ساتھ مکمل اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے فرمان وارشاد کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان ہی کے قول کو اس صدی کے علمائے متاخرین کے اقوال کے اخیر درج کیا گیا ہے۔

**اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ولا تعجل فی قلوبنا ولا تعجل فی قلوبنا غلاً للذين آمنو اربنا انک رؤف رحيم۔**

## ذٰلك الکتاب

یہ کتاب تصنیف کرنے کا سبب عوام کی افراط وتفریط ہے اور راہ اعتدال سے بھٹکے ہوئے بھائیوں کی اصلاح ہے۔ اور اس کا نام فصل الخطاب رکھا گیا ہے۔ جو درحقیقت خطا اور صواب کے درمیان فرق کو واضح کرنے والی ہے۔ یہ کتاب اس شخص کے لئے مفید ثابت ہوگی جو غالی افراد کے غلو، اور اہل سنت و جماعت کے مذہب سے واقف ہو، کیونکہ اس کتاب میں اصل بحث لوگوں کے غلو اور ناقص اشخاص کے افراط اور انتہا پسندی سے متعلق ہے۔

کتاب میں بعض مقامات پر ضعیف اقوال اور مرجوح روایات کو دیکھتے ہوئے یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ فقیر قول ضعیف پر عمل کی ترغیب دے رہا ہے۔ بلکہ ان کے پیش کرنے کا مقصد، صرف غالی حضرات کی زبان بند کرنا ہے تا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور کسی اختلافی مسئلہ میں ایک پہلو کے حق ہونے کا یقین کر لینا، اور اسی کو ترجیح دینا اور اس میں تعصب سے کام لینا، غیر علمی اور غیر مناسب بات ہے۔

اہل سنت و جماعت کے اختلافی مسائل، اہل اسلام واہل کتاب یا سنی وشیعہ یا سنی و خارجی کی طرح نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کو کافر اور بدعتی قرار دیں بلکہ حق ہر دو پہلو میں دائر ہے، کسی کا پہلو قوی اور راجح ہے تو کسی کا پہلو ضعیف اور مرجوح ہے۔

اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے پر نکتہ چینی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی کسی دلیل ہی کے تحت مسئلہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں اگر چہ کہ وہ دلیل ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے ہم میں سے کون زیادہ ہدایت کی راہ پر ہے، فربکم اعلم بمن هو اهدى سبيلا۔

حضرت قطب ویلورؒ